تاریخ اخلاقِ یورپ

جلدِ اوّل

از

عبدالماجد بی اے

فہرست مضامین

مضمون | صفحہ

دیباچہ

اڈورڈ ہارٹ پول لیکی (سنہ ۱۸۳۸ تا سنہ ۱۹۰۳ء) برطانیہ کے مشاہیر فضلا مین سے ہوا ہے۔ اس کا ذوق بحیثیر علمی تھا۔ واقعات کی تحقیق و تنقید مین یہ اپنے معاصرین مین خاص امتیاز رکھتا تھا۔ اس کی ساری زندگی تصنیف و تالیف مین گذری اور اس نے ہزارہا مطبوعہ صفحے اپنی یادگار چھوڑے ہین[1]۔ شروع شروع اسکی تصانیف مذہبی رنگ کی ہوتی تھین لیکن اسکے بعد اس نے اپنا موضوع تاریخ کو بنا لیا، اور بقیہ ساری عمر اسی مین گذاری۔ مگر تاریخ سے امراء و سلاطین کے سوانح مراد نہین، بلکہ قومون کے عروج و زوال کا فلسفیانہ مطالعہ مراد ہے۔ تاریخ جسے قدماء ادب مین شامل کرتے تھے، درحقیقت فلسفہ کی ایک مستقل شاخ ہے جسکے ڈانڈے سوشیالوجی (عمرانیات) و پالٹیکس (سیاسیات) سے ملے ہوئے ہوتے ہین۔ لیکی کے پیش نظر بھی تاریخ کا یہی تخیل تھا۔ وہ جامع واقعات نہ تھا، مورخ تھا۔ وہ تذکرہ نگار نہ تھا، حیات اجتماعی کا مصور تھا۔ اس نے اشخاص کی سوانح عمریان نہین لکھی ہین، مختلف اقوام کی علمی و اخلاقی زندگیون کا مرقع تیار کیا ہے۔

اسکی تصانیف مین "تاریخ اخلاق یورپ" کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اس مین اس نے بیحد وسعت نظر، تلاش و تفحص سے کام لیکر یورپ قدیم کی جس سے رومہ مراد ہے، اخلاقی زندگی

[1] اڈورڈ ہارٹ پول لیکی، ایم اے (ڈبلن) ڈی سی ال (آکسفرڈ) ال ال ڈی (ڈبلن، گلاسگو و سنٹ اینڈریوز) لٹ ڈی (کیمبرج) وغیرہ کی مخصوص تصانیف حسب ذیل ہین:-
(۱) "دور حاضرہ کا مذہبی رخ" سال طبع (سنہ ۱۸۶۰ء)
(۲) "قائدین آیرلینڈ" ..... " (سنہ ۱۸۶۱ء) (سنہ ۱۹۰۳ء مین نظر ثانی کے بعد اسکی دو جلدین شائع کین)
(۳) یورپ مین عقلیت کی تاریخ " (سنہ ۱۸۶۵ء) ۲- جلدین-
(۴) تاریخ اخلاق یورپ ..... " (سنہ ۱۸۶۹ء) ۲- جلدین-
(۵) "اٹھاروین صدی کی تاریخ انگلستان" سال طبع (سنہ ۱۸۷۸ء تا سنہ ۱۸۹۰ء) ۸ جلدین-
(۶) "اٹھاروین صدی کی تاریخ آئرلینڈ" ..... " (سنہ ۱۸۹۲ء) ۱۲ جلدین- یہ بھی تاریخ انگلستان ہی کا حصہ ہے-
(۷) "جمہوریت و حریت" سال طبع (سنہ ۱۸۹۶ء)
(۸) "نقشہ حیات" " (سنہ ۱۹۰۰ء)
(۹) "تاریخ کی سیاسی اہمیت" (مجموعہ مقالات) سال طبع (سنہ ۱۸۹۲ء)-

کے جزئیات کا استقصاء کرکے ان سے نہایت اہم نتائج نکالے ہین۔ رومہ کی حیات اخلاقی مین عہد بہ عہد جو تغیرات ہوتے رہے ہین ان کے اسباب وعلل کی بہ کمال دقت نظر تحقیق کی ہے اور ہر عامل مؤثر سے جو جو اثرات پیدا ہوئے ہین انھین تفصیل سے دکھلایا ہے۔ اسی تصنیف کا ملخص ترجمہ اس وقت ناظرین کے ہاتھون مین ہے۔

اس ترجمہ کو صحیح معنی مین ترجمہ کہنا درست نہین اسلیے کہ اسمین مصنف کے الفاظ کی پابندی ایک مقام پر بھی نہین کی گئی ہے۔ صرف اسکے مفہوم کو پیش نظر رکھکر اسکے اصل خیال کو اردو مین ادا کر دیا گیا ہے، اور پھر اس مین جا بجا جزئی تصرفات سے کام لیا گیا ہے۔ یہ تصرفات عموماً اقسام ذیل کے ہوئے ہین۔

(۱) مصنف نے حواشی ذیلی (فٹ نوٹس) مین کثرت سے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا تھا اور کہین کہین اپنے دعاوی کی مزید تائید ی شہادتین درج کی تھین جو اصل مبحث کے لیے چندان ضروری نہ تھین۔ یہ حواشی تقریباً سب حذف کر دیے گئے ہین۔

(۲) بعض ایسی مثالین جو خالص اردو دان پبلک اور ہندوستان کے رہنے والون کے لیے ناقابل فہم تھین، نظر انداز کر دی گئی ہین۔

(۳) فٹ نوٹ کے جو مضامین بہت ضروری معلوم ہوئے، انھین متن ترجمہ مین جگہ دیدی گئی ہے۔

(۴) بعض معتقدات وجماعات کے مفہوم کو مسیحی نقطۂ خیال سے ادا کرنے مین ایسی مصطلحات سے کام لیا گیا ہے، جو اب تک اسلامی لٹریچر کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہین (مثلاً منافق، مشرک، اہل بدعت وغیرہ)

(۵) بعض مشاہیر اشخاص کے نامون پر فٹ نوٹس کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اس تصریح سے غرض یہ ہے کہ لوگ اسے لفظی ترجمہ سمجھ کر حرف بہ حرف اصل کتاب سے مطابقت دینے کی زحمت نہ گوارا فرمائین۔ اگر ایسے ٹھیٹھ ترجمے کی کوشش کی جاتی، تو عبارت

اردو نہ رہتی بلکہ انگریزی ہوجاتی، گو الفاظ اردو رہتے۔

باایں ہمہ مترجم کو اعتراف ہے کہ اس کی عبارت کو ہر جگہ یکسان رواں وسلیس رکھنے کی کوشش پوری طرح کامیاب نہین ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ دوچار مقامات پر عبارت مین انگریزیت کی جھلک آگئی ہو۔ بعض جگہ قصداً بھی انگریزی اسلوب ادا کو قائم رکھا گیا ہے، تاکہ خالص اردو دان ناظرین انگریزی کی طرز انشا سے بھی بالکل ناواقف نہ رہین مگر اسکی مثالین شاذ ملین گی۔

اس کتاب کی جلد ثانی کا ترجمہ بھی مدت سے تیار ہے، لیکن جن لوگون کو خود اردو کے مطابع سے سابقہ نہین پڑا ہے، وہ اس کا اندازہ ہی نہین کرسکتے، کہ کتاب کے طبع وشائع کرنے مین کتنی شدید دشواریون اور رکاوٹون کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ جلد ہٰذا کا ترجمہ آخر ۱۹۱۵ء سے تیار تھا، مگر دسمبر ۱۹۱۷ء مین یعنی پورے دو سال کے بعد اس کے شائع ہونے کی نوبت آرہی ہے۔ اس بنا پر جلد ثانی کے جلد شائع ہونے کی بابت ناظرین کو کوئی امید نہین دلائی جاسکتی۔

اس کتاب مین یورپین اور رومی نام کثرت سے آئے ہین، جلد ہٰذا کے آخر مین ان سب کی فہرست انگریزی حروف مین دیدی گئی ہے، جسے دیکھکر ناظرین تلفظ کی تصحیح کے علاوہ اُن اشخاص کے متعلق مزید معلومات انگریزی کتابون سے حاصل کرسکتے ہین۔

۳۔ دسمبر ۱۹۱۷ء

عبدالماجد

باب اوّل

اخلاق کی تاریخ طبعی

فصل (۱)

تمہید

یورپ کے ارتقاء اخلاق کا اگر صحیح سراغ چلانا ہی، تو اس کا بہترین، بلکہ ناگزیر مقدمہ یہ ہو کہ پہلے خود اخلاق کی ماہیت و اساس پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے لیکن بدقسمتی سے یہ کام آسان نہیں، بلکہ دشواریوں سے لبریز ہی۔ ان دشواریوں کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ ہی کہ ہمارے درمیان جو نظامات اخلاق متعارف ہیں، اُن کی جزئیات و تفصیلات میں شدت سے تنوع ہی، اور دوسرے یہ کہ مذاہب اخلاقیات کے خود اصول ہی باہم اسقدر متناقض ہیں، کہ حکماء اخلاق کی حیثیت اچھی خاصی بالکل دو فریقوں کی سی ہو گئی ہی اور یہ تفریق و تضاد کچھ آج سے نہیں مدت سے قائم ہی، اختلاف کا اصل الاصول ضمیریت و افادیت کی رقابت ہی۔ یعنی ایک گروہ اس کا قائل ہی، کہ افعال کے حسن و قبح کا اصل فارق ہمارے ضمیر کا فتویٰ ہی، اور دوسری جماعت اس کی مدعی ہی، کہ نہیں، بلکہ اُن اعمال کی حیثیت افادی اس اختلاف کی پہلی جھلک ہمیں افلاطون و ارسطو کے درمیان نظر آتی ہی، مگر ابھی یہ جھلک

بہت ہی دھندلی ہی، اس کے بعد پھر اس کا ظہور رواقیین[1] و لذتیین[2] کی معرکہ آرائیون
مین ہوتا ہی، مگر اب حیثیت اختلاف ذرا زیادہ اُجاگر ہو جاتی ہی، یہانتک کہ رفتہ رفتہ فلسفہ جدید
کا دور شروع ہوتا ہی، اور اب ایک طرف کڈورتھ[3]، کلارک[4]، و بٹلر[5] کی سرکردگی مین اور دوسری طرف
ہابس[6]، ہلویٹیس[7] و بنتھم[8] کے زیر قیادت، یہ معرکہ آرائی، پورے فریقانہ جوش و قوت کے ساتھ
زور پکڑ جاتی ہی، باتون مین شاخین نکلتی ہین، اصول سے فروع پیدا ہوتے ہین تاآنکہ
اس مسئلہ کی اہمیت غیر معمولی حدود تک پہونچ جاتی ہی۔

خیر، اس طرح کی عام علمی و نظری دقتین تو تھین ہی، اس پر ستم یہ کہ جو شخص اس
موضوع پر قلم اُٹھانا چاہتا ہی، اس کی ذاتیات سے متعلق ایک ناگوار بحث چھڑ جاتی ہی، گویا
اس کا شروع ہی مین سدباب کیے دیتے ہین۔ شخصیات کے متعلق یہ سوال پیدا یون ہوتا ہی کہ
ایک حکیم اخلاق جب اپنے عقاید و اصول کی توضیح کرنے لگتا ہی، تو اسے لامحالہ یہ بھی کہنا پڑتا ہی
کہ اگر ان کے مخالف نظریات کو مانا جاے، تو ان سے فلان فلان اخلاق کش نتایج لازم
آتے ہین اس تعریض کا درپردہ یہ منشا ہوتا ہی، کہ جو لوگ ان اخلاق شکن عقاید و اصول کی تعلیم
دیتے ہین، وہ خود بداخلاق ہوتے ہین۔ گویا اس طرح ذاتیات پر حملے ہونے لگتے ہین، اور
حکماء اخلاق قدرتی طور پر، اپنی جانب بداخلاقی کے انتساب سے بیزار ہوتے ہین۔ زیادہ وضاحت درکار ہو

---

[1] یونانی فلسفۂ اخلاق کا وہ مذہب جس کی تعلیم یہ تھی، کہ انسان کو رنج و راحت، غم و مسرت دونون سے غیر متاثر رہنا چاہیے اور جو کچھ پڑے اُسے صبر و سکون کے ساتھ جھیلنا چاہیے، اس کا بانی زینو ہوا ہی، (سنہ ۳۰۸ ق م)

[2] یونانی فلسفۂ اخلاق کا وہ مذہب، جس کی تعلیم یہ تھی، کہ افعال انسانی کا محرک اولی حصول لذت ہی، اس کا بانی اپیکورس ہوا ہی۔ (سنہ ۳۴۱ تا ۲۷۰ ق م)

[3] رالف کڈورتھ (سنہ ۱۶۱۷ء تا سنہ ۱۶۸۸ء) [4] سموئیل کلارک (سنہ ۱۶۷۵ء تا سنہ ۱۷۲۹ء) [5] جوزف بٹلر (سنہ ۱۶۹۲ء تا سنہ ۱۷۵۲ء) [6] ٹامس ہابس (سنہ ۱۵۸۸ء تا سنہ ۱۶۷۹ء) [7] ہلوٹیس (سنہ ۱۷۱۵ء تا سنہ ۱۷۷۱ء)

[8] جرمی بنتھم (سنہ ۱۷۴۸ء تا سنہ ۱۸۳۲ء)

تو اسے یون سمجھو، کہ فلسفۂ اخلاق کا اصل مقصد ہمارے حاسات اخلاقی کی ایک حسن تعبیر کے ساتھ توجیہ کرنا، یا دوسرے الفاظ مین، ان سوالات کا جواب دینا ہوتا ہی، کہ ہم مین احساس فرایض کیونکر پیدا ہوتا ہی؟ اور اس کی تعمیل ہم پر کس بنا پر واجب ہی؟ اب اگر کسی نظام اخلاق نے ان سوالات کے تشفی بخش جوابات دیدیے، تو بس پھر اُس پر اعتراض کی کوئی گنجایش ہی نہین رہ جاتی۔ اس واسطے جب کوئی فلسفی کسی نظام اخلاق کی مخالفت کرتا ہی، تو اسے یہ خواہ مخواہ ظاہر کرنا ہوتا ہی، کہ وہ نظام اخلاق اپنے اصول کی رو سے احساس فرض اور پھر اس کی تعمیل کی کوئی توجیہ کرنے مین قاصر ہی۔ مثلاً ایک افادی اپنے مخالف پر یہ الزام لگاتا ہی، کہ وہ اپنے نظام اخلاق کی بنیاد ایک ایسے حاسہ پر رکھتا ہی جس کا کوئی وجود ہی نہین، اور ایسے اصول کی تعلیم دیتا ہی، جس کو تسلیم کر لینے سے معیار اخلاق ہر ملک و ہر زمانہ مین متغیر ہوتے رہنے کے ساتھ ایک من مانی چیز رہ جاتی ہی۔ اسی طرح ایک ضمیری اپنے حریف پر یہ چوٹ کرتا ہی کہ اس کا اصول اخلاق یعنی نظریۂ افادیت، تو فلان فلان اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل آگے آئے گی سر تا سر بداخلاقی کی تعلیم دیتا ہی۔ غرض اس طرح ہر فریق اپنے مخالف اصول کے اخلاق شکن نتایج کے متعلق رد وقدح کرتا ہی لیکن یہ کیسی شدید غلط فہمی ہی کہ اس نوک جھونک طنز و تعریض کا اثر، حکماء اخلاق سمجھتے ہین کہ ان کی ذاتیات تک پہونچتا ہی اور آن حالیکہ ایسا خیال کرنا اپنے تئین اس حقیقت سے بالکل لاعلم ظاہر کرنا ہی، کہ انسان کی عملی زندگی مین فلسفۂ اخلاق کا کیا درجہ ہوتا ہی۔ درحقیقت، ہمارے حاسات اخلاقی کبھی اصول اخلاق سے موخر نہین ہوتے بلکہ اُس پر مقدم ہوتے ہین یعنی پہلے انسان اپنی سیرت و اخلاق قائم کر لیتا ہی تب جا کر وہ فلسفۂ سیرت و اخلاق پر غور و خوض شروع کرتا ہی۔ اس بنا پر یہ ہونا بالکل ممکن ہی، اور ممکن کیا معنی، اکثر ہوتا ہی یہی، کہ اصول اخلاق تو بہت ہی بودے اور کمزور ہوتے ہین لیکن جو اشخاص ان اصول کے پیرو ہوتے ہین، ان کے دامن اخلاق پر کوئی دھبہ نہین ہوتا۔

اخلاق کے یہ دو متضاد نظریات، مختلف نامون سے موسوم کیے جاتے ہین، اور پھر یہ متعدد

شاخون مین منقسم ہین۔ چنانچہ ان مین سے ایک مذہب کے اتنے سارے نام ہین: رواقی، ضمیری، لاافادی، اور حاسی، اسی طرح اس کے مقابل مذہب کو کوئی لذتیہ کہتا ہی، کوئی افادی سے موسوم کرتا ہی، کوئی استقرائی کے لقب سے یاد کرتا ہی، اور کوئی خود غرضانہ کہکر پکارتا ہی۔ فریق اول الذکر کے عقاید کو اگر اجمالاً ایک کلیہ کی صورت مین بیان کرنا چاہین تو یون کہہ سکتے ہین، کہ ہم مین فطرۃً ایک ایسی اندرونی بصیرت ودیعت ہی، جو ہمین یہ سجھاتی رہتی ہی، کہ بعض خصوصیات اخلاق، مثلاً فیاضی، عصمت، راست بازی، وغیرہ، دوسرے خصایص اخلاق کے مقابلے مین بہتر و قابل اختیار ہین، اور ان کے اضداد لائق ترک ہین اسے دوسرے الفاظ مین یون کہنا چاہیے، کہ فرض کے احساس کے ساتھ اس کی تعمیل بھی فطرت بشری کی سرشت مین داخل ہی، یعنی فرض کی بجا آوری اس کے نتایج کے پسندیدہ و ناپسندیدہ ہونے سے قطعاً مستغنی ہی، اور شاہراہ فرض پر چلنے کے لیے ہمارے باطن و ضمیر کا یہ فتویٰ بالکل کافی ہی، کہ وہ فرض ہی۔ اس کے مقابلے مین فریق مخالف کسی اخلاقی حاسۂ باطنی کے وجود سے یکسر منکر ہی۔ وہ اس کا قایل ہی کہ طبعاً تو ہمارے پاس حسن و قبح کی شناخت کا کوئی ذریعہ ہی، اور نہ ہم کسی حسن باطنی کی مدد سے اپنے افعال و جذبات مین اخلاقی حیثیت سے کوئی ترتیب مدارج قائم کر سکتے ہین، بلکہ ہم ان نتایج پر صرف تجربہ و مشاہدہ کی وساطت سے پہونچ سکتے ہین اور وہ اس معنی کر کے کہ جن افعال کو ہم یہ دیکھتے ہین، کہ اُن سے نوع انسان کی مجموعی راحت و مسرت مین اضافہ ہوتا ہی، یا انسانی درد و کلفت مین اُن سے کمی ہوتی ہی، اُنھین ہم افعال حسنہ قرار دیتے ہین، اور جن افعال کے متعلق ہم یہ پاتے ہین، کہ وہ اس کے برعکس اثر ڈالتے ہین، اُنھین افعال مذموم سے تعبیر کرتے ہین۔ مختصر یہ کہ "بڑی سی بڑی تعداد افراد کو بڑی سی بڑی مسرت"، بس یہ کلیہ سرا ہر اخلاقیات کے لیے شمع ہدایت ہونا چاہیے، کہ یہی حُسن اخلاق کا بہترین مظہر، اور کمال تزکیہ نفس کا اعلیٰ ترین معیار ہی۔

لیکن اگر اس آخر الذکر فریق کا سدرۃ المنتہی یہی ہی، تو اس کے نظام اخلاقیات مین

ایک بہت ہی کھلی ہوئی خامی رہ جاتی ہے، یہ ہم بلا تامل مانے لیتے ہیں کہ افعال کا مؤدی الی المسرت، اور اس لیے اُن کا پاکیزہ ترین ہونا ہمیں تجربہ کی وساطت ہی سے معلوم ہوتا ہے، لیکن پھر فلسفۂ اخلاق کا مقصد اکیلا یہی بتانا تو نہیں۔ ایک اہم سوال تو یہ ہے کہ ہم ان افعال کو اختیار کس بنا پر کریں؟ کیا شے ہے، جو ہمارے لیے حسن اخلاق کی محرک ہوسکتی ہے؟ اب اگر اس اسکول کے نام لیوا یعنی وہ لوگ جو دوسروں کو نفع پہونچانے والے فعل کو خیر العمل قرار دیتے ہیں یہ تسلیم کرلیں کہ ایسے مواقع پر جبکہ اجتماعی و شخصی منافع ٹکرا جاتے ہیں جبکہ افادۂ عام و ذاتی لذت و راحت میں تصادم واقع ہوجاتا ہے۔ انسان اس پر مجبول ہے کہ منافع اجتماعی کی پاسداری کرے، اور یہ اس کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ طبعاً افادۂ عام ہی کی پیروی کرے، تو پھر افادیت و استقرائیت کا، بہ حیثیت اخلاق کے ایک مستقل اسکول کے، خاتمہ ہوا جاتا ہے، اور افادیین ایک حاسۂ اخلاقی کے وجود کے تسلیم کرنے میں بالکل بٹلر اور کڈورتھ کے ہم دوش ہوجاتے ہیں چنانچہ بعض ضمیریین کا مسلک واقعۃً یعنہٖ یہی گزرا ہے مثلاً ہچیسن[1] کہ وہ زمانۂ حال میں ضمیریت کا بانی اول ہوا ہے، اور اس سے زیادہ کسی حکیم اخلاق نے اخلاق کی لاافادیت پر اپنے زور و قوت کو نہیں صرف کیا ہے، وہ تک، ایک طرف تو تمام محاسن اخلاق کا سرچشمہ فیاضی یا نفع رسانی عامہ کو قرار دیتا ہے، لیکن دوسری طرف یہ بھی مانتا ہے، کہ اس فیاضی کے وجوب و فرضیت کا ہمارے لیے کاشف صرف ہمارا "حاسۂ باطنی" ہے۔ اسی طرح ہیوم[2] بھی، جو اس معنی میں قطعی افادی ہے کہ وہ افادۂ افعال ہی کو ان کے استحسان کا معیار قرار دیتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی اعتراف کرتا ہے، کہ نیکی و نیک کرداری کی محرک، ہمارے نفس کے اندر عقل سے علیحدہ کوئی باطنی قوت ہوتی ہے، جسے نیکی و بدی کے تصور سے معاً تحریک ہوتی ہے، اور اسی کے قریب قریب ابھی حال میں میکنٹاش[3] کا مذہب ہوا ہے۔

الثروزم کے نزدیک افادیت اخلاقی کی تعریف بس اسی قدر کافی ہے، کہ وہ وہ نظریۂ اخلاقیات ہے

---

[1] فرانسس ہچیسن (سنہ ۱۶۹۴ء تا سنہ ۱۷۴۷ء) [2] مشہور فلسفی، ڈیوڈ ہیوم (سنہ ۱۷۱۱ء تا سنہ ۱۷۷۶ء)

[3] سرجیمس میکنٹاش (سنہ ۱۷۶۵ء تا سنہ ۱۸۳۲ء)

جو تمام افعال کے حسن و قبح کا معیار ان کے نتائج کو قرار دیتا ہے یعنے جس تناسب سے افعال مسرت انسانی مین اضافہ کرتے ہین، اُسی تناسب سے محمود و مستحسن ہین، اور جس نسبت سے اُسکو نقصان پہونچاتے ہین، اسی نسبت سے قبیح و مذموم ہین لیکن درحقیقت، یہ خلاصۂ بیان تمامتر ناقص ہے کیونکہ اس مین منجملہ اخلاقیات کے دو مسائل مہمہ کے، صرف ایک سے تعرض کیا گیا ہے کسی نظام اخلاق کا تنہا یہی فرض تو نہین ہے، کہ وہ "فرض" کی تعریف کرے، بلکہ اُسے یہ بھی بتانا چاہیے، کہ ہم مین فرض کی فرضیت کا احساس کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ اور فلسفۂ اخلاق کا مقصد محض اس قدر بتا دینے پر ختم نہین ہو جاتا، کہ فلان راستہ اختیار کرنا ہم پر واجب ہے، بلکہ اس کی تصریح کرنا بھی اُس پر عین فرض ہے، کہ اس "وجوب" کے معنے کیا ہین، اور یہ وجوب، ہم پر عاید کیونکر ہوتا ہے؟

چنانچہ جو فریق، اخلاق کو تمامتر تجربہ کا معلول سمجھتا ہے، وہ اپنی ذمہ داری سے غافل نہین رہا ہے۔ اُس نے اس سوال کا جواب دیا ہے، اور جرأت کے ساتھ وہی جواب دیا ہے، جو اس کے لیے دینا ممکن تھا۔ وہ کہتا ہے، کہ نفس مین کسی ایسے حاسۂ اخلاقی کا وجود فرض کرنا، جو افعال کے پیدا کردہ لذت یا الم سے متاثر ہو محض ایک وہم ہے۔ بلکہ جب ہم کسی فعل کے بابت یہ کہتے ہین، کہ وہ واجب ہے، تو اس کا منشا ہمیشہ اسی قدر ہوتا ہے، کہ اگر ہم اس پر عمل نہ کرین گے، تو خود ہمین تکلیف پہونچے گی۔ گویا محرک افعال صرف خواہش دفع اذیت و جلب مسرت ہوتی ہے۔ اور نیک کرداری، یا افادۂ عام کی تحریک کا دارمدار، اس توقع، اور محض اسی توقع پر ہوتا ہے، کہ ایسا کرنے سے بالآخر خود ہمین فائدہ ہوگا۔ دوسرون کی راحت رسانی انجام کار ہمین، خود ہماری ذاتی راحت کا باعث ہوگی۔

یہ ہے خلاصہ اُس نظریۂ اخلاق کا، جو اخلاق کی اساس و بنیاد، تجربہ کو قرار دیتا ہے اگر یہ سوال کیا جائے، کہ افعال حسنہ کون ہین اور افعال سیئہ کون؟ تو اس اسکول سے اس کا یہ جواب ملے گا، کہ اول الذکر وہ ہین جن سے نوع انسانی کی مجموعی راحت مین اضافہ ہوتا ہے، اور آخر الذکر وہ ہین جن سے اس مین تقلیل ہوتی ہے۔ اگر یہ دریافت کیا جائے، کہ نیک کرداری کا محرک کیا ہے؟

تو اس کا یہ جواب ملے گا، کہ خود غرضی (یعنے اپنے ذاتی نفع و راحت کی توقع) اگر ایسی خود غرضی جو انجام بینی و دور اندیشی پر مبنی ہو، لیکن خود غرضی، افادہ، مسرت، راحت، وغیرہ مبہم ذو شمول الفاظ ہین، جن کے اختلاف تعبیر سے یہ اسکول، بجائے خود کئی ٹکڑیون پر منقسم ہو گیا ہے۔

فصل (۲)

مسلک افادیت

نظریہ افادیت کی شاید سب سے زیادہ پست اور سب سے زیادہ مکروہ تعبیر وہ ہے، جو اس کے ایک مشہور وکیل، مینڈیول نے اپنی تصنیف "تحقیق اساس محاسن اخلاق" مین کی ہے، وہ کہتا ہے کہ دنیا مین اخلاق کی بنیاد اول تاجدارون کی مصلحت و حکمت عملی کی ممنون ہے۔ حکمرانون کو ابتداء زمانہ ہی مین یہ نظر آیا، کہ اگر رعایا اپنے جذبات کو قابو مین رکھے، تو بہت سی سیاسی دشواریون اور قانونی خرخشون سے نجات مل جائے۔ اس مقصد کے حصول کی تدبیر انھون نے یہ سوچی، کہ انسان کے جذبۂ خود نمائی و شہرت پسندی کو متاثر کیا جائے۔ یہ سوچ کر انھون نے خلقت کے یہ ذہن نشین کرنا شروع کیا، کہ فطرت بشری، فطرت حیوانی سے بدرجہا ممتاز و اشرف ہے، اور انسان کی عظمت و شرافت کا اصل راز یہی ہے، کہ وہ اپنی ذات کے مقابلہ مین جماعت کے حقوق کو ترجیح دیتا ہے۔ مدح و تعریف، القاب و خطابات، اور ہر دیگر ممکن طریقہ سے انھون نے عوام کے ذہن مین یہ بات بٹھا دی، کہ جو لوگ اپنی ذاتی لطف اندوزی کے لیے غیر نفع بخش مشاغل کو ترک کر کے عیش پرستیون مین پڑے رہتے ہین وہ ایک پست و قابل تحقیر مخلوق ہین، اور اس طرح ان لوگون کے دل مین بھی یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ اُن لوگون کی، جو شریف و صاحب اخلاق خیال کیے جاتے ہین تقلید کرین، اور خود بھی اُنھین کی طرح غیر خود غرضانہ افعال انجام دین، اس سے نئے نئے نتائج ظہور پذیر ہونے لگے۔ لوگون نے ابتداءً تو ضبط جذبات، طلب شہرت و عظمت کے لیے شروع کیا تھا، مگر اب انھین یہ نظر آنے لگا، کہ

اسی ضبطِ نفس کے باعث، وہ اِن تکالیف و آلام سے محفوظ رہتے ہیں، جو عدمِ ضبطِ نفس کی حالت میں، اپنی عیاشیوں اور جذبات پروریوں کے پاداش میں انھیں یقیناً برداشت کرنا پڑتے، اور یہ انکشافِ حال قدرۃً نیک کرداری کے لیے ایک مزید محرک ثابت ہوا۔ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر اس حقیقت سے لوگ روشناس ہونے لگے، کہ ہر فرد، دوسروں کے ایثار سے منتفع ہوتا ہے، اور ہر فرد کی خود غرضی دوسرے فرد کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے، اور اس کا اقتضاء طبعی یہ تھا، کہ ہر شخص خود غرضی کو معیوب، اور ایثار کو مستحسن قرار دینے لگے۔ ان سب چیزوں کا مل ملا کر نتیجہ عملی یہ نکلا کہ جو کچھ سوسائٹی کے حق میں مفید تھا، اُسے "نیکی" اور جو کچھ سوسائٹی کے حق میں مُضر تھا، اُسے "بدی" سے تعبیر کیا جانے لگا۔

مینڈیویل کی یہ مذکورۂ بالا رائیں جب اول اول شائع ہوئیں، اُس وقت انھیں ان کے استحقاق سے زیادہ قبول حاصل ہوا لیکن آج یہ اس کس مپرسی کے قعر میں گر رہی ہیں جس کی یہ بالکل بجا طور پر مستحق ہیں لیکن خود مینڈیویل نے اپنی ایک نظم "افسانۂ نحل" اور اس کی شرح میں نظریۂ بالا سے بالکل متناقض، اس انوکھے خیال کا اظہار کیا ہے، کہ "ذاتی معائب اجتماعی محاسن ہوتے ہیں" اور نہایت کمزور، بوچ، بلکہ بالکل پوچ و بیہودہ دلائل کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بد اخلاقی نوعِ انسانی کے لیے مفید ترین شے ہے۔ مگر اس سے قبل، ایک مادہ بلند پایہ جلیل القدر مصنف، ہابس ایک نظامِ اخلاق تیار کر چکا تھا، جو شاید نکرہ تو انا نہ ہو، مگر خود غرضی پر مبنی ہونے کے لحاظ سے مینڈیویل کے نظریہ سے ذرا بھی کم نہ تھا۔ اور ہابس ہی کا نظریہ متعلق اساس و جوہر اخلاق، وہ ہے، جو جزوی ترمیمات کے ساتھ افادئین کے حلقے میں آج بھی مسلّم و متداول ہے۔

ان مصنفوں کے نزدیک ہماری زندگی تمامتر ہمارے ذاتی نفع کی محکوم ہوتی ہے، ہمارا مقصد وحید حصولِ لذت ہوتا ہے، اور اخلاقی نیکی و بدی کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہیں کہ ہم ارادۃً ایسے قانون کی پابندی کر رہے ہیں، جس سے ہمیں حصولِ لذت ہوگا، باقی رہا نیکی کو خالص نیکی کی حیثیت سے پسند کرنا تو یہ امرِ محال ہے، بلکہ ہم جب کسی فعلِ نیک کرتے ہیں، تو اس سے ہمارا اصلی مدعا

یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہمین کسی طرح کی مسرت یا راحت حاصل ہوگی۔ یہانتک کہ جب ہم خدا کی نیکی کا ذکر کرتے ہین، تو اس کا منشا بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ ہمارے واسطے نفع رسان ہے۔ یا مثلاً جس شخص کے متعلق ہم مین جذبۂ تعظیم و احترام پیدا ہوتا ہے، تو اس سے بھی ہمارے ذہن مین سوا اس کے اور کوئی مفہوم نہین ہوتا، کہ اُس شخص مین ہمین نفع و نقصان دونون کے پہنچانے کی قوت ہے، لیکن وہ اپنے ارادہ و نیت سے ہمین صرف فائدہ ہی پہنچائے گا۔ یا پھر مثلاً زہد و اتقا کی محرک بجز اس اعتقاد کے کوئی شے نہین ہوتی، کہ زاہدانہ نفس کُشی عذاب الٰہی کے حق مین سپر کا کام دے گی اسی طرح تمام جذبات انسانی کی، بہ قول اس مسلک کے مصنفین کے، بنیاد خود غرضی و خود پسندی ہی کسی نہ کسی صورت پر ہوتی ہے۔ ذیل مین ہم مثال کے لیے، ایک آدھ جذبہ کی تعریف، اس گروہ کے مذاق کے موافق درج کرتے ہین:-

(۱) جذبۂ فیاضی تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے، جزو اول یہ ہوتا ہے، دوسرون کے ذہن مین ہماری وقعت پیدا ہو۔ جزو دوم توقع معاوضہ ہے، یعنی یہ خیال کہ ہم اگر دوسرون کے کام آئین گے، تو دوسرے ہمارے بھی کام آئین گے۔ تیسرا عنصر یہ ہے فیاضی سے ہماری اس قدر قوت و طاقت ثابت ہوتی ہے، کہ ہم نہ صرف اپنی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے پر قادر ہین، بلکہ اتنی استطاعت رکھتے ہین، کہ دوسرون کے حوائج بھی رفع کر سکتے ہین۔

(۲) رحم و ہمدردی کی ماہیت یہ ہے، کہ دوسرون کو درد و مصیبت مین مبتلا دیکھ کر ہمین یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ کہین ہم بھی انھین مصائب مین نہ گرفتار ہو جائین۔ اُن لوگون کو دیکھ کر جو بلا وجہ مبتلائے آفت ہو جاتے ہین، ہمین جو اور زیادہ رحم آتا ہے، اس کا باعث بھی یہی ہے، کہ ہم اپنے تئین ہمیشہ بے قصور سمجھتے ہین۔ یا اسی طرح کسی کو بلائے ناگہانی مین گرفتار دیکھ کر ہمین یہ یاد آجاتا ہے کہ کہین ہم پر بھی ناگہان اور دفعۃً کوئی مصیبت نہ آجائے۔

(۳) دوستی سے مدعا یہ ہے، کہ ہر شخص کو اپنی ضروریات و کاروبار کے لیے دوسرون کی اعانت و امداد کی احتیاج ہوتی ہے، اور وہ اس جذبہ کے ذریعہ سے پوری ہو جاتی ہے۔

جن دماغون نے فطرت بشری کی یہ تشخیص کی ہے، اُن کے نزدیک نظام اخلاق کی جو وقعت ہوگی، اُس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سرسری خاکہ اگر چاہین تو یون پیش کر سکتے ہین، بہ تمام جذبات وافعال طبعًا یکسان وہم رتبہ ہوتے ہین، اور فطرةً کسی خاص سیرت کو دوسری سیرت پر ترجیح وتفوق حاصل نہین، چنانچہ انسان جس وقت تک عہد توحش مین رہتا ہے، اخلاق کا وجود ہی نہین ہوتا۔ لیکن خود ہمارے ذاتی نفع وراحت، آرام ولذت کی بہت سی صورتین ایسی ہین، جو دوسرون کی مشارکت ومعاونت کی محتاج ہین، یعنی دوسرون کی شرکت کے بغیر ہماری مسرتین ناقص اور ہماری خوشیان ادھوری رہ جاتی ہین۔ اس سے اخوت، رفاقت، ومعاونت کی بنیاد پڑی، لیکن اجتماعیت کی ادنی سی ادنی شکل بھی بلا اس کے ناممکن ہے کہ افراد کی شخصی خواہشین محدود ومقید کی جائین۔ اس غرض سے قوانین نافذ کیے گئے، اور تعزیر کا خوف اور انعام کی چاٹ دلا کر ایسا کچھ انتظام کیا گیا، کہ شخصی واجتماعی منافع کی تفریق وتضاد مٹا کر دونون کو ایک کر دیا گیا۔ چونکہ بہ قول ہابس کے، نفس انسانی بیحد سرکش واقع ہوا ہے، اور جذبات ذاتی کو مسخر کرنا کوئی معمولی کام نہین، اس واسطے حکومت کے لیے استبداد لازمی ہے۔ فرمان روائے خود مختار وغیر مسئول کی زبان سے جو احکام صادر ہون گے، وہ قطعی وناقابل ترمیم ہون گے، اور انھین سے ضابطۂ اخلاق تمام تر مدون ہونا چاہیے۔ یہ قول ہابس کا تھا، اس کے اور رفقا اس حد تک تو اس کا ساتھ نہین دیتے تاہم اسے وہ بھی نہایت شد ومد سے بیان کرتے ہین، کہ تدوین ضابطۂ اخلاق مین قانون کو دخل عظیم ہونا چاہیے کیونکہ جب یہ مسلم ہے کہ محرکات عمل صرف ہمین اپنے ذاتی نفع کے توقعات ہوتے ہین جب یہ بھی مسلم ہے کہ نیک کرداری شخصی واجتماعی منافع کے توافق واتحاد کا نام ہے، اور پھر جب یہ بھی مسلم ہے کہ وضع قانون کا مقصد اصلی بھی اسی توافق منافع شخصی واجتماعی کا حصول ہوتا ہے، تو ان مقدمات سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے، کہ حکماء اخلاق و واضعان قانون کے فرائض بالکل ایک ہی سے ہوتے ہین۔ البتہ فرق یہ ہوتا ہے، کہ نیک کرداری کی محرک علاوہ ضابطۂ تعزیرات کی توقعات کے، گرد وپیش کے لوگون کا رد و قبول، تحسین وتفرین بھی ہوتی ہے۔ اور اس طرح ایک طرف قانون کی پاسداری، اور دوسری طرف

فرد و جماعت کے اغراض و منافع کے اشتراک کا احساس، یہ دونون قوتین مل ملا کر ایک ایسی
رائے عام (Public opinion) پیدا کر دیتی ہین، جو اُن خصوصیات اخلاق کی تائید
کرتی رہتی ہی، جو ایک پُرامن و راحت آگین طرز معاشرت کی جان ہوتے ہین۔ مثال کے لیے
اِن خصایص اخلاق کو لیجیے:۔ عدل و انصاف، حیا و غیرت، رحم و دردمندی، منت پذیری
واحسان مندی، عصمت و پارسائی؛ یہ تمام محاسن اخلاق، اپنے اضداد، انتہائی بے غیرتی
و شہوت پرستی وغیرہ کے مقابلہ مین بجاے خود ذرا بھی وقیع نہین، اور قدرۃً ان کی اور اُن کی
دونون کی حالت بالکل ایک درجہ کی ہی، البتہ انھین فوق و فضیلت جو کچھ حاصل ہی، وہ صرف اس
لحاظ سے ہی کہ ان سے ہیئت اجتماعیہ کی مسرتون مین اضافہ ہوتا ہی۔ درحقیقت وہ انھین کے
دم سے قائم ہی۔ اور محض اسی بنا پر انھین "محاسن" سے موسوم کیا جا سکتا ہی۔ تمدن و شایستگی
کے نشو و نما کے ساتھ راے عام کی یہ قوت بھی ترقی کرتی جاتی ہی، یہانتک کہ رفتہ رفتہ اس کی حیثیت
ایک سانچے کی سی ہو جاتی ہی، جس مین ڈھل کر افراد کی سیرت خودغرضی و انانیت سے پاک ہو کر
نکلنے لگتی ہی۔ تو گویا ایک نیک نفس، شریف الخصال، و پابند اخلاق شخص کی تعریف یہ ہوئی، کہ
وہ وہ فرد ہی، جو بکثرت اپنے ذاتی منافع و لذات کی فکر حصول مین سرگرم رہتا ہی، مگر اس اعتدال و احتیاط
کے ساتھ کہ ذاتی منافع سے خود بخود اجتماعی منافع بھی پیدا ہوتے جاتے ہین۔

یہ مقولہ تو نہایت قدیم ہی، کہ جو شخص عقل و احتیاط کے ساتھ اپنے ذاتی نفع کی تلاش مین
رہتا ہی، وہ نیکی و نیک کرداری کے معیار پر پورا اُترتا ہی، لیکن اسے اپنے دستور العمل کا ملخص اُن
افادئین نے بنا لیا، جو مذہبی محرکات اعمال کی طرف چندان اعتنا نہین کرتے۔ یہ لوگ چونکہ اس کے
قایل ہین، کہ ہر فرد، ناگزیرانہ اپنے ذاتی نفع ہی کو ڈھونڈھتا ہی، لہٰذا ان کے اس قول سے ہم
ایک طرح پر فلاطون کے اس عقیدہ پر واپس آجاتے ہین، کہ بداخلاقی جہالت کا نام ہی۔ جلب
منفعت کا طریق عمل اگر دانشمندانہ ہی، تو اس کا نام "نیکی" ہی، اور اگر غیر دانشمندانہ ہی، تو وہی "بدی" ہی
گویا "نیکی"، دوراندیشی و انجام بینی کی ایک صفت ہی، اور "بدی"، نتائج افعال کے غلط اندازہ

کرنے کی مرادف ہی، پس اگر کوئی شخص انسان کی اخلاقی زندگی مین اصلاح کرنا چاہتا ہی، تو اس کے لیے دو، اور صرف دو ہی راستہ کھلے ہوئے ہین:- ایک یہ کہ منافع شخصی و اجتماعی کو بالکل متحد، بلکہ مرادف کر دے، اور دوسرے یہ کہ اُس جہالت و غلطی کا ازالہ کرے جس کے باعث افراد اپنے حقیقی نفع کی شناخت کرنے مین غلطی کرتے ہین۔ اگر عصمت و عفت، راستبازی یا کسی ایسی دوسری خصوصیت کے متعلق، جسے ہم عرف عام مین خوش اخلاقی کی مظہر سمجھتے ہین، یہ تحقیق ہو جائے، کہ اس کے مضار کا پلہ اُس کے منافع سے بھاری ہی، یا انسان کو اُس سے جتنی مسرت و راحت ملتی ہی، اُس سے زائد تکلیف و اذیت پہنچتی ہی تو ہم بلا تامل اُسے محاسن اخلاق کی فہرست سے خارج کر کے ذمائم اخلاق کے طبقہ مین رکھ دین گے۔ یا اگر ہمین متعارف اخلاق حسنہ کے بابت یہ تحقیق سے معلوم ہو جائے، کہ وہ ہمارے ذاتی نفع رسانی مین ذرا بھی معین نہین، تو ان کی پابندی فوراً ہم پر ساقط ہو جائے گی۔ درحقیقت افادئین کے سارے نظام اخلاق کا نچوڑ، اپیکورس کے ان اصول اربعہ مین آگیا ہی:-

(۱) ہر وہ راحت (یا لذت) جو الم و کرب کی آمیزش سے پاک ہی، لائق اخذ و تحصیل ہی۔

(۲) ہر وہ درد و الم جو راحت و لذت کی آمیزش سے پاک ہی، قابل ترک ہی۔

(۳) ہر وہ راحت جو کسی عظیم تر راحت کے حصول مین سدّ راہ ہو گی، یا جو کسی عظیم تر اذیت کا باعث بنے گی، قابل ترک ہی۔

(۴) ہر وہ اذیّت، جو اہون البلیات ہی یعنے جو ایک عظیم تر اذیت کے مقابلہ مین ہلکی ہی اور اس کی سپر کا کام دے گی، یا جو کسی عظیم تر راحت کا باعث ہو گی، قابل اخذ و تحصیل ہی۔

یہانتک ہم نے صرف دنیوی و مادی محرکات کی تشریح و تفصیل کی، جن کی قوت اکثر مشاہیر افادئین کے نزدیک تحریص عمل کے لیے کافی ہی، لیکن اسی اسکول کی ایک جماعت ایسی بھی ہی، جو اس سے مختلف الرائے ہی۔ یہ لوگ عالم عقبیٰ کی جزا و سزا کو بھی پیش نظر رکھتے ہین، اور انھین کے خیال کو حقیقی محرک عمل قرار دیتے ہین، فلسفۂ خود غرضی کی جتنی ترمیم شدہ صورتین ہین

اُن مین سے صرف اسی نظریہ کے متعلق یہ کہنا درست ہی کہ یہ نیک کرداری کے لیے ایسے محرکات عمل مہیا کرتا ہی جن کی قوت قطعًا ناقابل تغیر و مسلّم ہوتی ہی۔ اگر انسان واقعی یہ سمجھ لے کہ اسے اپنے اعمال کا معاوضہ ایک دائمی عذاب، یا دائمی ثواب، کی صورت مین کسی ہمہ دان و ہمہ بین حاکم کی عدالت سے ملے گا، تو یہ خیال، نیک کرداری کا ایسا زبردست محرک ہوگا، جس کے سامنے ارتکاب معصیت کی کوئی تاویل چل ہی نہین سکتی۔ پس اگرچہ یہ مصنفین اس پر پورا پورا زور دیتے ہین، کہ بغیر کسی صلہٴ مستقبل کے موجودہ مسرت سے دست بردار ہونا، ایک ایسی شدید حماقت، بلکہ جنون ہی جو ایک حیوان ناطق سے کسی طرح شایان نہین، تاہم یہ اس کے معتقد ہین کہ اس مادی دنیا کی لذات سے اُس صلہ کی توقع مین دست بردار ہونا بالکل بجا و جائز ہی جو عالم عقبیٰ مین ملنے والا ہی۔ اِس لحاظ سے، جنت کا لالچ اور دوزخ کا خوف ہی، ہماری حیات عملی کی علت غائی ہی، اور نیک کرداری، نام ہی اس انجام بینی کا، جو حیات بعد الممات تک محیط ہی۔ اس انجام بینی کو دوسرے لفظون مین محرک مذہبی سے تعبیر کر سکتے ہین۔ رہا یہ عقیدہ کہ نیکی، کبھی محض نیکی کی حیثیت سے قابل اختیار ہو سکتی ہی، سو یہ اس جماعت کے نزدیک بھی ایسا مہمل عقیدہ ہی، جس کا قایل صرف ایک غیر متمدن و وہم پرست دماغ ہی ہو سکتا ہی۔

یہ جو نظریہ ہم نے ابھی بیان کیا، اس پر بہ حیثیت فلسفہٴ خود غرضی کے ایک نظریہ کے، دو اعتراضات ممکن ہین، پہلا اعتراض یہ ہو سکتا ہی کہ اس نظریہ مین حصول جنت کے لیے نیک کرداری کی کوئی خاص مقدار نہین ٹھہرائی گئی ہی، اسلیے یہ بالکل ممکن ہی کہ انسان حصول جنت کا حق ثابت کیے بغیر اس دنیا مین بعض معاصی کا مرتکب ہوتا رہے۔ مگر اس کا جواب یہ ہی کہ اول تو مقتضائے احتیاط یہ ہی کہ مقدار نکوئی کی عدم تعیین ہی ہم کو نیک کرداری کے لیے اور زیادہ برانگیختہ کرے گی دوسرے یہ کہ سزا و جزا ایک کلی و مجموعی طور پر نہین ملے گی، بلکہ اس کے مدارج مختلف ہون گے اور ہر شخص کو اس کے مدارج محاسن و معاصی کے مطابقت مین ملے گی۔ اعتراض دوم یہ ہی کہ "آج تو چین سے گزرتی ہی، عاقبت کی خبر خدا جانے" یعنی موجودہ لذات تو بہرنوع قطعی

ویقینی ہین، پس اُن سے آیندہ لذات ومسرات کے توقع پر متلذذ نہ ہونا، یا نقد کو نسیہ پر چھوڑ دینا، کونسا پرمنفعت اصول تجارت ہی؟ اس کا جواب یہ ہی کہ وہان کے نعایم ولذائذ یہان سے اسقدر بیحد وحساب ارفع وبرتر ہین، کہ ان کے مشتبہ وممکن وجود خیال کو بھی حیات موجودہ کے یقینی ومحسوس نعایم ولذائذ پر مقدم رکھنا یکسر دانشمندی ہی۔

اسی فرقہ کے بعض علمأ افادئیت کے عام شاہراہ سے کچھ ہٹ سے گئے ہین، ان لوگون کا قول یہ ہی، کہ اساس اخلاق، افادہ نہین، بلکہ تقدیر آلہی ہی، جسکی علت مجہول ومستور ہوتی ہی، یہ مسلک جسکی بنا، ازمنہ متوسطہ مین اوکہم اور اسکے بعض معاصرین نے ڈالی تھی، آج کل ذرا زیادہ چمک گیا ہی، اور اس کی اس جدید مقبولیت کے متعدد اسباب ہین۔ بعض اس کی تائید مین فلسفیانہ حیثیت سے یہ استدلال پیش کرتے ہین، کہ ہر قانون کے لیے کوئی مقنن لازمی ہی، پس قانون اخلاق اس سے مستثنےٰ نہین ہوسکتا، اور بعض حلقون مین اس کی حمایت کا محرک محض یہ جذبہ ہی، کہ اخلاق کو مستقلاً مذہب کا ماتحت ہوکر رہنا چاہیے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہین، جو اسے اس لیے مانتے ہین کہ اس سے اُن مخالفین کے مقابلہ مین جواب الزامی ہاتھ آتا ہی، جو عیسائیت پر یہ اعتراض کرتے ہین، کہ اس نے فرمان ربّانی کی آڑ مین بعض بداخلاقیون کو جائز کر رکھا ہی۔ یا پھر آخر مین اُن لوگون نے بھی یہ بین بین کا مسلک اختیار کیا، جو اپنے بعض اعتقادی حاسات کی بنا پر ایک طرف تو نظام اخلاق افادی سے نفور تھے، اور دوسری جانب یہ بھی اُنھین تسلیم کرتے نہین بنتا تھا، کہ انسان جیسی شرارت سرشت مخلوق مین رہنمائی صراط مستقیم کی کوئی فطری قوت ودیعت ہی۔

تاہم یہ مصنفین بھی ہین بہر حال افادی ہی، اور ہیر پھیر کر کہتے وہی بات ہین جو افادئین ہی کی کہنے والی ہی۔ چنانچہ جب ان سے یہ دریافت کیجیے، کہ آخر اس تقدیر الٰہی یا مشیت ربانی کا ہمارے پاس کیا ذریعہ علم ہی؟ تو یہ جواب دینے لگتے ہین، کہ یہ یا تو الہام کے ذریعہ سے خاصان خدا کو منکشف ہوجاتا ہی، اور یا پھر اس کا پتہ ہم افادۂ عام کے معیار سے چلا سکتے ہین۔ دلیل اس کی یہ ہی، کہ مطالعہ فطرت سے ہمین معلوم ہوتا ہی کہ خدا، انسان پر حد سے زیادہ مہربان اور اس کا اعلیٰ ترین بھی خواہ ہی،

اس لیے جس فعل سے عامۂ خلایق کو نفع ہو سکتا ہے، وہ یقیناً منشاے الٰہی کے مطابق ہو گا۔ اس کے بعد جب یہ سوال کیجیے، کہ منشاے الٰہی کی تعمیل کیون واجب ہے؟ تو دو مختلف جماعتین اس کے دو مختلف جوابات دیتی ہین۔ ضمیریئین تو یہ کہتے ہین، کہ ہم خود اپنی فطرت وساخت کے لحاظ سے اپنے محسن حقیقی وخالق کی تعمیل ارشاد پر مجبور ہین۔ افادئین یہ جواب دیتے ہین کہ قادرِمطلق کو ہر طرح کے عذاب وعقوبت، اور صلہ وانعام کی قدرت حاصل ہے، اس لیے ہماری جان کی عافیت اسی مین ہے کہ اس کے احکام کی تعمیل کرتے رہین۔ اب جس گروہ مصنفین کا ہم ان سطور مین ذکر کر رہے ہین، اُس نے بھی آخر الذکر جواب اپنے لیے پسند کیا ہے، چنانچہ اس گروہ کا سب سے زیادہ رودار، پیلی[۵] ان الفاظ مین اپنے عقیدہ کا لب لباب رکھتا ہے:-

"نیک کرداری کا مدعا، افادۂ عام ہے؛ معیار، منشار الٰہی ہے؛ اور محرک وغایت خود فاعل کی ذاتی مسرت ابدی ہے"

اس تمام تفصیل وتصریح سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا، کہ افادئین (یا استقرائیین) کا اصل الاصول کسی ایسی باطنی حس اخلاقی کے وجود سے یکسر انکار ہے، جو از خود وبلا واسطہ ہمین راہ راست کی ہدایت کر سکے، یا ہم مین احساس فرض پیدا کر سکے۔ نیز یہ کہ یہ لوگ خود جس واحد اصول کے قائل ہین، وہ ان کا یہ اصول موضوعہ ہے، کہ حصول مسرت ایک عالمگیر جذبہ ہے، اور خواہش مسرت ایک منتہاے مقصود یا غایۃ الغایات کا حکم رکھتی ہے، اس لیے حسن عمل کا انحصار اُس عمل کی مسرت افزائی ہے، اور حسن عمل کا محرک، فاعل کی ذاتی مسرت ہے، جو اُسے خواہ واقعۃً حاصل ہو رہی ہو، خواہ اس کے حصول کی توقع ہو۔ گویا اس لحاظ سے نیک کرداری کے جو محرکات ہین، وہی اُس کے وجوب وفرضیت کے بھی ضامن ہین، اور اگر اُن سے قطع نظر کر لی جائے، تو کسی امر نیک کا وجوب ایک بے معنی لفظ رہ جائے گا۔ پھر صفحات گزشتہ مین ہمین یہ بھی معلوم ہو چکا ہے، کہ یہ محرکات اخلاق مختلف افادئین کے نزدیک، اپنے درجہ ونوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتے رہتے ہین، مثلاً

[۵] ولیم پیلی (۱۷۴۳ء تا ۱۸۰۵ء)

پیلی کے نزدیک گو نیک کرداری کے بعض اور ضمنی و فرعی محرکات بھی ہین، لیکن مذہبی محرک ان سب سے افضل و اعظم ہے، کہ اگر اُسی کو محرک و حید کہین، تو بھی کچھ بیجا نہین، یا مثلاً لاک[1] کے نزدیک محرکات اخلاق کی تین قسمین ہین۔ عالم آخرت کی جزا و سزا، قانون کی پابندیان، ہیئت اجتماعیہ کی نیکنامی و بدنامی اور یا مثلاً بنتھم کے نزدیک محرکات اخلاق ان عنوانات اربعہ کے ماتحت رکھے جاسکتے ہین۔ اولاً جسمانی، یعنی وہ امراض جو بدکرداریون سے پیدا ہوجاتے ہین ثانیاً سیاسی یعنی تعزیرات قانونی ثالثاً اجتماعی یا عمرانی، یعنے شہرت و رسوائی کا خیال رابعاً روحانی یعنی آخرت کی سزا و جزا۔

سولھوین اور سترھوین صدی کے انگلستان مین یہ معرکہ ایک عرصۂ دراز تک نہایت شد و مد سے اُن دو فریقون کے درمیان جاری رہا، جن مین سے ایک عقل و تجربہ کو اساس اخلاق قرار دیتا تھا، اور دوسرا ضمیر یا ایک مستقل باطنی حس اخلاقی کو، ضمیریت کی بنا تو شیفٹسبری[2] ہی کے ہاتھون پڑچکی تھی، لیکن اب جس مستحکم و ناقابل دفاع قوت کے ساتھ ہچیسن نے اسے ثابت کیا اس کی نظیر پیشتر کبھی نہین گزری تھی، اسی طرح بٹلر، ایڈم اسمتھ، و ہیوم نے بھی اپنے تصانیف کے اکثر مقامات پر اس مسئلہ کے مختلف پہلوون پر رد و قدح کی ہے، ہابس نے اپنے مسلک کی بنیاد جس خود غرضی پر رکھی تھی، اس کی جھلک کسی قدر خفت کے ساتھ بنتھم تک کے ہر صفحہ مین نظر آتی ہے۔ البتہ اس کے اتباع اس بارۂ خاص مین اپنے پیشرو سے کچھ منحرف ہوگئے، اور منحرف کیا ہوگئے، یہ کہنا چاہیے، کہ ان کے ہاتھ مین پڑکر افادیت کا رنگ ہی سرے سے بدل گیا۔ اس تغیر یا استحالہ کے اسباب خاص یہ ہوے، ایک تو نفس انسانی مین جذبۂ ہمدردی (یا بے غرضی) کے وجود کا اعتراف اور دوسرے مسئلہ ائتلاف افکار۔

انسان کی خلقت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے، کہ دوسرون کی مسرت سے وہ بھی مسرور ہوتا ہے، اور دوسرون کو راحت مین دیکھ کر اُس کے دل کو بھی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جسے آج عام ناظرین چاہے ایک بدیہی حقیقت کی طرح پر بےچون و چرا تسلیم کرلین، لیکن ہم اس سے

---

[1] جان لاک (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء)
[2] لارڈ شیفٹسبری (۱۶۷۱ء تا ۱۷۱۳ء)

ناواقف نہین، کہ ہابس اس کا شدید منکر ہوا ہی، اور اٹھارویں صدی مین ہلوٹیس کے اتباع کا بڑا زور یہ ثابت کرنے پر صرف ہوا کیا ہی، کہ وہ جذبات الفت، جن پر علایق خانگی و اجتماعی کا دارمدار ہی، کوئی اپنا مستقل بالذات وعلیحدہ وجود نہین رکھتے بلکہ شخص محبوب کی ضرورت کے پیدا کردہ ہوتے ہین۔ بنتہم اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہی یعنی وہ اُن مسرات وآلام کے وجود محض سے کم ازکم انکار تو نہین کرتا جو بلا اغراض شخصی کے واسطہ کے محض جذبۂ ہمدردی سے پیدا ہوتے ہین، اگرچہ وہ اُن کی اہمیت کو اس درجہ خفیف گردانتا ہی، کہ (جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہی) محرکات نیک کرداری کی فہرست مین وہ انھین کوئی جگہ نہین دیتا۔ بنتہم کے تلامذہ وتبعین اس سے کچھ اور ترقی کرتے ہین۔ یعنے وہ اس طرح کے غیر خود غرضانہ جذبات کے وجود کو پوری صفائی کے ساتھ تسلیم کرنے لگتے ہین، گو اس کے بعد اس سوال پر وہ خود آپس ہی مین جھگڑنے لگتے ہین، کہ ان جذبات کا اصل ماخذ کیا ہی؟ ان مین سے ایک گروہ تو یہ کہتا ہی، کہ ہمارے ان غیر خود غرضانہ جذبات، ہمارے ان جذبات ایثار، کا اصلی منبع وماخذ وہی جذبۂ خود غرضی وانانیت ہی ہوتا ہی، اور اسی سے یہ سب، قوانین ایتلاف افکار کی ماتحتی مین جن کی تفصیل آگے آتی ہی، ماخوذ ومرکب ہوتے ہین۔ دوسرا فریق اس کے مقابلہ مین، یہ تسلیم کرتا ہی، کہ یہ جذبات، بلاواسطہ ومستقلاً خود ہماری فطرت وسرشت کا ایک جزو ہوتے ہین۔ غرض یہ کہ گو ان کے طریق تولید وتکوین مین اختلاف آرا ہو، لیکن اس پر اجماع ہو جاتا ہی کہ یہ وجود رکھتے ہین، ان کی تہذیب وتربیت فلسفۂ اخلاق کا مقصود حقیقی ہی، اور یہ کہ ان سے جو مسرت پیدا ہوتی ہی، وہی نیک کرداری کی محرک اصلی ہوتی ہی۔ اب یہان سے ضمیرئین وافادئین کے درمیان جو امور مابہ النزاع رہ جاتے ہین، وہ دو عنوانات کے تحت مین لکھے جا سکتے ہین (۱) یہ تو دونون متفق ہین، کہ سرشت بشری مین شرافت ورذالت دونون طرح کے جذبات موجود ہین، اور ہم بلا کسی خارجی توسط کے، اُن کے درمیان از خود امتیاز کر سکتے ہین اختلاف جو کچھ ہی، وہ یہ ہی کہ بہ قول ضمیرئین کے، ہمین اس کا علم بھی فطرۃً ہو جاتا ہی کہ طبقہ اول الذکر کے

جذبات طبقۂ آخر الذکر کے مقابلہ مین بہتر و قابل ترجیح ہین، لیکن افادئین کو یہ مسلم نہین۔ (۲) دوسرے عنوان کے تحت مین، اس حد تک فریقین کا اتفاق ہے، کہ دوسرون کے ساتھ نیکی کرنے مین خود فاعل کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، لیکن مختلف فیہ یہ جزو ہے، کہ ضمیرئین کے نزدیک، یہ لطف مسرت فاعل کی نیت مین داخل نہین ہوتی۔ بلکہ حسن عمل سے بطور نتیجہ کے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، بہ خلاف اس کے افادئین اس کے مدعی ہین، کہ توقع حصول مسرت، شروع سے فاعل کی جزو خیال ہوتی ہے، بلکہ درحقیقت یہی توقع استلذاذ اُسے حسن عمل پر آمادہ کرتی ہے، اور نیک کرداری کے لیے اصل محرک کا کام دیتی ہے۔

لیکن مذہب افادئیت کے سلسلہ مین سب سے زیادہ پُر اثر و قابل قدر وہ نظام اخلاق ہے، جو ہارٹلی کے قانون ایتلاف افکار پر مبنی و متفرع ہے؛ اس مسئلہ کی اہمیت، افادیت کے نقطۂ خیال سے اسی قدر عظیم الشان ہے، جیسی ضمیرئین کے لیے ایک فطری حس اخلاقی کی ہے، قدما اس مسئلہ سے بالکل ناواقف تو نہین کہے جا سکتے، تاہم اس کی یقیناً انھین خبر نہ تھی، کہ اس کے حدود کس قدر وسیع ہین، اور اس سے نتائج کس قدر مہتم بالشان اخذ کیے جا سکتے ہین۔ جستہ جستہ اس کا ذکر ارسطو کے صفحات مین آگیا ہے، اسی طرح بعض لذتیئن نے دوستی کی تحلیل و تجزیہ اسی مسئلہ کے بَل پر کی ہے۔ وہ کہتے ہین، کہ جب ہم کسی سے دوستی کرتے ہین تو اول اول اس کی بنیاد اُس لذت پر حاصل ہوتی ہے، جو اس کی دوستی سے ہمین حاصل ہوتی ہے، لیکن چند ہی روز مین ہم دوستی کے منافع و لذائذ سے قطع نظر کرکے، دوست کو محض اُسی کے خاطر محبوب رکھنے لگتے ہین۔ پھر دور جدید کے آغاز مین لاک اس مسئلہ کی تجدید کرتا ہے، اور درحقیقت "ایتلاف افکار"، کی اصطلاح اُسی کی وضع کردہ ہے، لیکن وہ غلطی سے اس کا دائرۂ عمل بہت ہی محدود خیال کرتا ہے، اور اسے محبت و عداوت کی چند صورتون پر منطبق کرنے کے بعد آگے نہین بڑھتا۔ اس کے بعد ہچسین پیدا ہوتا ہے، جو صحیح معنی مین ہارٹلی کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ بہ قول اس کے مشاہدہ کی اس حقیقت سے شاید کوئی انکار نہین کر سکتا، کہ بعض چیزین، اپنی لذت بخشی کے لحاظ سے ہمارے لیے مقصود بالذات

ہوتی ہین اور بعض چیزین ایسی ہوتی ہین، جو ان اشیاءِ مقصودہ کے لیے آلہ یا وساطت کا کام دیتی ہین، لیکن پھر رفتہ رفتہ یہی موخرالذکر خواہشات آلیہ یا ثانویہ، خواہشات اصلیہ ہی جیسی قوی ہو جاتی ہین۔ مثلاً دولت، یا قوت، کا اصلی مقصد اس سے زائد کچھ نہ تھا، کہ خواہشات اصلیہ و اولیہ کے پورا کرنے مین ہماری معین ہون، لیکن رفتہ رفتہ اس کا یہ اثر ہوا، کہ یہ چیزین خود مقصود بالذات ہو گئین چنانچہ زر و مال، جاہ و قوت کہ اُن کی حیثیت آلی تک کوئی محدود نہین رکھتا، بلکہ حُب جاہ و حب زر کا مرض عالمگیر ہو گیا ہے۔ ہچیسن کے بعد گے نامی ایک پادری کی ایک چھوٹی سی تصنیف نمودار ہوتی ہے، جسے آج تو کوئی پوچھتا بھی نہین، لیکن جس مین درحقیقت اس مسئلہ کے اکثر پہلوون پر محققانہ نظر کی گئی ہے، اور جس کے بابت خود ہارٹلے کو اعتراف ہے، کہ اس کا ایک ماخذ یہی ہے، وہ کہتا ہے، کہ ہچیسن کی یہ راے تو صحیح نہین، کہ نفس بشری مین طبعاً و فطرۃً کوئی حس اخلاق موجود ہے، ہان یہ ضرور ہے، کہ جن دلائل کی بنا پر ہچیسن یہ دعویٰ کرتا ہے، کہ ایک عاقل و بالغ شخص حس اخلاقی رکھتا ہے، وہ بلاشبہ ناقابل تردید ہین، اور اس مین اور لاک کے مسئلہ، خواہشات ثانویہ مین کوئی تعارض نہین۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے، کہ جس طرح حیات عقلی مین اکثر ہم اپنے استدلالات مین بناے اصلی، بدیہیات و اولیات کو نہین قرار دیتے، حالانکہ اصولاً ہمین یہی چاہیے تھا، بلکہ اُن کی بنیاد ایسے قضایا پر رکھ دیتے ہین، جو خود ہی محتاج ثبوت ہوتے ہین، بعینہٖ اسی طرح حیات اخلاقی مین، ہم اکثر اپنے اعمال حسنہ کی واجبیت پر یہ استدلال نہین کرتے، کہ ان سے مسرت مین اضافہ ہوتا ہے، حالانکہ صحیح استدلال یہی ایک ہو سکتا ہے، بلکہ اکثر ان کی سند مین یہ پیش کر دینا کافی سمجھتے ہین، کہ ان سے فلان فلان وسایط مسرت پیدا ہوتے ہین۔ اب چونکہ یہ وسایط مسرت، اعمال حسنہ کی سند مین متواتر پیش ہوتے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ خود مقصود بالذات سمجھے جانے لگے، چنانچہ اکثر ہم ایسی نیک کرداریون کی مدح و ستایش کرنے لگے، جن سے ہمارے علم مین، ہمارے منافع و لذات کو کوئی واسطہ نہ تھا، اس طرح نیکی بذاتہٖ ایک محمود و پسندیدہ شے قرار پا گئی۔

ہارٹلے کی[1] وہ مشہور کتاب جس مین انھین نظریات کا بیان ہے، ۱۷۴۹ء مین شائع ہوئی اس مین مسائل عضویات کا اس کثرت سے ذکر ہے، اور اعصاب وجذبات کے تعلقات وتعامل کی اس قدر تفصیل ہے، کہ باوجود اس کے، کہ پریسٹلے، بلشم، وٹنگر (علماء سائنس) نے اس کا زور وشور سے خیر مقدم کیا تھا، اُس وقت خالص اخلاقی حلقون مین اس کی کچھ قدر و وقعت نہ ہوسکی، اور اس کی اخلاقی حیثیت مدت تک دبی دبائی رہی تاآنکہ اُنیسوین صدی کے بعض اکابر افادیین، مثلاً جیمس[2] مل نے اسے چمکا دیا، ہارٹلے کے نظریات کو چاہے ہم مانین یا نہ مانین، لیکن اس سے انکار نہین ہوسکتا، کہ اس کے نظام فلسفہ کی عظمت وباقاعدگی یقیناً مستحق داد ہے، خیال کرنے کی بات ہے، کہ ایک شخص اپنے نظام کا سنگ بنیاد، ہابس و مانڈیول کے اس کلیہ پر رکھتا ہے، کہ نفس بشری مین نظرۃً کسی طرح کی ایثار وعالی ظرفی کا وجود نہین، پھر اس مین وہ کسی شریفانہ وغیر خود غرضانہ عنصر کی آمیزش نہین ہونے دیتا، لیکن باین ہمہ محض قوت استدلال اور فلسفیانہ لف ونشر کی مدد سے، وہ انتہائی خود غرضی ونفس پرستی کی بنیاد پر اعلیٰ ترین ایثار، اعلیٰ ترین نفس کشی، کی عمارت کھڑی کردیتا ہے! اس استحالۂ جذبات کی توضیح درکار ہو، تو حریص وبخیل شخص کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ دولت مین فی نفسہ کچھ بھی دلکشی یا لذت بخشی نہین ہوتی، لیکن چونکہ وہ آلہ ہوتا ہے، یا قیمت ہوتی ہے، جس سے ہم منافع ولذائذ خرید کرسکتے ہین، اس لیے اُس کا تصور ہمارے ذہن مین لذت ومسرت کے تصور کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے، یعنی ہمین خود دولت سے محبت ہوجاتی ہے، جو بعض حالات مین ایسی فوق الحد ہوجاتی ہے، کہ خود اُن چیزون کا شوق، جن کی خرید کے لیے دولت صرف قیمت کا کام دے سکتی ہے، اس کے سامنے دب جاتا ہے، یہانتک کہ زرپرست کو اُن سب چیزون سے دست بردار ہوجانا منظور ہوتا ہے، لیکن یہ نہین گوارا ہوتا کہ اپنی دولت کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی صرف کرے۔ انسان کے لیے اپنی جان سے زیادہ تو کوئی محبوب شئی نہین ہوسکتی، لیکن زرپرست جان دیدیگا، پر ایک حبہ نہ خرچ کریگا۔

[1] ڈیوڈ ہارٹلے (۱۷۰۵ء تا ۱۷۵۷ء) [2] جیمس مل (۱۷۷۳ء تا ۱۸۳۶ء)

اور اکیلی دولت پر کیا موقوف ہی ہر چیز کا یہی حال ہی۔ جاہ و اقتدار، ابتدائً ہمین اسیلیے مرغوب ہوتا ہی کہ اس سے ہم اپنے مرغوبات اصلیہ حاصل کر سکتے ہین، لیکن کچھ عرصہ تک ان دونون تصورات کے ارتباط کے بعد آخر مین کیا حالت ہوجاتی ہی؟ یہ کہ اُن مرغوبات اصلیہ کا شوق تو یون ہی سا رہ جاتا ہی، البتہ نفس مین جاہ پرستی و اقتدار پرستی پیدا ہوجاتی ہی۔ مدح کا منشا یہ ہوتا ہی کہ مداح کو ہم سے محبت ہی، اور چونکہ دوسرون کی محبت والفت، ہمارے اغراض اصلیہ کے حصول مین ہماری معین ہوتی ہی، اسیلیے ہم ابتدائً اُسے بہ طور ایک واسطہ کے پسند کرتے ہین لیکن رفتہ رفتہ یہ حیثیت آپ ساقط ہو کر مدح وستایش فی نفسہ ایک محبوب شی ہوجاتی ہی، اور بعض اوقات یہ خواہش ہم مین اس درجہ تک پہنچ جاتی ہی، کہ ہم اسے حاصل کرنے کے پیچھے اپنی عزیز سی عزیز شی کو قربان کر دین گے، اور یہ صرف اسیلیے کہ موت کے بعد بھی ہماری شہرت وستایش قائم رہے، حالانکہ ظاہر ہی کہ اُس وقت اس کی آواز ہمارے کانون تک نہ پہنچ سکے گی۔ اور آگے بڑھیے، تو ایتلاف افکار کی وسعت اثر کا اس سے بھی زیادہ دلکش تماشہ نظر آتا ہی۔ ہم ستایش کو پہلے اسیلیے پسند کرتے ہین کہ اس سے ہمین منافع حاصل ہوتے ہین، اسکے بعد ستایش کو ہم خود اُن منافع سے زیادہ عزیز رکھنے لگتے ہین۔ پھر وہ درجہ آتا ہی کہ ہم اپنے شوق وخواہش کو بجاے ستایش کے اُن اعمال کی طرف منتقل کر دیتے ہین، جو قابل ستایش ہوتے ہین۔ آخری مرتبہ یہ ہی، کہ ہم قابل ستایش اعمال کے اخذ واکتساب مین اس قدر محو ومنہمک ہوجاتے ہین، کہ ہمین دائمی بدنامی و رسوائی قبول ہوتی ہی، مگر اُن اعمال کو ترک کرنا گوارا نہین ہوتا، جنھین ہم قابل ستایش فرض کر چکے ہین۔ اِن مثالون سے اُکتا نہ جائیے۔ ذرا نظر کو اور وسیع کیجیے، تو ایتلاف افکار اپنے عموم اثر وہمہ گیری کے اس سے بھی زیادہ شاندار مناظر آپ کے سامنے کر دیگا۔ بلکہ سنتے تو یہ ہین، کہ اس کا حلقۂ اثر، تمام تر حاسات اخلاقی پر محیط ہی۔ ماں کے پیٹ سے کوئی بچہ احساسات اخلاقی ساتھ لیکر نہین آتا، اور شروع شروع اس کے اعمال کی محرک تمام تر اس کی خود غرضی ہوتی ہی۔ لیکن رفتہ رفتہ بچہ اپنے ذاتی نفع کو اپنی والدہ کے تصور سے، لڑکا اپنے ذاتی نفع کو

اپنے خاندان کے تصور سے، اور بالغ انسان اپنے ذاتی منافع کو اپنی جماعت، اپنے مذہب، اور اپنے ملک کے تصورات کے ساتھ وابستہ کرنے لگتا ہے، اور اس طرح مستقل و علیحدہ اُلفتون کا سلسلہ قائم ہوجاتا ہے۔

اسی طرح، بچہ جب دوسرون کو کسی دُکھ درد مین مبتلا دیکھتا ہے، تو اُسے خود اپنی گزشتہ تکالیف یاد آجاتی ہین، اور یہ یادداشت بجائے خود دردناک ہوتی ہے۔ اس پر بائین بچون کی تخئیل کو متاثر کرکے اُن کی قوت ہمدردی کو اور تقویت پہنچاتی ہین۔ پھر جب چند بچے یکجا ہوکر تعلیم پاتے ہین، تو جو مصیبت کسی ایک پر آتی ہے، وہ تمام رفقا پر کم و بیش متعدی ہوتی ہے۔ غرض مآل کار ان تمام موثرات کا یہ ہوتا ہے، کہ دوسرون کی تکلیف کا تصور ہمارے ذہن مین، ہمارے ذاتی تکلیف کے تصور سے وابستہ ہوجاتا ہے، اور یون بالآخر جذبۂ ہمدردی کی تکوین ہوجاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس فیاضی و عدل، ہمارے ذہن مین ابتداءً ان خیالات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہین، کہ ان سے اپنے ابناے جنس کی نگاہ مین ہماری وقعت ہوگی، اور آیندہ ان کی طرف سے ان کا صلہ ملے گا، چنانچہ اول اول، ہم انھین اسی بنا پر عزیز رکھتے ہین، لیکن آخر کار وہ بذات خود ہمین محبوب ہوجاتے ہین۔ برخلاف اس کے ان کے متضاد علاقات ایتلاف، ہم مین متضاد جذبات پیدا کردیتے ہین، جیسا کہ دناءت و ناانصافی کے متعلق ہم مین جذبات ناملایم پیدا ہوجاتے ہین۔ غرض، اسی طرح ایتلاف افکار کے واسطہ سے بالآخر نیکی، ہماری تمام خواہشات کا منتہاے مقصود قرار پاجاتی ہے؛ اور ہماری مسرتین جس قدر اُن افعال سے پیدا ہوتی ہین، جنھین نیک کہا جاتا ہے، اتنی اور کسی سے نہین پیدا ہوتین۔ دوسرے اگر اعمال نیک کرتے ہین، تو ہم اُن کے فوائد مین شریک ہوتے ہین؛ ہم خود اگر نیکی کرتے ہین، تو اس سے دوسرون کی نظر مین ہماری وقعت بڑھتی ہے؛ مدح و ستایش کے جتنے الفاظ لغت مین مل سکتے ہین، سب نیکی ہی کے لیے مستعمل ہین؛ ہجو و ذم کے جتنے الفاظ ہین، سب بدی کے لیے ہین؛ خود مذہب، نیکی کے صلہ مین غیر محدود لذائذ و نعائم کی توقعات

دلاتا ہے اور بدی کی پاداش میں لاانتہا عذاب وعقوبت کی وعید سناتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ راحت ومسرت کے جس قدر بھی تصورات ہوسکتے ہیں، سب کے ساتھ نیکی ونیک کرداری کا تصور وابستہ ہوجاتا ہے۔ اب دنیا کی جس شے کو بھی اس قدر موید ات ومحرکات مل جائیں گے، اُس کی قوت کا کیا ٹھکانا رہے گا، چنانچہ نیک کرداری کے متعلق بھی ہم یہی پاتے ہیں۔ یعنی ان متعدد عوامل کی مجموعی قوت کا یہ اثر پڑا کہ نیک کرداری، جو پہلے حصول مسرت مختلفہ کا ایک آلہ وذریعہ تھی، اب بذات خود ہمارے اعمال کے لیے ایک منتہائے مقصود وغایت حقیقی بن گئی، اور اُس نے ہمارے نفس کے اندر ایسی جڑ پکڑ لی، کہ اُس کے اکتساب وعمل میں ہمیں انتہائی لطف اور اُس کے ترک وخلاف ورزی سے انتہائی اذیت ہونے لگی۔ یہی معنی ہیں ضمیر یا کانشنس یا وجدان اخلاقی کے۔ اور یہیں سے ضمیر کی طاقت، تمام دیگر محرکات عمل کی طاقت پر غالب آجاتی ہے، اور رفتہ رفتہ یہ اس حد تک پہنچ جاتی ہے، کہ ایک مجاہد اخلاق یا ہیرو اپنی جان تک کو قربان کردیتا ہے، لیکن فرمان ضمیر سے سرتابی نہیں کرسکتا ہے یہ ہے ایتلاف افکار کی قوت اثر!

ارتقاء حاسات اخلاقی کا یہ دلچسپ، گو بعض حیثیات سے محض خیالی، نظریہ، انگلستان کے باہر تو نہیں، لیکن خود انگلستان میں خوب مقبول ہوا۔ اس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے، جو باہم نہایت مختلف الخیال تھے۔ اور اس کے مان لینے سے استقرائین اخلاقی پر سے کم از کم بعض اعتراضات تو ضرور ساقط ہوجاتے ہیں۔ مثلاً جب ضمیرئین، معترضانہ لہجہ میں کہتے ہیں، کہ "اتنی بات کا ہر شخص بجائے خود اپنے ذاتی تجربہ سے اطمینان کرسکتا ہے، کہ نیک کام کرتے وقت کوئی شخص کبھی اس کے نتائج کی لذت بخشی کا اندازہ نہیں کرتا، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے، کہ کسی کام کے کرتے وقت اتنی فرصت ہی کس کو ہوتی ہے، کہ وہ نتائج کا حساب کرے، ہر عمل کی تحریک دفعتہً ہوتی ہے، پس اتنا موقع کسی کو کہاں مل سکتا ہے کہ نتائج اعمال کی لذت بخشی یا الم انگیزی کا فیصلہ کرے، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ عمل کی فوری وقطعی تحریک ایک فطری حس اخلاقی کا نتیجہ ہوتی ہے، نہ کہ تجربہ واندازہ نتائج کا" تو اس کے جواب میں افادئین کی

یہ مخصوص جماعت، جس کے نظریات کو ہم ابھی بیان کر چکے ہین، کہتی ہے کہ ایسے مواقع پر ہمارے اخلاقی فیصلون کی علت قریبہ یہی ایتلاف افکار ہوتا ہے جس کی بنا پر ہم بجاے اعمال حسنہ کے نتائج مسرت انگیز کے، خود اُنھین اعمال کو محبوب رکھنے لگتے ہین، اور اس کو چاہے ضمیر کہو خواہ جس نام سے تعبیر کرو، مگر یہ سب اُسی ایتلاف فکری کی کارفرمائی۔

عملی نقطۂ خیال سے دیکھیے، تو یہ نظریہ مسئلہ تعلیم کے لیے تخصیص کے ساتھ ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے پہلے یہ غور کرلینا چاہیے، کہ نیکی و بدی مین سے کسی ایک راستہ کے انتخاب کرتے وقت ہوتا کیا ہے؟ ایسے موقع پر ہوتا یہ ہے کہ دو متضاد سمتون سے لذات و مسرات کی کشش ہوتی ہے، اور جس سمت کی لذات سے ہماری قوت ارادی، زیادہ متاثر ہوتی ہے، بس وہی راستہ وہ اختیار کرلیتی ہے۔ یعنی اگر ہماری قوت ارادی کو بدی مین زیادہ لطف حاصل ہونے کی توقع ہے، تو ہم بدی پر مائل ہوجائین گے، اور اگر اُسے نیکی کا سررشتہ زیادہ پُرلطف نظر آتا ہے تو ہم جادۂ نیک کرداری پر پڑلین گے۔ لیکن ان دو پہلوون مین سے کسی ایک کی تقویت بجاے خود، ہمارے ابتدائی ایتلاف فکری کی نوعیت پر منحصر ہے، اگر بچپن سے ہم اپنے لطف و لذت کو نیک کرداری کے تصور کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہین، تو لامحالہ ہمارے ذہن مین نیک کرداری کا پلہ وزنی رہے گا، اور اگر اس کے برخلاف ہم شروع سے بدکرداری کے تصور سے لطف اندوزی کے خوگر ہین، تو یقیناً بدکرداری کو تقویت حاصل رہے گی۔ اور یہ شے، (بہ قول ان افادئین کے) بداہتہً ایسی ہے، جو تمامتر ابتدائی تعلیم و تربیت کے بس کی ہے، اگر شروع مین کوئی دوراندیش معلّم و مربی مل گیا، تو اس نے ہمارے تصورات لطف و لذت کو نیک کرداری کے ساتھ منسلک و وابستہ کرکے ہماری طبیعت مین نیکی کی جڑ بٹھادی، اور اگر معلم نااہل ہوا تو اس نے بدی کی خواہش استلذاذ ہمارے خمیر مین داخل کردی۔

اس سلسلہ مین ناظرین نے غالباً یہ نکتہ نظرانداز نہ کیا ہوگا، کہ یہ نظریہ بھی باوجود اپنی ظاہری ایثارآموزی و شایستگی کے، ہے اصولاً اُسی خودغرضی ہی پر مبنی۔ یہ مانا کہ ایک شخص، راہ ثواب

ہر طرح کے نقصان برداشت کرنے کو تیار ہو، اپنے ادائے قرض کے لیے ہر قسم کے ایثار، ہر قسم کی قربانی پر آمادہ ہو، لیکن پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا ان چیزوں کی اصل محرک اس کی خواہش لطف اندوزی نہیں؟ کیا اُس کو اس تمام ایثار میں لطف نہیں آتا؟ اور اگر آتا ہے، تو اُس میں اور ایک جاہ طلب، ایک عیش پرست، ایک شہوت ران شخص میں کیا فرق ہے؟ جس طرح ان کو جاہ طلبی، عیش پرستی، شہوت رانی میں لذت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اُسے ایثار میں لذت حاصل ہوتی ہے، دونوں کی حالت بالکل یکساں ہے۔ کہہ سکتے ہو، کہ یہ عیش ولطف عاجل ومادی ہیں، اور وہ بعید وخیالی، لیکن اول تو یہ کوئی نوعی واصولی فرق نہیں، دوسرے یہ کہ جن لوگوں کی بد اخلاقی وبدکرداری مسلم ہے، خود اُن کی لذات کب ہمیشہ مادی وعاجل ہوتی ہیں؟ ایک قارون وقت کو جو ہر لحظہ روپیہ کے اکٹھا کرنے میں مصروف رہتا ہے، کون سی مادی وعاجل لذت نصیب ہوتی ہے؟ اس کا لطف بھی محض خیالی ہوتا ہے پھر اس میں ایک نیک کردار شخص کے خیالی لطف کو کیوں ترجیح دی جائے؟

بعض ذہین طبایع (مثلاً مل[1]) اس کی یوں تاویل کرتے ہیں، کہ نیک کرداری کے ابتدائی چند اعمال تو حصول لطف کی توقع پر قصداً اختیار کیے جاتے ہیں، مگر اس کے بعد تمام اعمال حسنہ عادۃً سرزد ہوتے چلے جاتے ہیں، جن میں خواہش استلذاذ کو مطلق دخل نہیں ہوتا علی ہذا بدکرداری بھی اسی قانون کی پابند ہے، لیکن مصنف مذا کے نزدیک ایسی تاویلات سے اعتراض کی قوت مطلق ہلکی نہیں ہوتی۔ مانا کہ انسان کسی فعل کو بلا خیال حصول لذت، عادۃً کرتا چلا جارہا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کسی فعل کے بربنائے عادت کرتے رہنے کے معنے کیا ہیں؟ سوا اس کے اور کچھ نہیں، کہ افعال عادیہ کو ترک کرنے میں ہمیں سخت اذیت ہوتی ہے۔ اس اذیت سے بچنے ہی کے لیے ہم افعال عادیہ کے ترک پر قادر نہیں ہو سکتے۔ اور یہ دفع اذیت کا خیال جو اعمال حسنہ عادیہ کا محرک ہوتا ہے، حصول لذت ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔

[1] مشہور فلسفی جان اسٹوارٹ مل (سنہ ۱۸۰۶ء تا سنہ ۱۸۷۳ء)

جن ناظرین نے افادئین کی اصل تصانیف کا مطالعہ کیا ہے، وہ واقف ہون گے کہ یہ لوگ کس شد و مد سے اپنے نظام اخلاق کو فلسفۂ خود غرضی سے تعبیر کیے جانے پر اظہار بیزاری کرتے ہین۔ مگر میرے نزدیک، جو اعمال محض دفع اذیت و حصول لذت کی غرض سے کیے جاتے ہین، اُنھین خود غرضانہ کے لقب سے موسوم کیے جانے مین زبان یا اصطلاح کی کسی طرح کی غلطی نہین ہے، اور اگر میرا یہ خیال صحیح ہے، تو نظام افادیت کی جملہ اصناف کو فلسفۂ خود غرضی سے موسوم کرنا بالکل درست ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دو باتون کا اعتراف کرنا بھی مین ضروری سمجھتا ہون۔ ایک یہ کہ قدیم افادئین، مثلاً ہابس، مینڈیول، ہیلی وغیرہ کے معتقدات اور موجودہ شایستۂ لذتیت کے درمیان عظیم الشان فرق ہے، دوسرے یہ کہ خود متعدد ضمیرئین ور دواقئین، نیک کرداری کے مسرت بخش نتائج کا ذکر کرتے ہوے اکثر افادئین ہی کی بولی بول گئے ہین۔ اصل یہ ہے کہ قدیم و جدید افادئین کے طریق نظر ہی مین کسی قدر اختلاف ہے۔ قدما افادئین نے اپنے مسلک کی اس طرح تائید کی کہ خود نفس بشری کو دون پست و دنی کرکے دکھایا، کہ تمام اعمال انسانی، خود غرضی کے سانچے مین ڈھلے ہوے معلوم ہون۔ بہ خلاف اس کے جدید اساتذۂ افادیت نے نفس بشری کی انانیت پر اپنی تحلیل مین زور دینا مناسب نہین خیال کیا، بلکہ اُنھون نے خود لذت و مسرت کی تعریف اس قدر وسیع کردی، کہ اس کے تحت مین اجتماعی لذات، اور نفس کشی و ایثار کی مسرات سما گئین۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا ہم پیشتر کہہ چکے ہین، یہ متاخرین افادئین ضمیر کے وجود کے پوری طرح قایل ہین، اعمال انسانی پر اسکو جو حاکمانہ اقتدار حاصل ہے، اُسے بھی تسلیم کرتے ہین، اور پھر نفس بشری مین جذبات ہمدردی و ایثار کے بھی منکر نہین، البتہ یہ ضرور ہے وہ ان چیزون کو وہبی و فطری نہین سمجھتے، بلکہ ایتلاف افکار کا معلول قرار دیتے ہین۔ اپنے اصول کے لحاظ سے وہ یہ تو کس طرح مان سکتے ہین، کہ انسان ایسے اعمال پر قادر ہے، جو سرے سے غیر خود غرضانہ ہین، یعنی جن مین فاعل کے ذاتی لطف و مسرت کی آمیزش تک نہ ہو۔ لیکن

اس قدر وہ علانیہ تسلیم کرتے ہین، کہ انسان کو ایثار مین صرف انتہائی لطف حاصل ہو سکتا ہو، بلکہ نیک کرداری اور مسرت کے درمیان وہی ائتلاف کامل کہا جا سکتا ہو، جو انسان سے عادۃً دوسرون کے لیے نفع بخش اعمال صادر کراتا رہتا ہو، اور جس شخص کو ترک معصیت مین بہ نسبت ارتکاب کے زیادہ لذت نہ ملتی ہو اُس کی اخلاقی صحت کبھی درست نہین کہی جا سکتی۔ غرض یہ کہ قدما و متاخرین دونون اپنے تئین، افادیت کا نام لیوا قرار دیتے ہین، لیکن ان کے معتقدات و آرا مین زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہو۔

صفحات بالا مین افادیت کی تاریخ، یعنے عہد بہ عہد اُس کے تغیرات کی داستان بیان ہو چکی، جو اگرچہ مختصر و سرسری تھی، مگر شاید غیر واضح و غیر صحیح نہ تھی۔ اب مین چند اُن اہم اعتراضات کا ذکر کرتا ہون، جو اس نظریہ پر وارد ہوئے ہین، یا وارد ہو سکتے ہین اس کے بعد مین اُن لوگون کا ذکر اور اُن کی تائید کرون گا، جن کا یہ خیال ہو، کہ حاسات اخلاقی روز ازل سے ہماری سرشت کا ایک جزو ہین، اور گو تعلیم و تربیت اُن مین اصلاح و تہذیب پیدا کر سکتی ہو، مگر وہ انھین خلق نہین کر سکتی۔ اور پھر اس باب کے خاتمہ پر اِن احساسات اخلاقی کے ارتقا، یعنے ان کی ترتیب تاریخی کا بیان کرونگا تاکہ اخلاق کی تاریخ طبعی کو سمجھ لینے کے بعد ناظرین کو، ابواب آیندہ مین یہ دریافت کرنے مین سہولت ہو، کہ اخلاق کی طبعی تاریخ پر سیاسی و مذہبی تاریخ کے کیا کیا اثرات پڑے اور ارتقاء اخلاق، اِن خارجی مؤثرات سے کہانتک متاثر ہوا۔

فصل (۳)

افادیت پر اعتراضات

بہ قول سر ولیم ہملٹن[۱] کے علم النفس، شعور ہی کی ایک منضبط و تربیت یافتہ شکل کا

---

[۱] سر ولیم ہملٹن (۱۷۸۸ء تا ۱۸۵۶ء)۔

تام ہے۔ یعنی نفسیات کے جتنے مباحث ہیں ان کی صحت کا معیار اس کے سوا کچھ نہیں
کہ وہ ہمارے حالات و کیفیات شاعرہ کے بعینہٖ مطابق ہو۔ پس جب بعض علماء اخلاق نفسیات
کے سرحد میں داخل ہو کر یہ دعوی کرتے ہیں، کہ نیک کرداری کا معیار اعمال کی حیثیت افادی
اور اس کی محرک فاعل کی مسرت و لذت نہ ہوتی ہو، تو ہم میں قدرةً یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اس
دعوی کی تائید خود ہمارا شعور کہاں تک کرتا ہے، تو اس کے جواب میں مطالعہ باطن کا فتوی
یہ ملتا ہے، کہ اس سے زیادہ بے بنیاد کوئی دعوی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا
عجیب و غریب ادعا ہے، جس کی ہر ملک و ہر زبان میں تمام ان طریقوں سے تردید ہو رہی
رہی ہے، جن سے انسان اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتا ہے۔ ہر زبان میں نیک کرداری
اور اعمال افادی کے لیے جدا جدا الفاظ موجود ہیں، اور ہر وہ دماغ جس میں کچھ بھی
عقل و فہم ہے، ان دونوں کے مفاہیم میں فرق کرتا ہے۔ خود خیال کرو، کہ دنیا کا کوئی شخص
ایسا ہے، جس کے نزدیک مسرت افزائی اور نیک کرداری دو متباین چیزیں نہیں؟
دنیا کی کون زبان ایسی ہے، جس میں دور اندیشی اور ایثار کا فرق نظر انداز کر دیا گیا ہو؟
بے شبہ بالکل ممکن ہے، کہ کبھی کبھی ایک ہی فعل سے یہ دونوں نتائج حاصل ہو جائیں
یعنی وہ عمل نیک بھی ہو اور منفعت بخش بھی، لیکن اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ یہ دونوں
الفاظ مترادف ہو جائیں، یا دونوں کا اصولی و حقیقی تباین مٹ جائے۔ فرض کرو، ہم
کسی شخص کے متعلق یہ کہتے ہیں، کہ وہ کبھی جادۂ اخلاق سے منحرف نہیں ہوتا، تو اس کے
یہ معنی کبھی کوئی بھی نہیں لیتا، کہ وہ اپنے کردار میں ہمیشہ اپنے ذاتی یا اجتماعی منافع کو
مد نظر رکھتا ہے۔ اور یہ معنی لیے کیسے جا سکتے ہیں، جبکہ دوسری طرف نفس بشری کے نزدیک
بطور علوم متعارفہ کے یہ مسلم ہے کہ نیک کرداری کا عنصر حقیقی ایثار ہے، اور ایثار کے معنی
ہیں کسی طریق عمل کو بلا ادنیٰ شائبہ منفعت و لذت اختیار کرنا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص
محض ذاتی لطف کے لیے کسی فعل کا مرتکب ہو، اور اس میں کسی قسم کی بداخلاقی نہ ہو،

لیکن اس سے یہ نہیں ہو سکتا، کہ ہم لطف افزائی و منفعت بخشی کے پیدا کردہ اعمال کو نیک کرداری کا مرادف قرار دینے لگیں۔ ایسا نہ کرنا اُس واقعیت سے نہ صرف علیحدہ، بلکہ اُس کے بالکل منافی ہوگا، جو نفس بشری کے نزدیک مسلّم ہے۔ اپنی جگہ پر ذرا یہ تصور کرو، کہ کوئی ایپکیورین، یعنی تابع مسلک لذتیہ ایک مجمع عام کے سامنے یہ تقریر کر رہا ہے، کہ "میری زندگی کی غرض و غایت حصول لطف و لذت ہے" تو حاضرین پر کیا اثر پڑے گا؟ یقیناً وہ اسے نفس پرست سمجھیں گے۔ یا اسی طرح جو شخص اپنی زندگی کا رہبر فلسفۂ خود غرضی کو ظاہر کرتا ہے، اُس کو سوسائٹی کن نظروں سے دیکھتی ہے؟ وقعت و احترام سے یا ذلت و تحقیر سے؟ یقیناً ذلت و حقارت سے۔ اور اصل یہ ہے، کہ ہم اپنے دوست یا دشمن، اشخاص فرضی یا تاریخی، غرض جس کسی کی بھی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں، تو ہمیشہ ہمارے ہاتھ میں ایک ہی پیمانہ ہوتا ہے، یعنی جس قدر اُس شخص کے محرکات عمل میں ذاتی لطف و لذت کو دخل ہوتا ہے، اُسی قدر ہم اس کے اخلاق کو پست خیال کرتے ہیں، اور جس قدر اُن کا عنصر کم ہوتا ہے، اُسی تناسب سے ہم اُس کے اخلاق کو بلند و اعلیٰ قرار دیتے ہیں، یہ ایک ایسی واضح و مسلّم حقیقت ہے، جس سے کوئی شخص مجال انکار نہیں رکھتا، اور جس کی تصدیق و توثیق ہر ہر لحظہ ہمارے مطالعہ باطنی سے ہوتی رہتی ہے۔ لیکن بعینہٖ یہی وہ حقیقت ہے، جس سے لذتیین کو انکار ہے۔ اب جائے غور ہے، کہ جو فلسفہ اپنی بنیاد، مطالعۂ باطنی کے فتوے اور حالات شعور کی مطابقت پر رکھتا ہے، اور ساتھ ہی ایک ایسا دعویٰ بھی پیش کرتا ہے، جس کی تردید قدم قدم پر ہمارا شعور و مطالعہ باطن کر رہا ہے، وہ کہاں تک اپنی صحت دنیا سے تسلیم کرا سکتا ہے؟ کم از کم اس کی صحت مشتبہ تو ضرور ہو جاتی ہے۔

بعض لذتیین یہ کہتے ہیں کہ "ہم جس لطف و مسرت کے قائل ہیں وہ کوئی مادی لذت نہیں، بلکہ صرف وہ روحانی حظ ہوتا ہے، جو ہر نیک عمل کے انجام دینے پر ہم میں از خود پیدا ہو جاتا ہے" لیکن میرے نزدیک یہ تاویل کچھ بیکار ہی سی ہے، کیونکہ اگر فی الواقع

نیکی کی محرک یہ توقع ہی ہوتی ہے، کہ اس سے ہمین بالآخر اس قدر وجدانی لذت حاصل ہوگی جس کا پلہ اُس اذیت وتکلیف کے مقابلہ مین بہت بھاری ہوگا، جو ہمین اس وقت ضبط نفس یا ایثار مین اُٹھانی پڑ رہی ہے، تو اس کے معنے یہ ہوئے، کہ ہمین نیک کرداری مین کوئی تکلیف ہی نہین اُٹھانی پڑی۔ یا بہ الفاظ دیگر نیک کرداری یہ ہوئی کہ دو لذتون مین سے ہم نے لذت عاجل کے مقابلہ مین اُس لذت کو ترجیح دی جو گو دیر مین پیدا ہوگی، مگر بڑی ہوگی اور اس صورت مین یہ تاویل بیکار گئی، کیونکہ جو اعتراض اصل نظریۂ افادیت پر عائد ہوتا تھا، اس پر بھی بدستور قایم رہا۔

بات یہ ہے، کہ اس بحث مین جو نکتہ، اصل الاصول کا درجہ رکھتا ہے، افادئین اُسی کو نظر انداز کر گئے ہین۔ وہ نکتہ، جس کی تصدیق ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے کر سکتا ہے، یہ ہے کہ نیکی، اگر حصول لذت وحظ کی توقع مین کی جاتی ہے، تو پھر اُس سے لذت کبھی حاصل ہی نہین ہوتی! بلکہ حصول لذت کے لیے ضروری ہے کہ نیکی کرتے وقت ہمین صرف اُس عمل کا خیال ہونا چاہیے، اُس کے نتائج کی لذت بخشی کی طرف دھیان ہی نہ کرنا چاہیے۔ مثال کے لیے ہم دُعا کو لیتے ہین۔ دعا کے متعلق اتنا ہر فریق کو مسلم ہے، کہ خواہ اُس کی تاثیر ہوتی ہو یا نہ ہو، لیکن دعا کے بعد کم از کم طبیعت ضرور ہلکی ہو جاتی ہے، اور تسکین، طمانیت، وشگفتگی یقیناً پیدا ہو جاتی ہے، لیکن یہ حالت صرف اُن لوگون پر طاری ہوتی ہے، جو قبول دعا کے قائل ہین، اور حضور قلب وخضوع وخشوع کے ساتھ ایک قادر مطلق کے آگے التجا کرتے ہین۔ بہ خلاف اس کے جو لوگ استجابت دعا کے منکر ہین، وہ لاکھ دعائین کیا کرین، اُنھین کسی قسم کی تسکین وفرحت نہین حاصل ہوتی۔ ایک ہندو، اپنے مندر مین قدم رکھتے ہی، ایک خاص روحانی جذبہ سے متاثر ہونے لگتا ہے، لیکن مسلمان پر اس طرح کا کوئی اثر نہین پڑتا۔ ارباب تصوف پر مزارات مین جانے سے ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، لیکن معتزلہ واہل حدیث قطعاً غیر متاثر رہتے ہین۔ اسی طرح کی صدہا مثالین مل سکتی ہین۔ غرض یہ کہ جو نیکی بہ طمع استلذاذ کی جاتی ہے،

اس میں بالآخر کوئی لذت نہیں ملتی، لیکن جو نیکی محض نیکی کی غرض سے، تمام نتائج سے مستغنی ہوکر، خلوص قلب کے ساتھ کی جاتی ہے، صرف اُسی کا نتیجہ لذت بخش ہوتا ہے۔ زیادہ غور کرو، تو معلوم ہوگا، کہ نیک کرداری کے نتائج کے طور پر جو حظ حاصل ہوتا ہے، وہ در اصل صرف یہی خیال ہوتا ہے، کہ ہم نے ایک نیک کام کیا۔ لیکن اگر ہمیں شروع ہی سے یہ خیال ہو کہ ہم کوئی نیک کام نیکی کی خاطر نہیں، بلکہ کسی معاوضہ، صلہ، یا لذت، کی طمع میں کر رہے ہیں، تو یہ تو ایک طرح کی معاملت، یا روش داد و ستد ہو جاتی ہے، اور اس پر ہمارا ضمیر وہ تسکین و تفریح کبھی نہیں حاصل کر سکتا، جو احساس ادائے فرض کے ساتھ مخصوص ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر کرکے، یہ امر بھی قابل غور ہے، کہ ہماری سرشت کا اخلاقی پہلو، دیگر تمام پہلوؤں سے متمایز و متباین ہے، اور یہ تباین کیفی و کمّی دونوں حیثیات سے نہایت نمایاں و عمیق ہے۔ لیکن اگر افادئین کے اقوال کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ تباین کالعدم ہوا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے، کہ نیک کرداری کا معیار افعال کی مسرت افزائی ہے، تو لامحالہ ہمیں بہت سے ایسے افعال کو محاسن اخلاق کی فہرست میں داخل کرنا ہوگا، جنکی جانب حسن اخلاق کا انتساب ابتک کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا ہے۔ فلسفۂ تاریخ، اقتصادیات، وغیرہ تمام وہ علوم، جو حیات اجتماعی کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں، ان کا بامعان نظر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ نوع انسانی کی مجموعی راحت و مسرت کی تکوین میں جن افعال نے حصۂ غالب لیا ہے، وہ اعمال نفس کشی و ایثار نہیں، بلکہ وہ اعمال ہوئے ہیں، جن کی محرک خود غرضی یا ذاتی نام و نمود کی خواہش تھی۔ ارتقاء اقوام ترقی و تمدن، و نشو و تہذیب، جن افراد کی کوششوں کا شرمندۂ احسان ہے، وہ وہی لوگ ہوئے ہیں، جن کا محور اعمال اغراض ذاتی تھے، اور اس سے اجتماعی فوائد جو کچھ پہنچے، وہ محض ضمناً و تبعاً پیدا ہو گئے۔ اس کو ایک موٹی مثال کی مدد سے یوں سمجھنا چاہیے، کہ فیاضی و سخاوت کا اخلاقی حیثیت سے محمود ہونا، اور بخل کا مذموم ہونا مسلم ہے، لیکن واقعہ یہ ہے، کہ عام اجتماعی ثروت و دولت کے حق میں، یہ جذبۂ بخل، جو دولت کو یکجا رکھنے کا ضامن ہے، بہ نسبت جذبۂ

سخاوت کے، جو دولت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ ان شواہد کو دیکھ کر ایک فاضل مورخ نے تو بڑے وثوق سے یہ رائے قائم کی کہ ایجادات کے حق میں عقلی نشوونما (یا ارتقاءِ ذہنی)، بہ مقابلہ ارتقاءِ اخلاقی کے مفید تر ہے۔ بالعموم اس سے کون انکار کر سکتا ہے، کہ اخلاقی ترقی عقلی ترقی سے ممتاز، اور اس سے ارفع و اعلیٰ ہے؟ اس موقع پر بعض ناظرین شاید یہ کہہ اٹھیں، کہ محاسن عقلی و اخلاقی کی بناء امتیاز محرک کی نوعیت ہی ہے لیکن افادیت کی بوالعجبی اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، کہ نوعیت محرک کا فعل کے اخلاقی وغیر اخلاقی ہونے پر کچھ بھی اثر پڑتا ہے۔ بہ قول بنتھم کے، محرک اعمال تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، یعنی وہی فاعل کی ذاتی لذت کی خواہش۔ پس جب محرکات میں تنوع و اختلاف کیلئے کی گنجائش ہی نہیں، اور جملہ محرکات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں، تو ان کی بناء پر کسی فعل کو کسی دوسرے فعل پر، کسی محاسن اخلاق کو کسی رذائل اخلاق پر، ترجیح و فضیلت دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس لحاظ سے تو تمام اعمال مساوی الرتبہ ہوتے ہیں، غرض یہ کہ ہم خواہ کوئی سا معیار بھی قائم کریں، اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا، کہ کردار انسانی کے اخلاقی پہلو کو اس کے دوسرے پہلوؤں پر فضیلت کیوں ہے؟ اگر معیار اخلاق، اعمال کی منفعت رسانی و لذت بخشی کو قرار دیجئے، تو ایسے اعمال کو محاسن اخلاق میں رکھنا ہوگا جن کی جانب کسی کا شان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر معیار نیت و محرک اعمال کو فرض کیجئے، تو پھر دانشمندی و نیک کرداری میں کوئی حد فاصل نہیں رہنے پاتی۔ اور اگر پھر اعمال کی غرض و مدعا ہی کو معیار حسن و قبح فرض کر لیجیے، تو اس صورت میں یہ تو صاف ظاہر ہے کہ دیانت داری و عفت مآبی سے نوع انسانی کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچ گیا ہو۔ خواہ ان سے اس کی راحت میں کتنا ہی اضافہ ہوا ہو۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے، کہ ان خصائص کو اختیار کرنے سے انسان کی غرض و مدعا اپنے ابنائے جنس کو نفع رسانی یا لذت بخشی ہوتا ہے؟

افادئین، اپنی تائید میں ضمیرئین کے مقابلہ میں بطور حجت الزامی کے یہ دعویٰ بھی پیش

کرتے ہیں، کہ "تم لوگ خود اپنے مسلمات پر قائم نہیں رہتے ہو۔ یعنی جب کسی فعل کو محمود و مستحسن ثابت کرنا چاہتے ہو، تو خواہ مخواہ یہ بھی کہنے لگتے ہو کہ اس فعل کو اختیار کرنے سے فلاں فلاں انسانی فوائد و اسباب راحت میں اضافہ ہوگا، حالانکہ نیک کرداری کے اس طرح پر علل و اسباب بتانا، صریحاً تمہارے اصول کے منافی ہے"۔ اسی کے ساتھ ضمیرئین سے یہ بھی ادعا وتحدی کے لہجہ میں کہا جاتا ہے، کہ "جو نیکیاں سب کے نزدیک مسلم و متعارف ہیں، اُن میں سے کون ایسی ہے، جس سے انسان کی راحت و مسرت میں اضافہ نہیں ہوتا"، یہ اعتراض دو مختلف اعتراضات پر مشتمل ہے، اور ہم بھی اس کے دو علیحدہ جوابات دیتے ہیں:۔

اولاً یہ کہ فیاضی، سخاوت، و دیگر نفع رسان اعمال کے نیک و محمود ہونے سے ضمیرئین انکار کب کرتے ہیں؟ وہ تو اسے برابر تسلیم کرتے ہیں، ہاں اس کے ساتھ اتنا اضافہ کردیتے ہیں، کہ یہ اعمال اپنی نفع رسانی کی بنا پر محمود نہیں، بلکہ اس لیے محمود ہیں، کہ ہمارا ضمیر ان کے محمود و مستحسن ہونے کا فتویٰ دیتا ہے۔ پس اس لحاظ سے ضمیرئین کو بھی افادئین کے مساوی ہی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اعمال حسنہ کی نفع رسانی کو ان کے استحسان کی تائید میں پیش کریں۔ البتہ وہ اس کے قائل نہیں، کہ کسی فعل کو محمود قرار دینے کا معیار وحید اس کی نفع رسانی ہی ہے، اور جو اعمال نفع رسان نہیں، وہ محمود بھی نہیں، کیونکہ جہاں عام افراد کے ہمزبان ہوکر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں، کہ سخاوت صرف اس بنا پر محمود ہے کہ اس سے دنیا کو نفع پہنچتا ہے، وہاں اُن کے ساتھ وہ اس عقیدہ میں بھی متحد ہیں، کہ راستبازی و عفت شعاری کا مدار اُن کی نفع رسانی و راحت افزائی پر نہیں، بلکہ براہ راست و بلا واسطہ اُن کی ذاتی محمودیت پر ہے۔

ثانیاً یہ کہ ہر مسلمہ نیکی کے نتائج نفع بخش کا صحیح اندازہ کرنا تو خود معترضین کے لیے بھی آسان نہیں۔ کیونکہ جو اعمال حسنہ متعارف ہیں، اُن کے نتائج اس قدر مجہول و مخفی ہوتے ہیں، کہ افادئین تک، باایں ادعائے پیمائش نتائج و اندازۂ اثرات، ان کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ پھر افادئین نے اندازۂ نتائج کا جو پیمانہ مقرر کیا ہے، وہ خود کہاں تک قابل قبول ہے؟

وہ کہتے ہین، ہر شی کا اندازہ، اس کی پیدا کردہ مسرت افزائیون سے کرنا چاہیے، لیکن کیا مسرت، و راحت، سے زیادہ اضافی، اور زیادہ تغیر پزیر کسی لفظ کا مفہوم ہو سکتا ہی؟ کیا دو قومین، نہین، دو افراد، مسرت کی تعریف پر کبھی متفق ہو سکے ہین؟ اور جب دو شخص مسرت کی کسی جامع و مانع تعریف، یا مسلم تشریح پر متفق نہین ہو سکتے، تو یہ کیونکر ممکن ہی کہ ماضی و مستقبل مین نوع انسانی کی حقیقی و خیالی مسرت کی مقدار ٹھہرا کر اُس کے مطابق ہر فرد بشر کے ایک ایک کام کی نیکی یا بدی پر حکم لگایا جا سکے؟

یہ بے شبہ بالکل صحیح ہی کہ عموماً اعمال حسنہ سے اگر فاعل کی مسرت مین نہین، تو کم از کم دنیا کی راحت مین تو ضرور اضافہ ہوتا ہی، لیکن جیسا کہ پیشتر بار بار کہا جا چکا ہی، اس اعتراف سے یہ کہان لازم آتا ہی، کہ افادئیت و نیک کرداری، مرادف، یا لازم و ملزوم ہین؟ حالانکہ افادئین یہی اعتقاد رکھتے ہین۔ اچھا اسے بھی چھوڑیے، اور آگے بڑھ کر اعمال کا، اُن کے نتائج کی بنا پر اندازہ کرنے کی کوشش کیجیے، تو اور بھی عجیب و غریب تماشا نظر آئے گا۔ ظاہر ہی کہ اصول افادہ کے مطابق، اگر اعمال حسنہ کی کوئی ترتیب مدارج قائم کرنا ہی، تو سب سے اونچے درجہ مین اُن اعمال کو رکھنا پڑے گا، جو سب سے زیادہ مفید ہین، اُس کے بعد اُن سے کمتر مفید۔ اس کے بعد اُن سے بھی غیر مفید تر، تا آنکہ سب سے نیچے اُن افعال کا نمبر آئے گا جو بالکل غیر نفع رسان ہین۔ اور یہ فہرست ایسی جامع و مکمل ہوگی، جو چھوٹے سے بڑے تک ہر طرح کے اعمال پر حاوی ہوگی لیکن اگر یہ اصول صحیح ہی، تو جانتے ہو کہ اس پر عملدرآمد کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہ ہوگا کہ بہ لحاظ نقصانات نتائج کے خفیف تلون مزاجی یا زود رنجی وغیرہ نہایت معمولی کمزوریون کو شہوت پرستی کے اُن شدید ترین جرائم کے ہم پلہ رکھنا ہوگا، جن کا نام لینا ہی معیوب ہی۔ اسی طرح ایک منکسر مزاج گوشہ نشین و متواضع شخص کو جو ہر طرح کے شور و شغب سے علیحدہ رہتا ہی، اور اس لیے لامحالہ اس کی نفع رسانی کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہی، اُس مغرور و فخار شخص کے ماتحت رکھنا ہوگا، جو اپنی قوت کے بل پر ہر ایک سے اُلجھتا،

اور اپنے جوش تکبر مین سب کو روندتا جاتا ہی، کیونکہ عموماً کام یہی آخرالذکر زیادہ کرتا ہی۔ یا پھر مثلاً اس اصول کی مطابقت مین جذبۂ انتقام کو منت پزیری واحسانمندی پر فضیلت دینا ہوگی، کیونکہ یہی جذبۂ انتقام پرستی، صدیون تک شیرازۂ قومی کی جمعیت کا ضامن رہا ہی، اور آج بھی ارتکاب جرائم کے انسداد مین سب سے بڑی قوت ہی۔ ابھی اس سررشتۂ اصول کو ہاتھ سے نہ چھوڑیے، اور آگے بڑھیے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا، کہ تماشاگاہ عالم مین جس وقت شورش انگیز وانقلاب خیز مناظر کا پارٹ ہوتا ہی، اُس وقت بہ نسبت اُس شخص کے جو جادۂ دیانت سے اپنے قدم کو منحرف نہین ہونے دیتا، اور بغایت اعتدال، احتیاط، خداترسی، ونیک نفسی سے پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا ہی، وہ چالاک مدبر یقیناً نیک کرداری وحسن اخلاقی کے زیادہ قریب ہی، جو اپنے حصول مقصد کے لیے دیانت وبددیانتی مین کوئی امتیاز نہین کرتا، اور جسے اپنی دُھن مین ملامت ضمیر وپاس صداقت کی کچھ پروا نہین ہوتی، کیونکہ ظاہر ہی کہ نازک مواقع پر عمل کے لیے مفید یہی آخرالذکر ہوتا ہی۔ یہ سچ ہی، کہ ابھی تک اس طرح کی موقت کامیابیون کی بنا پر، جن مین دنارت کو شرافت کے مقابلہ مین، اور پست خیالی کو عالی ظرفی کے مقابلہ مین فتح حاصل ہوتی ہی، افادئین تک نے شرافت وعالی ظرفی کو مذموم نہین قرار دیا ہی، لیکن اگر افادیت کے اصول صحیح ہین، تو کیا عجب ہی کہ آگے چل کر دُنیا کو اپنی راے واپس لینا پڑے۔

ان صفحات کے مطالعہ سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا، کہ نظریۂ افادیت پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہین:۔

(۱) یہ اصول اس لحاظ سے غیر صحیح معلوم ہوتا ہی، کہ تمام زبانین، اور ہر ملک وقوم کے جذبات انسانی اس کے مخالف ہین۔

(۲) ایک عیب اس مین یہ ہی، کہ اگر نیکی کی پیروی طمع استلذاذ مین کی جائے، تو آخر مین کوئی لذت ملتی ہی نہین۔

(۳) اخلاقی لذائذ و منافع، عام دنیوی لذائذ و منافع سے بداہتہً مختلف و ممتاز ہین، لیکن افادیت کو تسلیم کر لینے سے یہ تفریق و امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔

(۴) محاسن اخلاق کے نفع رسان ہونیکا کسی فریق، حتٰی کہ ضمیریین کو بھی انکار نہین اسلیے افادیین جو حجت الزامی پیش کرتے ہین وہ صحیح نہین۔

(۵) آخری اعتراض یہ ہے کہ نیکی و بدی کے مدارج، مدارج افادہ و ضرر کے متناسب نہین تشریح ان اعتراضات کی، اوپر گزر چکی۔

فصل (۴)

افادیت پر عملدرآمد کے نتائج

اب فرض کیجیے کہ کسی شخص نے اعتراضات بالا سے غیر متاثر رہ کر یہ ٹھان لی ہے کہ اپنی حیات عملی مین وہ افادیت ہی کو مشعل راہ بنائے گا۔ یہ بھی فرض کر لیجیے، کہ ادائے فرض اور اغراض ذاتی کے درمیان جو تناقض ہے، اُس کی طرف سے بھی اُس نے چشم پوشی کر لی ہے۔ پھر دیکھیے، کہ جادۂ افادیت پر چلنے سے کیا کیا مناظر نگاہ سے گزرتے ہین۔ اُسے یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ کردار انسانی کا محرک، بجز فاعل کی لذت و مسرت کے کسی اور شے کو قرار دینا، ایک شدید غلطی و غلط فہمی کا مرتکب ہونا ہے، نیز یہ کہ معیار اخلاق، تمام و کمال افعال کی حیثیت افادی ہی ہے، ورنہ فی نفسہ کوئی شے نہ مذموم و قبیح ہے اور نہ محمود و مستحسن، اب اس کے بعد، جو سوال اس کے ذہن مین غالباً سب سے پہلے پیدا ہوگا، وہ یہ ہوگا، کہ قتل، چوری، بددیانتی وغیرہ ذمائم خلاق، بعض خاص حالات مین تو نہایت مفید ثابت ہوتے ہین، پس کیون نہ ان مخصوص حالات مین ان کا ارتکاب کیا جائے؟ افادیت کی زبان سے غالباً اس کا یہ جواب ملے کہ ان افعال کو کسی حالت مین بھی مفید سمجھنا غلطی ہے، کیونکہ افعال کے حسن و استحسان کا اندازہ

کرتے ہوئے ہمین اُن کے نتائج بعیدہ اور اُن کے اُن اثرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو واسطہ در واسطہ اُن سے مترتب ہوتے ہون اور اس واسطے کسی عام مضرت رسان فعل کو بعض حالات مین مفید سمجھ لینا آسان نہین، اور پھر تحفظ جان و مال و پاس صداقت بالعموم منافع دنیوی کے لیے اس قدر ضروری ثابت ہو چکے ہین، کہ ان کے احترام کو قطعیت و عدم استثنار کے ساتھ ہی فرض کر دینا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن یہ جواب، خود افادیت کے نقطۂ خیال سے، چندان مسکّن نہین۔ کیونکہ اس کا کیا ثبوت مل سکتا ہے، کہ جس حد تک کسی خاص جرم، مثلاً قتل، سرقہ، بد دیانتی سے بعض استثنائی حالات مین مسرت افزائی ہوگی، وہ مقدار مین اُس مضرت و اذیت سے قلیل ہے جو تحفظ جان و مال و پاس صداقت کی احترام شکنی سے پیدا ہوگی، اور جب تک اس کا کوئی قطعی ثبوت نہین ملتا، ہر شخص یہ ماننے پر بالکل حق بجانب ہے، کہ بعض مخصوص حالات مین ارتکاب جرائم سے جو مسرت و منفعت ہوتی ہے، اُسکی بنا پر اُن کا ارتکاب بالکل بجا و جائز ہے۔

پھر اگر کوئی شخص ان اعمال مجرمانہ کا ارتکاب، بپردۂ خفا مین کرنا چاہتا ہے، تب افادیت کیا کہ کر اس کا دامن پکڑ سکتی ہے؟ ایک معمولی و غیر معروف شخص اگر اس طرح کے اعمال علانیہ انجام دے، تب بھی ان کا اثر چندان متعدی نہین ہو سکتا، لیکن اگر وہ انھین اخفاء کے اہتمام بلیغ کے ساتھ انجام دے رہا ہے، تو تو اس پر اور بھی کوئی آنچ نہین آسکتی، اس صورت مین اس کا بھی احتمال نہین کہ دوسرے اس کی تقلید کرنا شروع کر دین گے۔ کہ سکتے ہو کہ جرائم مخفی کی اباحت کا فتوی دیدینا، صریحاً اُن جرائم کو پھیلا دینا ہے، لیکن یہ کہتا ہی کون ہے، کہ آپ علی الاعلان اس طرح کا کوئی فتوی بھی دیجیے، پبلک مین تو ہم بھی آپ کے ساتھ یہ آواز بلند کہنے کو آمادہ ہین، کہ ہرگز یہ اعمال جائز نہین، البتہ ہم صرف یہ چاہتے ہین، کہ عملی زندگی مین ہم بغایت اہتمام اخفاء کبھی کبھی اس طرح پر ان لذائذ سے بہرہ اندوز ہو لیا کرین، کہ کسی کو کانون کان خبر نہ ہو، اور اسلیے اُن کے سریان و عدوی کا احتمال ہی نہین، پس اس

قبیل کے جرائم جس قدر زیادہ سعی اخفاء کے ساتھ انجام دیے جائین گے، اور جس قدر اُن کے راز رہنے کا یقین زیادہ قوی ہوتا جائے گا، اُسی قدر اُن کی "جرمیت"، اُن کی "معصومیت" مین اور اُن کی قباحت، اُن کی اباحت مین مبدل ہوتی جائے گی، ہان ایک بات البتہ کسی قدر لگتی ہوئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان جرائم مخفی کے ارتکاب سے خود فاعل کی سیرت متاثر ہوتی ہے، یعنی اُس کی عادت پڑجاتی ہے، جس کی بنا پر ممکن ہے کہ وہ بے دھڑک ان افعال کا علانیہ مرتکب ہونے لگے۔ لیکن یہ جواب بھی پوری طرح تشفی بخش نہین۔ کیونکہ اولاً تو کسی جرم کے صرف ایک دو مرتبہ کے ارتکاب سے انسان اُس کا خوگرفتہ نہین ہوسکتا، خصوصاً ایسی حالت مین تو اُسے اور بھی معصیت خصال نہین کہا جاسکتا، جبکہ وہ اُن افعال کو جرائم سمجھ کر نہین بلکہ بالکل مستحسن سمجھ کر کر رہا ہے؛ ثانیاً یہ کہ اگر عادت پڑے گی بھی، تو کس چیز کی؟ صرف اس کی کہ نتائج افعال کا نہایت دقت نظر و باریک بینی کے ساتھ اندازہ کرکے اُنھین غایت احتیاط و اہتمام اخفاء کے ساتھ حصول مسرت کے لیے انجام دینا چاہیے، جو افادی نقطۂ خیال سے، غایت اعمال انسانی ہے۔ پس اس صورت کو بھی معیوب نہین کہا جاسکتا۔

اسے بھی جانے دیجیے۔ اب فرض کیجیے، کہ جو شخص جادۂ افادیت پر منازل حیات طے کرنا چاہتا ہے، وہ بجائے عام مادی مشاغل کے تخئیلی دنیا مین زیادہ رہتا ہے، اور اس کا تخیلہ نہایت قوی ہے۔ ایسے شخص کے حظوظ و آلام، لذات و تکالیف بھی بداہۃً زیادہ تر تخئیلی ہون گے، وہ اکثر تصور و تخیل مین غرق رہتا ہوگا، اور اسی عالم خیال مین طرح طرح کے معاصی و جرائم کا مرتکب ہوتا ہوگا۔ اب عام انسانی حسن اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہے، کہ ہم کو نہ صرف معصیت سے، بلکہ خیال معصیت سے بھی، نہ صرف بُرے اعمال سے بلکہ بُرے خیالات سے بھی بچنا چاہیے، لیکن افادیت کے نقطۂ خیال سے دیکھیے، تو صورت حال بالکل برعکس نظر آئے گی، وہان تو یہ ارشاد ہوتا ہے، کہ صرف وہ اعمال، معاصی ہین، جن سے مسرت مین کمی ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ افکار و تصورات کو اعمال نہین قرار دے سکتے۔ پس افکار و تصورات خواہ کتنے ہی گندہ

وناپاک ہون، خواہ عام رائے مین کتنے ہی مخرب اخلاق ہون، لیکن تاوقتیکہ اُن سے کوئی عملی نقصانات منتج نہین ہوتے، اور اُن سے صرف خیال کرنے والے کی طبیعت محظوظ ہو رہی ہے، اُن پر اعتراض کیے جانے کا کوئی حق نہین۔

اور آگے قدم بڑھائیے، تو افادئین کو اپنے نظریۂ نتائج بعیدہ مین بھی ترمیم کرنا پڑے گی جس پر وہ خاص زور دیا کرتے تھے۔ وہ کہتے یہ ہین، کہ قتل انسانی، جن مخصوص صورتون مین بظاہر مفید معلوم ہوتا ہے، اُن مین بھی اس لیے مذموم ہے، کہ اُس سے حیات انسانی کے عام تقدس وعظمت واحترام مین فرق آتا ہے۔ لیکن تجربہ کی شہادت اس کے بالکل برعکس ہے تجربہ یہ شہادت دیتا ہے، کہ حیات انسانی کے ایک خاص حصہ کی عظمت واحترام سے بغیر دوسرے حصون پر اثر ڈالے، بے تعلقی بالکل ممکن ہے۔ اس کی مثالین تاریخ مین کثرت سے ملتی ہین۔ قدماے یونان مین یہ دستور جاری تھا کہ مفلس والدین کی اولاد بہ کمال بیدردی، علانیہ ہلاک کردی جاتی تھی، لیکن یہ بیدردی عام حیات انسانی تک کبھی متعدی نہین ہوئی، اور بالغ اشخاص کی زندگی کا شرف واحترام برابر لوگون کے دلون مین قائم رہا۔ آج اپنے گرد وپیش مذہبی کذب بیانیون کو دیکھو۔ اہلِ مذہب، اپنے دینی مقاصد کے لیے قصداً اغلاط بیانیون سے کام لیتے ہین، لیکن اس کا یہ اثر کبھی نہین پڑتا کہ وہ عام دنیوی کاروبار مین بھی دروغ گوئی سے کام لینا شروع کردین، بلکہ اکثر عقلی واعتقادی بددیانتی عملی وکاروباری زندگی مین انتہائی دیانتداری کے ساتھ مجتمع دیکھی گئی ہے۔ ایک اور مثال ظلم وناخدا ترسی کی ہے۔ متواتر مشاہدہ مین آیا ہے، کہ جو لوگ حیوانات پر سخت ظلم وبیرحمی کرتے ہین، وہ اپنے ابناے جنس کے حق مین آیۂ رحمت ثابت ہوئے ہین۔ غرض یہ کہ نظریۂ نتائج بعیدہ کی بنیاد، جس پر افادئین اتنا زور دیتے ہین، خود ہی سخت متزلزل ہے۔

بات مین بات نکلتی ہے۔ ظلم حیوانات کو ابھی ہم نے مثال مین پیش کیا، اس سے ہمارا ذہن، افادئیت کے ایک اور پہلو پر منتقل ہوا، اور وہ یہ کہ حیوانات کے ساتھ ادائے فرض کا

احساس، صرف ضمیریت کی بنا پر پیدا ہو سکتا ہے۔ ہمارے حالات گوناگون و مؤثرات ماحول
کا اقتضا یہ ہے، کہ ہمین اُن تمام ہستیون سے جن سے ہمارا کچھ بھی واسطہ ہے، لگاؤ اور الفت
ہو، لیکن اس الفت کے مدارج، مدارج تعلقات کے متناسب ہوتے ہین، یعنی جس سے جتنا
زیادہ قریبی تعلق ہوتا ہے، اتنی ہی الفت ہوتی ہے، مثلاً بہ نسبت اغیار کے، اعزہ و اہل خاندان
سے اور بہ نسبت غیر ملکیون کے اپنے ہموطنون سے زیادہ محبت و الفت ہوتی ہے۔ اسی قانون
کی مطابقت مین ہم یہ بھی پاتے ہین، کہ اپنے ابناے جنس کے ساتھ رحم و ہمدردی سے
پیش آنے کا جذبہ، حیوانات کے ساتھ رحم و ہمدردی کرنے سے بہت زیادہ قوی ہے۔ چنانچہ مردم خوار
کو، جو اپنے ابناے جنس کو محض اُس کی کھال کی طمع مین یا اور کسی نہایت خفیف محرک پر،
مار کر کھا جاتا ہے، ہم مین سے ہر شخص نفرت و بیزاری کی نظر سے دیکھتا ہے، حالانکہ یہ بالکل ممکن
ہے کہ جو شخص حیوانات کو بلا وجہ مار کر کھا جاتا ہو، اس کو لوگ انسانیت و خدا ترسی کا بہت بڑا
حصہ دار سمجھتے ہون۔ مگر اٹھاروین صدی کے آخر مین جبکہ انگلستان مین ہمدردی حیوانات
کی تائید مین ایک پُر زور اگیٹیشن (جوش عام) پیدا ہوا، تو افادئین، جن کا مذہب ابھی بالکل
نو ایجاد تھا، بڑے ذوق شوق سے اس تحریک مین شریک ہو گئے، اور اس کی اشاعت
مین بڑھ بڑھ کے حصہ لینے لگے۔ لیکن یہ ظاہر تھا، کہ ایسا نظریہ، جو نیک کرداری کو انسانی
راحت افزائی کا مرادف قرار دیتا ہے، ہمدردی حیوانات کو کیونکر اپنے مقاصد مین داخل کر سکتا تھا؟
پس اس اعتراض سے بچنے کے لیے، متاخرین نے اپنے نظریہ مین یہ ترمیم کر لی، کہ نیک کرداری
عبارت ہے اُن افعال سے، جو دنیا کی مجموعی راحت مین اضافہ کرتے ہین، عام اس سے کہ وہ
راحت انسان کی ہو، یا حیوانات کی گویا اس لحاظ سے حیوانات کے ساتھ حسن سلوک اُسی قدر
ضروری ٹھہرتا ہے، جتنا خود اپنے ابناے جنس کے ساتھ، اور حیوانات کی ایذا دہی صرف
اس حالت مین جائز ہو سکتی ہے جبکہ اُس کی بہ نسبت، انسانی راحت افزائی کا پلہ بھاری ہو
اس نظریہ کے متعلق پہلا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود افادئیت کے نقطۂ خیال سے

اس کی یہ ترمیم شدہ صورت کہاں تک جائز ہے؟ فیاضی و ہمدردی کی بنا تو جیسا کہ صفحات گزشتہ میں معلوم ہو چکا ہے، بقول اس طبقہ مصنفین کے خود غرضی یا ذاتی منفعت سے پڑتی ہے، اول اول ہم اسی خیال سے اپنے ابنائے جنس کے ساتھ نیکی کرتے ہیں، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کے ایسے خوگرفتہ ہو جاتے ہیں، کہ کوئی خود غرضانہ تصور ذہن میں لائے بغیر ہمدردی وفیاضی برتتے رہتے ہیں، لیکن یہ اصول صرف انسانی ہمدردی تک محدود ہے، بے بس حیوانات کے ساتھ، جو ہمارے مظالم کا جواب تک نہیں دے سکتے، حسن سلوک کے لیے نیک کرداری کا یہ طریق تکوین صحیح نہیں ہو سکتا، ممکن ہے، کہ افادئین، قانون ائتلاف افکار سے ایک بار پھر فائدہ اٹھائیں، اور کہیں، کہ اس کے مطابق، فیاضی و ہمدردی کی ایک مرتبہ جو خو قائم ہو گئی، وہی حیوانات تک پہ پھیل جاتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ جواب بھی صحیح نہیں، اور محض قانون ائتلاف کی بنا پر، حیوان و انسان دونوں کے حسن وسلوک کو ایک درجہ پر رکھنا مجھے تو ایک مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کم از کم میری سمجھ سے تو یہ باہر ہے کہ کوئی ایسا زمانہ بھی آسکتا ہے جبکہ لوگ غذا یا پوستین وغیرہ کی طمع میں ذبح حیوانات سے پیشتر اس کا حساب کتاب کیا کریں گے، کہ ایسا کرنے سے انھیں جو مقدار راحت حاصل ہو گی، اس کی میزان اس مقدار اذیت سے زیادہ ہے جو حیوانات کو ہو گی۔ اور اگر بہ فرض محال، کوئی شخص واقعی ایسا ہے، جو اس طرح کا حساب کتاب کرنے کے بعد بھی بلا تکلف ذبح حیوانات کا مرتکب ہوتا ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس عجیب وغریب کلیہ کے نتائج اسے کس حد تک پہونچا ئینگے ہاں اتنا البتہ کہہ سکتا ہوں، کہ یہ نظریہ تو اس قابل ہے کہ جس وقت سوئفٹ[1] اپنے ایک مضمون کے ذریعہ سے دنیا کو تعلیم دے رہا تھا کہ فاقہ کش والدین کی زائد اولاد کو ہمیں اسی طرح جزو غذا بنا لینا چاہیئے، جس طرح بھیڑ بکری ہیں، اگر اس وقت آپنے اس نظریہ کی خبر ہو جاتی، تو یقیناً اس کا مضمون زیادہ مدلل وقوی ہو جاتا۔

[1] جوناتھن سوئفٹ (۱۶۶۷ء تا ۱۷۴۵ء) مشہور ادیب و انشاپرداز۔

خلاصہ یہ کہ افادیت کے اصول پر اگر پوری طرح عملدرآمد کیا جائے، تو ہمارے اخلاقی تصورات مین ایک عجیب انقلاب ہوجائے گا، بُرا، اچھا ہو جائے گا، اچھائی بُرائی بن جائیگی اور نیک و بد کے جن امتیازات کو ہم اب تک تسلیم کرتے چلے آئے ہین، اُن مین ایک حیرت انگیز برہمی وابتری پیدا ہو جائے گی۔ اگر اس مین اب بھی کسی کو شک وشبہ ہو، تو ہم ایک آدھ مثال کے ذریعہ سے اس کی مزید تصریح کیے دیتے ہین۔

سب سے پہلے ہم عفت وعصمت کی مثال پیش کرتے ہین، مجھے آیندہ اس کے متعلق بادل ناخواستہ بہت کچھ کہنا پڑے گا مگر اس موقع پر ناظرین سے صرف اس قدر کہنا ہی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے افادی بن کر، یعنی فرض کرکے کہ یہ جوہر شرافت، فی نفسہ ایک لغو شی ہی، بلکہ اس مین جو کچھ خوبی ہی وہ محض اس بنا پر ہی کہ اس سے نتائج بہت مسرت افزا پیدا ہوتے ہین، کسی ایسے ملک کا تصور کرین، جس مین شہوت پرستی اپنے منتہاے شباب پر ہو، مثلاً قدیم ایتھنز (اشینیا) کا، اور پھر اپنے ذہن سے یہ استفتا کرین، کہ کیا ایسے ملک و زمانہ مین لوگون کو قطعی طور پر یہ خیال گزر سکتا ہی، کہ عیاشی، نفس پرستی وشہوت رانی کی زندگی، لازماً، زہد واتقا، عفت وعصمت، پاکبازی وپاکدامنی کی زندگی سے زیادہ پُر لطف و پُر مسرت ہی؟ اور اگر نہین، تو پھر عفت شعاری کو قائم رکھنے کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہی؟

دوسری مثال عقلی واعتقادی دیانتداری کی ہی۔ ضعیف الاعتقادی و وہم پرستی کی تردید مین آج تک افادئین سے زیادہ کسی نے حصہ نہین لیا، لیکن کیا انھین اپنے اصول کی بنا پر بھی، اس کا حق حاصل تھا؟ کیا اپنے افادیت کے نقطۂ خیال سے وہ اس کے مجاز ہین، کہ ضعیف الاعتقادیون و وہم پرستیون کو یکسر مٹادین؟ غالباً نہین۔ بے شبہ بعض توہمات ایسے بھی ہوتے ہین، جن سے انسان کے آلام وتکالیف ہی مین اضافہ ہوا ہی لیکن انکی کتنی بڑی تعداد ایسی ہی، جو دنیا کے لیے سراسر مفید ومنفعت بخش ثابت ہوئے ہین! جو شی ہماری امید کو تازہ رکھتی، جو شی خوف وخطر کی حالت مین سپر کا کام دیتی ہی، جو شی ہمارے

اندرونی جذبات کو تسکین دیتی ہے، وہ یہی توہمات ہوتے ہین۔ استدلال، نکتہ چینی واحتمال آفرینی مین مصروف رہتا ہے، سکون قلب وہم پرستی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ عقل تنقید و تنقیح ہی مین لگی رہتی ہے، مگر جن چیزون سے روح کو بالیدگی حاصل ہوئی ہے، وہ متخیلہ ہی کی پیداوار ہوتی ہین۔ یہانتک کہ اکثر حالتون مین یہ وہم پرستیان، ہماری ذاتی مسرت وراحت کا ایسا جزو غیر منفک ہوجاتی ہین، کہ اُن کے بغیر، ہمین چین ہی نہین آسکتا۔ خود خیال کرو، کہ میدان جنگ مین تعویذ کی، نزع کی حالت مین دعا کی، اور اور کسی سخت مصیبت کے وقت عمل و وظیفہ کی قائم مقامی، کیا دنیا کا بہتر سے بہتر فلسفہ یا اعلیٰ سے اعلیٰ استدلال کرسکتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ قلب انسانی ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کا سہارا ڈھونڈھا رہتا ہے، اور اس کو اصلی مسرت جب ہی حاصل ہوتی ہے، جب اُسے کسی شی کی تقویت حاصل ہوجاتی ہے۔ جس شخص کا لخت جگر ابھی اس کی نظر کے سامنے دم توڑ چکا ہو، جس شخص پر سکرات موت طاری ہو، جس مریض کی صحت سے معالجین مایوس ہوگئے ہون، جو شخص ہجوم اعدا مین محصور ہو، غرض ہر ایسے شخص کو جو جبلتہً کسی مضبوط سہارے کا محتاج ہو رہا ہو، جس شی سے تسکین وتشفی حاصل ہوسکتی ہے، وہ وہی ہوتی ہے، جو عقلی حیثیت سے مہمل، اور استدلالی حیثیت سے بےمعنی ہوتی ہے۔ اب ایسے موقع پر افادیت کا اقتضا تو یہی ہونا چاہیے، کہ غیر صحیح، غیر واقع، غیر مستدل، معتقدات کی محض ان کی راحت رسانی ومسرت افزائی کی بنا پر خوب اشاعت وترویج کرنی چاہیے۔

رہا یہ عذر کہ "اصلی منفعت عقلی زندگی کی ترقی واصلاح مین ہے، کہ جب زندگی کا عقلی پہلو درست ومہذب ہوجائے گا، تو معتقدات مسرت افزا خود بخود قائم رہین گے، اور معتقدات الم انگیز مٹ جائین گے" تو تجربہ اس عذر کی بھی تائید نہین کرتا۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلی زندگی مین تغیر ہوجانے کے بعد بھی ذہن کو قدیم وہم پرستیون سے چھٹکارا نہین ملتا، بلکہ جب انسان زبردستی اُنھین اپنے سے علیحدہ کرتا ہے، تو اُسے سخت اذیت محسوس ہوتی ہے، بانی مذہب پروٹسٹنٹ لوتھر کی بیوی کا یہ قصہ مشہور ہے کہ اپنا قدیم مذہب چھوڑنے کے بعد اس نے نہایت حسرت وافسوس سے

کہا، کہ " اپنے سابق مذہب میں ہم کس گرمجوشی اور خضوع و خشوع کے ساتھ مصروف عبادت رہتے تھے، برخلاف اس کے اب اگر کبھی عبادت کرتے بھی ہیں، تو قلوب باردہ کے ساتھ " ؟ - اسی طرح ایک قدیم راہب کی بابت مذکور ہے، کہ جب وہ بت پرستی چھوڑ کر پہلی بار، جدید مسیحی عبادت کرنے لگا، تو بے اختیار رو پڑا اور کہنے لگا " افسوس لوگوں نے میرے خدا کو مجھ سے جدا کر دیا "، ان واقعات کا ذکر، دیگر مورخین فلسفہ کی طرح، بلا شبہ مجھے بھی ناگوار ہے، لیکن یہاں ان کے ذکر سے مجھے صرف یہ دکھانا مقصود ہے، کہ کم از کم بعض حالات میں کذب و غلط بیانیوں کی اشاعت بہت بڑی نفع رسانی و راحت افزائی کا سبب بن سکتی ہے - اور اگر کوئی شے ان کا انسداد کر سکتی ہے، تو صرف یہ یقین ہے، کہ حقیقت و صداقت راحت و مسرت کے خیال سے بالکل مستغنی ہے - یعنی کوئی حقیقت اس بنا پر باطل نہیں ہو سکتی کہ اُس کے ماننے سے طبیعت کو رنج ہوگا - ورنہ افادیت تو اپنے بل بوتے پر، کسی ناراستی و کذب کی اشاعت سے نہیں روک سکتی -

فصل (۵)

محرکات افادیت

افادی نقطہ خیال سے نیک کرداری کے جو محرکات ہوتے ہیں، اُن میں سے جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، صرف ایک محرک ایسا ہے، جو میرے نزدیک کافی قوت رکھتا ہے - یہ محرک، محرک مذہبی ہے، کہ نفع اخروی، نفع دنیوی کے مقابلہ میں ہمیشہ زیادہ وزندار رہے گا - لیکن افادئین کی جماعت کثیر اس خیال کی ماننے والی نہیں، وہ صرف دنیوی محرکات سے غرض رکھتی ہے - بس ہم بھی فصل ہذا میں پہلے اسی مذہبی جماعت کے متعلق مختصراً چند کلمات تحریر کر کے پھر افادئین کے مسلک دنیوی کی جانب متوجہ ہوں گے -

(۱) سب سے زیادہ صریح اعتراض، اس رائے پر یہ وارد ہوتا ہے، کہ اگر خدا کی مرضی ہی کو

حسن اخلاق کا معیار وحید قرار دے لیا جائے، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ صفات باری کی خوبی و استحسان کوئی شی ہی نہیں۔ ذات باری کے جانب جب ہم کسی امر حسن کا انتساب کرتے ہیں، تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ وصف فی نفسہ محمود و مستحسن ہے، اور چونکہ وہ وصف ذات باری میں بھی پایا جاتا ہے، اس لیے ذات باری بھی ہماری مدح وستایش کی مستحق ہے، لیکن جب یہ معلوم ہو گیا، کہ کوئی شی فی نفسہ نیک ہی ہی نہیں، بلکہ اُس کی نیکی تمام تر ذات باری مین اُس کے پائے جانے پر منحصر ہے، تو پھر صفات حسنہ ربانی کے کیا معنی رہ جائین گے؟ یہ کس قدر مضحکہ خیز عقیدہ ہے، کہ ایک طرف خدا کو تمام صفات حسنہ کا مجسمہ تسلیم کیا جائے، اور دوسری طرف صفات حسنہ کی یہ تعریف کی جائے، کہ وہ وہی اوصاف ہین، جو ذات باری مین مجتمع ہین!

(۲) ایسا ہی ایک دوسرا صریح اعتراض اس نظریہ پر یہ عاید ہوتا ہے کہ عقبیٰ کے جزا و سزا کا اعتقاد، خود اس خیال پر مبنی ہے کہ افعال کے نتائج مضرت و مفاد اس زندگی مین ٹھیک اس طرح نہین نکلتے، جس طرح ان کو فی الواقع نکلنا چاہیے؛ اور یہ خیال کرنا، گویا یہ صاف اعتراف کرنا ہے، کہ حسن و قبح اعمال بذات خود ایک مستقل شی ہے جو اعمال کی حیثیت افادی و غیر افادی سے بالکل علحدہ و بے واسطہ ہے۔ غور کرو، کہ انسان اگر اپنے ذہن سے یہ خیال دور کر دے، کہ حیات موجودہ مین ناانصافیان کثرت سے موجود ہین، یہ کہ افعال انسانی وہ نتائج ظاہر نہین کرتے جو انھین ظاہر کرنے چاہیین۔ تو پھر آخرت مین ان نقائص کی اصلاح، ان حق تلفیون کی دادرسی کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟!

(۳) تیسرا اعتراض، جو گو اسی قدر بدیہی نہ ہو تاہم جس کی اہمیت مساوی درجہ کی ہے، یہ ہے کہ بلا ایک ضمیر یا حس اخلاقی کی تائید کے، محض مشاہدہ کی بنا پر ذات خالق مین وہ اعلیٰ ترین صفات حسنہ ثابت ہی نہین ہو سکتے جو افادئین مذہبی اپنے نظریہ مین فرض کرتے ہین، یہ کہ دینا بے شبہ بہت ہی آسان ہے کہ خدا کی نعمتون اور فیاضیون کا جلوہ ہر جگہ نظر آ رہا ہے۔ دھوپ کی چمک مین کیڑے کی خوشی، حیوانات مین جبلۃً قوائے تحفظ نفس کی موجودگی، والدین کی مامتا،

بچون کی بے فکری و مسرت، مناظر قدرت کا حُسن، فطرت کی فیاضیان، یہ تمام مظاہر احسانات الٰہی کے ہین۔ لیکن درحقیقت، اس طرح کے دعویٰ کرنے والون نے تصویر کے دوسرے رخ پر بالکل نظر ہی نہین کی۔ عوارض و امراض کا زور شور، ظلم و ستم، شقاوت و سیدردی کی گرم بازاری، مقاومت و مسابقت کا وہ قانون، جسکی بنا پر ہر ذی حیات ہستی ہر دوسری ذی حیات ہستی کی تخریب و ہلاکت کے درپے رہتی ہے، معصوم و بیگناہ افراد کا سخت ترین مصایب مین ابتلا، حوادث ناگہانی کا وجود، کیا یہ سب بھی فطرت کی "فیاضیون" ہی کے مظاہر ہین؟ رہی فطرت کی صداقت و راست بازی، تو کیا تاریخ عالم اس کی شہادت دیتی ہے؟ اس کا جواب وحشی و غیر متمدن افراد کے دلون سے پوچھو۔ آفتاب ایک نہایت معمولی جسامت کا روشن گولہ ہے، آفتاب و ماہتاب آسمان مین چکر کرتے رہتے ہین، آسمان ایک مادی سقف ہے، زمین ایک ساکن و مربع شی ہے، بارش و طوفان، زلزلہ و سیلاب، دیوتاؤن کی ناخوشی سے پیدا ہوتے ہین، بیماریون کی دافع، دوا علاج نہین، بلکہ نذر و نیاز ہے؛ غرض کوئی کہان تک گنائے، فطرت نے ہر ہر قدم پر انسان کو مغالطہ دینا چاہا ہے۔ ہر جگہ فریب، ہر جگہ دھوکا، ہر جگہ ظاہر و باطن مین فرق۔ حالات و مشاہدات تو یہ، اور اس پر فرمایش یہ، کہ فطرت کے صداقت مجسم ہونے پر ایمان لائیے! وہ تو کہیے، انسان نے اپنی جستجو و تحقیق، اپنے علوم و فنون کا مقصد وحید ہی یہ رکھ چھوڑا ہے کہ ان مغالطات کی پردہ دری کرتا رہے، ورنہ بھلا ذات، او کسی ایک صداقت کا اظہار کرتی!

اور آگے چل کر، ذرا لگے ہاتھون یہ بھی دیکھتے جائیے کہ اس ظاہر فریبی نے دنیا کو نقصان کس درجہ عظیم الشان پہونچایا ہے! ہر ملک و ہر زمانہ مین کتنی جانین محض اس لیے ضائع ہوتی رہی ہین، کہ بجائے علاج کے جھاڑ پھونک، ٹونے ٹوٹکے پر اکتفا کیا گیا۔ کتنی جنگون مین محض اس بنا پر شکست ہوئی ہے، کہ بجائے جنگی انتظامات کی درستگی کے، امداد غیبی پر اعتماد بیجا رکھا گیا۔ کتنے خونریز محاربات محض اس واسطے برپا ہوئے، کہ اصول اقتصادیات کی ناواقفیت سے

متخاصمین کو اپنے اپنے حقیقی یا لی منافع سے بے خبر رکھا۔ کس قدر امراض و بائی محض اس باعث پھیلے ہین، کہ قوانین حفظ صحت سے لاعلم رہ کر لوگ توہم پرستیون مین مبتلا رہے ہین۔

ان حالات کے ساتھ، اگر ہم اپنا دلیل راہ صرف تجربہ کو رکھین، تو کیا کبھی بھی......

اس نتیجہ تک پہونچ سکتے ہین، کہ اس عالم کی خالق کوئی نیک نہاد ہستی ہی؟ ظاہر ہی کہ کبھی نہین۔ لیکن با اینہمہ ہم جو ایک خیر کل خالق عالم کے وجود کے قایل ہین، تو کس بنا پر؟ محض اپنی سرشت اخلاقی کے تقاضہ سے مجبور ہو کر۔ یعنی ہماری سرشت اخلاقی کی جو عقل و ذہن سے ایک بالکل مختلف شی ہی، خلقت ہی ایسی واقع ہوئی ہی، کہ ہم خواہ مخواہ ایک محسن مطلق کے وجود کے اعتراف پر مجبور ہوتے ہین۔ عقل ہر چند نظام کائنات مین ابتری دکھاتی ہی۔ ہر چند ہمین خالق کے خیر مجسم ہونے سے منکر بناتی ہی۔ تاہم ایک باطنی حس اخلاقی اِن مادیات کے مشاہدہ سے آسودہ نہ ہو کر ہمین ایک عالم روحانی کی طرف کھینچتا ہی، اور یہی کشش ایک طرف تو ہمین اپنے مین جزو باری کے شمول کا یقین دلاتی ہی، اور دوسری طرف ہم مین یہ توقع پیدا کرتی ہی، کہ اس عالم کے ماوراء ایک اور عالم ہی، جس مین ہر شی کا پورا معاوضہ، جزا و سزا، ہر شخص کو ملے گا۔

یہ عقیدہ، کوئی عقلی و استدلالی مسئلہ نہین، بلکہ تمام تر ایک وجدانی شی ہی، اس کے ماننے والے اس پر کوئی استدلال نہین پیش کر سکتے۔ ہان وہ یہ ضرور کہہ سکتے ہین کہ "اعاظم رجال و مشاہیر کبار کی متفقہ راے پر نظر کرو، دنیوی و مادی لذائذ کی عدم تسکین بخشی کو پیش نظر رکھو، اور پھر یہ بھی دیکھو کہ آج تک دنیا کا کوئی فلسفہ، کوئی نظام تشکیک، اس عقیدہ کو انسان کے دل سے محو نہین کر سکا ہی"۔ یہ سرشت اخلاقی ہمیشہ مادیات کی پستی کو چھوڑ کر، روحانیات کی بلندی کی جانب صعود کرتی ہی، اور گو دنیوی حیثیت سے یہ دیگر عناصر ترکیب بشری کے مقابلہ مین ضعیف ہو، تاہم حقیقۃً یہی سب پر غالب ہوتی ہی۔ چنانچہ ابتک جس قدر مذاہب دنیا پر حکمران رہے ہین، انھون نے اسی سرشت اخلاقی سے کام لیا ہی، جس کا مخاطب قلب،

یعنی ایثار علی النفس ہوتا ہے، نہ کہ دماغ وعقل، جو ہر وقت اپنے ذاتی مفاد کی میزان لگایا کرتے ہیں، درحقیقت یہی جائے اخلاقی مذہب کا جوہر حقیقی ہے جسے مذہب سے علیحدہ کر دینے کے بعد وجود باری وحقیقت مذہب کے مسائل بے معنی رہ جاتے ہیں۔

افادیت مذہبی کے متعلق ان چند مختصر اشارات کے بعد اب پھر ہم افادیت کے محرکات دنیوی کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

اس مسلک کے متبعین کا یہ دعویٰ ہے کہ نیک کرداری کے لیے محرکات دنیوی بالکل کافی ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں نیک کرداری و مفاد ذاتی مرادف ہیں، اور جو شخص پوری انجام بینی و دور اندیشی سے کام لے گا، وہ یقیناً نہایت درجہ نیک کردار ہوگا۔ بداخلاقی۔ بدکرداری۔ کے نتائج ہمیشہ خود فاعل کے حق میں مضر نکلتے ہیں۔ شراب پیو گے، صحت خراب جائے گی، اسراف کرو گے مفلس ہو جاؤ گے، بیدریغ عیاشی و شہوت پرستی میں مشغول رہو گے، تو خانگی امن و مسرت کا خاتمہ ہو جائے گا؛ دوسروں کی حق تلفی کرو گے دوسرے خود تمہاری حق تلفی کریں گے۔ اسی طرح اگر نیکی کی عادت ڈالو گے، تو بالآخر تمہیں اسی میں سب سے زیادہ لذت محسوس ہونے لگے گی، اس سے بالکل قطع نظر کر کے کہ اب تمہارے افعال کے نتائج کس حد تک لذت بخش و راحت رساں ہو رہے ہیں، ایک دوکان دار، کچھ عرصہ کی تجارت کے بعد لکھ پتی ہو جاتا ہے، صدہا آدمی اس کے ملازم ہو جاتے ہیں، اور اسے خود دوکان پر جانے کی حاجت بالکل نہیں باقی رہتی تاہم اسے بذات خود دوکان پر بیٹھنے سے ایک لطف حاصل ہوتا ہے، اور وہ محض اسی لطف اندوزی کے لیے خود دوکان پر بیٹھتا ہے۔ یہی حال نیکی کے خوگرفتہ ہو جانے کے بعد آدمی کا ہوتا ہے۔

نیکی و خود غرضی کے ترادف و تلازم کا یہ نظریہ، جسے افادیت کے موافقین کے ساتھ اس کے مخالفین نے بھی اکثر تسلیم کر لیا ہے، ایک حد تک صحیح ضرور ہے، مگر صرف ایک حد تک۔ مثلاً اقوام پر بہ حیثیت مجموعی یہ کلیہ صادق نہیں آتا، چنانچہ روم کی تاریخ نیز بعض متمدن معاصر قوموں کی

طرزِ معاشرت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ گو بعض ذمائم اخلاق، قومی بربادی کا پیش خیمہ ہون تاہم اگر حرص وطمع، خود غرضی، ومکاری کو دانشمندی کے ساتھ برتا جائے، تو یہ چیزین قومی ترقی مین عین مفید ثابت ہون گی۔ اسی طرح یہ کلیہ غیر متمدن جماعات پر بالکل عائد نہین ہوتا، کہ وہان افراد پر رائے عام کا کوئی دباؤ نہین ہوتا، اور استحقاق کا مدار قوت وطاقت پر ہوتا ہے، یا پھر جن متمدن اقوام پر یہ کلیہ منطبق ہوتا بھی ہے، تو اُن مین بھی اس کا دائرۂ عمل نہایت محدود ہے، اُن لوگون کا ذکر جانے دیجیے، جن کی شدید اخلاق شکنی اُن کو جیل خانے کی ہوا کھلا رہی ہے، یا جو کثرت میخواری سے ہر وقت بدمست رہتے ہین، یہ لوگ تو حد سے گزرے ہوئے ہین۔ ہان ایسے لوگون کو البتہ لیجیے، جو دانشمندی واعتدال کے ساتھ اس طرح معاصی کے مرتکب ہوتے رہتے ہین، جن سے نہ اُن کی صحت کو صدمہ پہنچتا ہے نہ اُن کی شہرت کو۔ اور پھر کسی ایسے شخص کا اس غریب سے مقابلہ کیجیے، جو جادۂ مستقیم اخلاق سے ایک سرمو انحراف کرنا اپنے اوپر حرام جانتا ہے۔ کہیے ان دونون۔ "گنہگار دانا" اور "معصوم نادان" مین سے زیادہ پُر لطف زندگی کس کی گزرتی ہے؟ یقیناً اول الذکر کی۔

یہ بھی سنتے آئے ہین، کہ دیانتداری بہترین حکمت عملی ہے۔ لیکن اول تو اس مقولہ کی صحت وعدم صحت بہت کچھ پولیس کی مستعدی وسرگرمی پر منحصر ہے؛ دوسرے یہ کہ اخلاق کے جوہر اعلیٰ کی بنا اُس کی بہترین حکمت عملی ہونے پر نہین۔ اگر راحت ولذت کو حیات کا مقصد اصلی مان لیا جائے، تو ظاہر ہے کہ راحت کی جان، اعتدال ہے، لیکن اخلاق کے بہتر سے بہتر نمونے جو دنیا مین مل سکتے ہین، انھین اعتدال سے کوئی واسطہ نہین۔ حق کے لیے اپنی جان دیدینا، محاسن اخلاق کا سرتاج ہے، لیکن جو شخص ہر وقت اعتدال کی پیمایش کیا کرتا ہے، اسے سرفروشی سے کیا علاقہ؟ بلکہ اگر عقلی زندگی کے حدود پر نگاہ دوڑاؤ، تو کمال فن اور راحت اکثر منافی نظر آئین گے۔ کتنے ماہرین فن ایسے ہین، جنھون نے اپنی صحتین خراب کردی ہین! کتنے ارباب کمال ایسے ہین، جن کی ساری زندگی مصایب وآفات کا ایک تسلسل رہی ہے! کتنے ایسے موجدین ہوئے ہین

جنھون نے تلوار کے موجد کی طرح خود اپنی ایجادون پر تون افسوس کر کے روم کے فلسفی تاجدار مارکس اریلیس کے اس حکیمانہ قول کی تصدیق کی ہو کہ، "دانشمندی اور غم والم مین چولی دامن کا ساتھ ہو، پس جو شخص علم کے حدود مین اضافہ کرتا ہو، وہ غم والم کی مقدار مین بھی اضافہ کرتا ہو" وہ جو ایک قدیم افسانہ سنا جاتا ہو، کہ خدا نے انسان کے آگے شجر علم و شجر حیات دونون کو پیش کیا، لیکن اس نے اس مین سے شجر علم کا انتخاب کر لیا، درحقیقت ارباب کمال کی زندگی عموماً اسی افسانۂ کہن کی ایک عملی تفسیر ہوتی ہو۔

یہ شواہد ہم نے علم وفن کے دائرہ کے متعلق بیان کیے۔ لیکن خالص اخلاق کے دائرہ مین دیکھو، تو بھی بعینہٖ یہی کیفیت نظر آئے گی، نظریہ افادیت کے بموجب سب سے بڑی نیکی وہ ہونا چاہیے، جس مین سب سے زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہو، حالانکہ حقیقتِ حال اس کے برعکس ہو، بڑی سی بڑی نیکی مین سخت ضبط نفس کی ضرورت ہوتی ہو، بیشتر انسان کی خواہش کچھ ہوتی ہو لیکن ادائے فرض کے خیال سے وہ کرتا کچھ ہو، اور ظاہر ہو کہ یہ ضبط نفس کسی معنی مین، راحت و مسرت کا مبنیٰ نہین بن سکتا۔

حقیقت یہ ہو کہ اس سے زیادہ غلط و بے بنیاد کوئی دعویٰ ہو ہی نہین سکتا، کہ انسان کی مسرت اور اس کی نیک کرداری لازم وملزوم ہین۔ یہ بالکل ممکن ہو، اور ممکن کیا معنے اکثر ہوتا ہی یہ ہو، کہ ایک شخص کے حالات و مزاج اُسے دوسرون کی بہی خواہی کا گرویدہ بنا دیتے ہین، اور برخلاف اس کے دوسرے شخص مین ماحول واقتاد طبیعت کے اثر سے ذاتی مفاد و خود غرضی کا خیال غالب آجاتا ہو۔ ایک شخص کو دوسرون کے فائدہ پہنچانے مین لطف آتا ہو اور دوسرے کو اُن کے تکلیف دینے مین۔ اب ایسی حالت مین اقادئین کو کیا حق ہو کہ اول الذکر کی مدح و ثنا کرین اور آخر الذکر پر نفرین و ملامت۔ اُن کے نقطۂ خیال سے تو اصل محرک اعمال، فاعل کی راحت جوئی ہو، اور اس لحاظ سے ہر دو شخص مساوی ہین۔

پھر یہ بھی اس ضمن مین قابل لحاظ ہو، کہ مضرات معاصی ہمیشہ مدارج معاصی سے

متناسب نہین ہوتین - اکثر بعض نہایت خفیف لغزشون کی اسی قدر سخت سزا ملتی ہے، جتنی شدید سی شدید بدکاری کی - تغذیہ کی نہایت معمولی بد احتیاطی سے بعض وقت شکم مین اس قدر سخت درد اٹھتا ہے، جو شدت کرب و اذیت مین کسی طرح آتشک کی تکلیف سے کم نہین ہوتا، مگر کون کہہ سکتا ہے، کہ خفیف غذائی بد احتیاطی اُسی قدر شدید معصیت ہے، (اگر یہ معصیت ہو بھی) جس قدر وہ شہوت پرستی جو آتشک کا سبب ہوئی ہے -

ممکن ہے اس کے جواب مین یہ کہا جائے، کہ "تم نے نتائج افعال کی راحت و اذیت کے اندازہ کا جو طریقہ بتایا، وہ خود ایک لحاظ سے ناقص رہ گیا ہے - یہ سچ ہے کہ ضبط نفس سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے لیکن یہ تکلیف اُس اذیت کے مقابلہ مین بدرجہا آسان ہے جو ارتکاب معصیت کے بعد خود ملامت ضمیر سے ہم پر ہوتی ہے - اس لیے اعمال حسنہ کے انجام دینے مین بہرحال راحت و مسرت کا پلہ بھاری رہتا ہے" اس تاویل کے متعلق گزارش ہے، کہ ایک حسّ اخلاقی کے وجود سے ضمیرین کو کیونکر انکار ہو سکتا ہے - اُن کے مسلک کا تو دارومدار ہی اس کے وجود پر ہے، اور وہی تو اس کے وجود کو دیگر مذاہب اخلاقیات کے علی الرغم مدتون سے مانتے چلے آئے ہین، البتہ جس شے کے وہ منکر ہین، وہ یہ دعویٰ ہے، کہ اس کے پیدا کردہ لذات و آلام اس قدر قوی اور نتائج اعمال کے اسقدر متناسب ہوتے ہین کہ محض وہ کردار انسانی کی اساس و بنیاد کا کام دے سکتے ہین، اور اپنے انکار کی تائید مین وہ مطالعۂ باطن کی شہادت کو پیش کرتے ہین، اصل یہ ہے، کہ ضمیر جس قوت کا نام ہے (خواہ وہ ایک فطری حسّ اخلاقی ہو، اور خواہ ایتلاف افکار کی پیدا کردہ) اس کے دو مختلف مظاہر ہین، ایک نیکی و بدی مین امتیاز، دوسرے بدی پر ملامت اور نیکی پر آفرین - ان مین سے پہلا فرض تو وہ بے شبہ ہمیشہ پوری طرح ادا کرتا رہتا ہے، لیکن فرض ثانی اس قدر قطعی نہین، یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص تمام عمر بدکاری مین مبتلا رہے، اور اُسے اس کا احساس نہ ہو کہ وہ ارتکاب معاصی کر رہا ہے، لیکن یہ بالکل ممکن ہے اس احساس سے اُسے کوئی خاص

تکلیف نہ ہوتی ہو، کیا خوب کہا ہی کارلائل[1] نے کہ ضمیر کی تحسین وملامت کا کردار انسانی پر اتنا اثر بھی تو نہین ہوتا، جتنا جگر کی صحت یا خرابی کا ہوتا ہی۔ ہماری سمجھ مین تو یہ آتا ہی کہ جس طرح بعض لطیف الحس افراد کو ذبح حیوانات کے نظارہ سے ابتدا اً انتہائی اذیت ہوتی ہی، لیکن جب وہ مذبح کی سیر کے عادی ہوجاتے ہین، یا حالات اُنھین قصابی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہین، تو اُنھین اس نظارہ سے اتنی تکلیف بھی تو نہین ہوتی کہ اُس سے وہ ذرہ بھر بھی متاثر ہون، اُسی طرح ایک ذکی الحس، اینلی، سادہ مزاج لڑکی کو اپنی پہلی لغزش پر تو ملامت ضمیر سے انتہائی تکلیف ہوتی ہی، اور خار انفعال جراحت خنجر سے زیادہ پُر اذیت ثابت ہوتا ہی، لیکن کیا چند سال کے بعد جب سیہ کاری اُس کا ذریعۂ معاش بن جاتی ہی، تب کبھی ارتکاب معاصی پر اُسے تکلیف محسوس ہوتی ہی؟

بے شبہ یہ بالکل ممکن ہی، کہ ایتلاف افکار کے اثر سے انسان کو قدرۃً ناگوار چیزین خوشگوار محسوس ہونے لگین، اور فطرۃً خوشگوار چیزین ناگوار محسوس ہونے لگین، لیکن معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہی، کہ آخر اس احساس کی پاسداری اور اس کی مطابقت ہم پر کیون فرض ہی؟ یہ تو معلوم ہی ہی کہ افادیت کی رو سے، انسان پر قدرتی فرض کوئی بھی عاید نہین اس کے اعمال کی غایت صرف ذاتی راحت ہی، اور چونکہ تجربہ سے یہ معلوم ہوتا ہی، کہ اکثر ایک دیرپا نفع کے لیے انسان کو فوری نفع سے دست بردار ہونا ضروری ہی، اس لیے انسان کو اپنے ہی آخری نفع کی خاطر، مضرت عاجل برداشت کرنا چاہیے، اور یہی معنی ہین ایثار کے۔ اس سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو ادائے فرض ایک بے معنی لفظ رہ جاتا ہی۔ گویا جو شخص، اپنی ذاتی راحت سے بالکل غض بصر کرکے محض دوسرون کی راحت رسانی مین مصروف رہتا ہی، وہ ایک سعی لاحاصل مین مشغول ہی۔ پس جن لوگون کے نزدیک فطرت بشری کی یہ تشخیص صحیح ہی، اُن کے نقطۂ خیال سے ایک محسن بے غرض و پارسائے خالص کی حیثیت

---

[1] ٹامس کارلائل، انگریزی کا مشہور ادیب (۱۷۹۵ء تا ۱۸۸۱ء)

ایک ناعاقبت اندیش شخص سے زائد نہین۔

رہا یہ امر، کہ ویسے مزاج و طبیعت کا شخص جس کی تصریح ابھی چند سطر مین اُدھر مین کر چکا ہون ضمیر کی ملامت کے خوف سے اس کی تعمیل احکام مین راحت پائے گا، تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہی جس پر زیادہ زور دینے کی حاجت نہین۔ البتہ مجھے اس کے تسلیم کرنے مین بہت شبہ ہی، کہ بہ حیثیت مجموعی، خود ضمیر کا وجود، انسان کے حق مین بہ نسبت اذیت کے راحت کا زیادہ موجب ہی، میرا خیال اس کے بالکل برعکس ہی۔ مین سمجھتا ہون کہ اس کی ملامتون کا پلہ اُس کی تحسین و آفرین سے بہت بھاری ہی۔ اخلاق کی کتابون مین لکھا ہوتا ہی کہ نیک کردار شخص کو سکون قلب حاصل رہتا ہی، لیکن مین نہین جانتا کہ کسی نیک کردار شخص کی زندگی سے اسکی تصدیق ہوسکتی ہی، نیک کردار کا ضمیر یقیناً ذکی الحس ہو گا، اور ضمیر کی ذکاوت حس، سکون خاطر کی قاتل ہی، نیک کرداری کا لازمی نتیجہ ہی کہ طبیعت مین تواضع، انکسار و فروتنی پیدا ہو، اور یہ چیزین بداہتہً خود اطمینانی کے منافی ہیں۔ اس سے ظاہر ہی کہ افادیین کا یہ دعویٰ، کہ نیک کرداری و مسرت کامل مرادف ہین، کس قدر واقعیت کے خلاف ہی!

سب سے بڑھ کر یہ کہ دیگر مذاہب و نظامات اخلاق مین جس قدر محرکات حسن عمل متعارف ہین، اُن سب کی یہ خصوصیت ہی کہ اُنھین جس قدر زیادہ دھیان مین رکھیے، اسی قدر طبیعت اُن سے متاثر ہوتی ہی، اور جس قدر طبیعت اُن سے ہٹائیے، اُسی قدر اُن کا اثر ہلکا پڑتا جائے گا۔ مثلاً آلام و شدائد جہنم کا جس قدر زیادہ خیال رہے گا، اُسی قدر طبیعت بدی سے متنفر رہےگی، لیکن افادیت نے جو محرک حسن عمل قرار دیا ہی، اُس کی کیفیت بالکل اس کے معکوس ہی۔ اس مین یہ عجیب وصف ہی کہ اس کا جتنا زیادہ خیال کیجیے، اتنی ہی طبیعت نیک کرداری سے اور ہٹ جائے گی۔ افادیت کا یہی دعویٰ ہی نہ کہ، اعمال مین حسن و قبح

لہ اس سلسلہ مین ٹیلر کا یہ فقرہ کس قدر پُر لطف ہی، کہ ”اگر دنیا مین کبھی کسی جامع الاخلاق شخص کا وجود ہو بھی، تو اُسے اپنے وجود کی خبر ہی نہ ہوگی“، کیونکہ انکسار و فروتنی صحیح معرفت نفس کی مانع ہوگی۔

بالذات کوئی شئی نہین، اعمال صرف راحت رسان یا اذیت افزا ہو سکتے ہین، لیکن رفتہ رفتہ قانون ایتلاف فکری کی مطابقت مین راحت رسانی و نیک کرداری، اور اذیت افزائی و بدکرداری کے درمیان ایک ربط غیر منفک پیدا ہو جاتا ہے، اور یہی محرک ہوتا ہے حُسن اعمال کا۔ اب خود اپنی جگہ پر اندازہ کر کے دیکھو، کہ اس خیال کے رکھنے سے نیک کرداری کو تحریک ہوتی ہے، یا اُلٹی اور اُس مین رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے؟ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اس سے نیک کرداری کی ایک بے وقعتی سی دل مین سما جاتی ہے، اور ادائے فرض کی وہ قطعیت باقی ہی نہین رہتی، جو فرض کو محض فرض سمجھتے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصور کہ نیکی کو نیکی محض اس وجہ سے کہنے لگے ہین، کہ اس مین اور ہماری ذاتی منفعت و راحت مین طبعی و فطری نہین، بلکہ ایک اتفاقی و مصنوعی تلازم پیدا ہو گیا ہے، ہمین بجائے نیکی کی طرف اُبھارنے کے، اس کی طرف سے ہماری طبیعت اور سرد کیے دیتا ہے۔ اور جون جون یہ اتفاقی و مصنوعی تلازم کا خیال قوی ہوتا جاتا ہے، اسی نسبت سے نیکی کی قطعیت کی باگ ڈھیلی ہوتی جاتی ہے اور ہم مین اس کی جانب سے ایک گونہ بے اعتنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نتیجہ ہے، جو افادئیت کو تسلیم کر لینے کے بعد خود بخود لازم آتا ہے۔

جن ناظرین نے دلائل و بیانات بالا مین، صبر سے میرا ساتھ دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ سب، افادیت سے متعلق حسب ذیل نتائج پر پہونچ گئے ہون گے:-

(۱) اولاً یہ کہ گو افادئیت کے متبعین مین بعض نہایت اعلیٰ اخلاق کے افراد ہوئے ہین، تاہم اگر اس مسلک پر پورا پورا عملدرآمد کیا جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا، کہ اخلاق کی بنیاد متزلزل ہو جائے گی، اور ایثار و نفس کشی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۲) ثانیاً یہ کہ ضمیر کی جو تعبیر افادئیت نے کی ہے (یعنی وہی کہ ایتلاف افکار کی مدد سے وسایط و وسائل، اصل غایات کی جگہ لے لیتے ہین) وہ تنقید کی متحمل نہین ہو سکتی، اور تھوڑے غور کے بعد اس کی خامیان ظاہر ہونے لگتی ہین۔

(۳۳) ثالثاً یہ کہ جیسا ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے تصدیق کرسکتا ہے، افعال کے اخلاقی وغیر اخلاقی پہلو ایک دوسرے سے بالکل متباین ومتمایز ہوتے ہین، مثلاً ہم سے اگر کوئی بداخلاقی سرزد ہوتی ہے، تو اُس پر ہمارا ضمیر جس طرح ملامت کرتا ہے، وہ اس ندامت سے بلحاظ نوعیت بالکل مختلف ہوتی ہے جو تہذیب مروجہ کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہے۔ افادئین غلط بحث کرکے دونون کو ایک سمجھنے لگتے ہین، حالانکہ وہ خاص قسم کی خلاف ورزی فرض کا احساس، جو صرف اخلاق شکنون ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی تحلیل و توجیہ ایتلاف افکار کی مدد سے نہین ہوسکتی۔

صفحات بالا مین ناظرین کو افادئین کے اس اعتراض کا جواب بھی مل گیا ہوگا، کہ "فرض کو اگر خیال خود غرضی سے علیحدہ کرلیا جائے تو یہ ایک بے معنی لفظ رہ جائے گا کیونکہ کسی ایسے فعل کی ہم سے پابندی چاہنا جس کا ہماری ذات پر کوئی اثر نہ ہوتا ہو، مہمل و بے معنی نہین تو کیا ہے"؟ ہم کہتے ہین کہ صلہ و تعزیر، بے شبہ، اداے فرض کے محرکات و مرغبات ضرور ہین، لیکن اس کے عناصر ترکیبی نہین۔ یہ سچ ہے کہ ہم سے صدور اعمال توقع صلہ یا خوف تعزیر ہی سے ہوتا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہین کہ فرض نام ہی انھین چیزون کا ہوجاوے۔ یہ تفریق، چاہے حکما و فلاسفہ کے سمجھ مین نہ آئے، لیکن عام خلقت کے لیے تو بدیہیات کا حکم رکھتی ہے، اور لوگ برابر اسے اپنی عملی زندگی مین ملحوظ رکھتے ہین۔ مثلاً فرض کیجیے، کسی ملک سے کچھ لوگ جاکر ایک نوآبادی مین بستے ہین۔ یہ لوگ اس نوآبادی کی زمین کو آپس مین تقسیم کرلیتے ہین، اور وہان کے قدیم باشندون کو قتل کر ڈالتے ہین، یہ لوگ ہر دو افعال کے یکسان بیدردی سے مرتکب ہوسکتے ہین، تاہم ان مین سے ایک فعل سخت مجرمانہ ہے، اور دوسرا نہین۔ یا اسی طرح فرض کیجیے کہ کوئی باضابطہ آئینی حکومت آکر اُس نوآبادی پر قابض ہو جاتی ہے، زمین کو یہ حکومت بھی اپنے تصرف مین لے آتی ہے، لیکن قدیم باشندون کی جان سے تعرض نہین کرتی، بجز اس حالت کے کہ وہ لوگ خود ہی قانون شکنی

مخالفت کرین۔ ان دونون صورتون مین وہ فرق صاف ظاہر ہی، جسے ہم دکھانا چاہتے تھے
اول الذکر صورت مین قانون، خود ہی ایک فرض کی تخلیق کرتا ہی، اور خود ہی اُس کی پابندی
بھی کراتا ہی، بہ خلاف اس کے آخر الذکر صورت مین وہ صرف اس کی پابندی کراتا ہی، تو بس
ضمیرئین تو صرف اسی قدر کہتے ہین کہ ہم مین فطرۃً یہ شناخت کرلینے کا مادہ ہی، کہ فلان طریق عمل
فلان طریق عمل کے مقابلہ مین زیادہ شریفانہ، وممتاز تر و بلند تر ہی، اور یہی شناخت، یہی احساس
جو بہ لحاظ نوعیت حظ والم، مسرت واذیت، کے خیال سے بالکل علیحدہ ہی حسن عمل کی طرف
موّدی ہوتا ہی۔ یہ بالکل ممکن ہی کہ انسان باوجود اس علم واحساس کے بھی، شریفانہ راستہ کو
چھوڑکر رذالت کا راستہ اختیار کرے۔ اور ایسی صورت مین کہا جائے گا کہ اُس کا طرز عمل
مستحق عقوبت ہی، اور اگر وہ عقوبت سے بچ جائے، تو ہم یہ کہین گے کہ انصاف نہین ہوا
لیکن اگر بالفرض کوئی صلہ دینے والا یا کوئی مواخذہ کرنے والا نہ بھی ہو، تب بھی رذالت فی نفسہ
رذالت ہی رہے گی، اور شرافت فی نفسہ شرافت۔

باقی رہا ضمیرئین کا یہ دعوی، کہ انسان کبھی کبھی حصول مسرت کے مقابلہ مین دوسری
چیزون کو ترجیح دیتا ہی، تو اس کا فیصلہ خود ہر شخص کو اپنے شعور و تجربہ کی شہادت پر کرنا چاہیے
ہمارے خیال مین تو نوع انسانی کا متحدہ تجربہ اس کی شہادت دے گا، کہ انسان نے بارہا
نیک کرداری کو حصول مسرت پر ترجیح دی ہی، گو ضمناً اس کے نتائج بھی مسرت بخش نکل آئے
ہون۔ اور یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہی کہ جب جذبات قوی، اور فرض کے احساس قوی
مین آکر تعارض واقع ہوجاتا ہی، تو لذت وراحت کا پیمانہ ہاتھ مین لے کر مدارج نیک کرداری
کا اندازہ کرنا ناممکن ہوجاتا ہی۔ دنیا کے سب سے زیادہ نیک اشخاص کی زندگی کب پھولون
کے سیج پر گزری ہی؟ ہم نے تو عموماً رہروان منزل ہدایت کے پیرون کو آلام وتکالیف کے خار
سے زخمی پایا ہی۔ شاذ و نادر، ہان بہت ہی شاذ و نادر، ایسا دیکھنے مین آیا ہی، کہ جو لوگ ہشاش
بشاش، مسرور و شادان رہتے ہین، وہ لازماً سیرت اعلی بھی رکھتے ہون، یا جو لوگ افسردہ

دادِ اس مغموم وملول رہتے ہیں، وہ خواہ مخواہ بدکار ہی ہوں۔

وجوہ مفصلہ بالا کی بنا پر اگرچہ ضمیر یین، افادیت کے منکر ہیں، تو بالکل حق بجانب ہیں۔ وہ اس قدر بے شبہ تسلیم کرتے ہیں کہ اعمال کی حیثیت اخلاقی پر اُن کے منفعت بخش ہونے کا نہایت اہم اثر ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم میں فطرۃً حق و باطل نیکی و بدی میں امتیاز کی قوت ودیعت نہ ہوتی، تو ہم ہرگز یہ علم نہ رکھ سکتے کہ جہاں ہماری ذاتی منفعت، اور منفعت عامہ میں تعارض ہو، وہاں ہم پر آخرالذکر کی پیروی واجب ہے، اور ہم وہ اس کے بھی قایل نہیں کہ نیکی، افادہ ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، یا یہ کہ نیکی ہمیشہ افادہ کے تناسب ہوتی ہے۔ انھیں اس کا ضرور اعتراف ہے کہ ہیئت اجتماعیہ کے نظام موجودہ کے لحاظ سے عموماً نیک کرداری ولذت یابی دوش بدوش ہیں، لیکن افادیین کے علی الرغم اُن کا خیال ہے کہ اگر کسی باعث، موجودہ نظام اجتماعی دفعۃً منقلب ہو جائے، اور لذت و مسرت، نیک کرداری کی رفاقت چھوڑ کر، بدکرداری کے ہمرکاب ہو جائے، تو بھی نیکی، نیکی ہی رہے گی اور بدی، بدی یعنی نیکی، اُن کے نقطۂ خیال سے کسی خاص طرز تعود کی پابند نہیں، اور نہ متعدد لذات کی میزان کا نام ہے، پس اُس کے قوانین اٹل اور اس کے احکام و دفعات ناقابل تغیر ہیں۔ اپنے جوانمرد مگر جانی دشمن کا ہم سب لوہا مانتے ہیں؛ اپنے ایسے دوست کو جو اپنے فریق سے دغا کر کے ہم سے ملا ہو، ہم سب دل سے حقیر سمجھتے ہیں؛ سکرات موت کے وقت ہم اپنے خاندان و احباب، وغیرہ کے متعلق ہدایات دیتے ہیں؛ دوسروں سے ہمیں جو نقصانات پہونچتے ہیں، اُن کے سہواً و ارادۃً واقع ہونے میں ہم سب فرق کرتے ہیں؛ معصیت و نا عاقبت اندیشی کے درمیان ہم میں سے ہر شخص ایک امتیاز محسوس کرتا ہے؛ جو ناسپاس و کم ظرف افراد کسی طمع سے، ایثار پر راضی نہیں ہوتے، اُن کی طرف سے ہم سب میں ایک نفرت و حقارت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے؛ یہ اور اسی قبیل کے تمام وہ کیفیات جن کا ہمیں اپنی باطنی زندگی میں تجربہ ہوتا رہتا ہے، اور جن احساسات کی

عالمگیری پر تمام دنیا کا اجماع عام شاہد عادل ہے، یہ قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ نیک کرداری کے جذبات خود غرضی سے، اداے فرض کے جذبات منفعت جوئی و راحت طلبی سے بالکل متباین و مختلف ہین۔ بعینہ اس طرح کہ جیسے حظ و الم انتہائی مبادے عمل ہین، جن کی مزید تحلیل و توجیہ ممکن نہین، حق و باطل بھی بہ حیثیت محرکات عمل ہماری فطرت مین ودیعت ہین جن کے وجود اور جن کے وجوب پر کوئی دلیل و حجت نہین پیش کی جا سکتی۔ آفتاب کی روشنی اپنی دلیل آپ ہوتی ہے پس جو فلسفۂ اخلاق اپنے نظام مین ان حقایق کے لیے کوئی جگہ نہین نکال سکتا، وہ ناقص ہے کیونکہ اُس نے اُن حقایق کو نظر انداز کر دیا ہے، جن کے وجود کی نسل انسانی ہمیشہ شہادت دیتی رہی ہے۔ ضمیر انسانی ہر عہد مین سسرو[1] کے اس مقولہ کی تصدیق کرتا رہا ہے کہ "کسی لذت قریبہ سے لذت بعیدہ کی توقع پر دست بردار ہونا، اصل نکوکاری سے اُسی قدر بعید ہے، جتنا سود پر قرض دینا، سخاوت سے" درصل، تمام نیکی، تمام محاسن اخلاق کی جڑ ہی بیغرضی۔ جہان اپنی غرض شامل ہوئی، پھر اصلی جوہر شرافت کہان؟ پھر تو معاملت ہوگئی، کارِ خیر نہ رہا۔ ایثار، حق پرستی، عالی ظرفی و حسن اخلاق کا اصل الاصول یہ ہے کہ امر حق کے پیچھے اپنی دولت و مال، عزت و شہرت، جاہ و جلال، عیش و آرام بلکہ اپنی جان تک کو خطرہ مین ڈال دے، اور سچ پوچھیے تو یہی جوہر شرافت وہ نقطۂ دقیق ہے، جہان انسانیت و الوہیت، عبدیت و معبودیت، مین مصالحت ہونے لگتی ہے، اور کثافت مادی کے ڈانڈے لطافت روحانی سے جا کر مل جاتے ہین۔

افادئیت کے پاس دلائل تو جو ہین، وہ ہین ہی، مگر اس مسلک کو اس قدر مقبولیت جو حاصل ہوئی، اُس کا خاص سبب یہ تھا، کہ نفس بشری کے دو بڑے زبردست خصایص طبعی اسی کی تائید مین رہے ہین۔ ان مین سے ایک کا ذکر تو ہم کہین آگے چل کر کرین گے؛ لیکن دوسرے کو ابھی بتائے دیتے ہین۔ نفس بشری کا یہ خاصہ ہے کہ وہ یکسانیت و توحد کو ہر شے مین تلاش کرتا ہے، یہانتک کہ خود اپنے آپ کو، با این تنوع، کسی ایک خاص کلیہ کے تحت مین

[1] سسرو، روما کا مشہور خطیب،

لے آنا چاہتا ہے۔ یہ اس کے اسی طبعی میلان کا نتیجہ تھا، جس نے مسلک حسیت کو اٹھارویں صدی[1] میں اس قدر مقبول بنا دیا۔ یہ اس کی اسی فطری خواہش کا اثر تھا، جس نے بونٹ و کانڈلک[2] کو یہ خیال دلا دیا، کہ انسان بس ایک جاندار بُت ہے، جس کی ساری کائنات یہ ہے کہ حواس خمسہ کے ذریعہ سے تہیجات اُس کے اندر آتے ہین، اور انھین سے اس کی تمام کیفیات نفسی ماخوذ و مرکب ہوتی ہین۔ یہ اس کی اسی جبلّت کا اقتضا تھا، جس نے ہلویسیس کی زبان سے یہ کہلوایا، کہ فطرۃً تمام انسان مساوی القویٰ ہین، ذکاوت و حماقت کے درمیان جو اختلافات نظر آتے ہین، وہ محض اختلاف حالات کے پیدا کردہ ہین، اور انسان و حیوان کے درمیان جو کچھ فرق ہے، وہ تمام تر دست انسانی کی بہتر ساخت کا معلول ہے۔ اس قبیل کے نظریات ہر شعبۂ علم مین پائے جاتے ہین، لیکن اخلاقیات کے دائرہ مین یہ نہایت کثیر الوقوع ہین، حالانکہ یہین یہ سب سے زیادہ غلط فہمیون کا باعث بن سکتے ہین، کیونکہ مختلف حاسات اخلاقی باہم اس قدر مربوط و مختلط ہین، کہ اُن مین ہر ایک، دوسرے کا ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہابس کہتا ہے کہ "ترس اس تصور کا نام ہے، جو دوسرون کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر ہم مین اپنے آیندہ مصیبت کے متعلق پیدا ہوتا ہے"، یا مثلاً ہیچسن کا مقولہ ہے، کہ "بے اعتدالی اس لیے مذموم ہے کہ وہ ہمین دوسرون کے ساتھ زیادتی کرنے پر مستعد کرتی ہے"، یا پھر مثلاً بعض اور حکما اخلاق کا قول ہے کہ "عفو و رحم مین ہمین اس درجہ لذت ملتی ہے، کہ محض اسی حصول لذت کے خاطر ہم اکثر ظالمانہ اعمال کے مرتکب ہو بیٹھتے ہین۔" یہ تمام اقوال ایک خاص حد تک ضرور صحیح ہین، لیکن ان مین مختلف خصایص اخلاقی کے صرف ایک ہی پہلو پر سارا زور دیا گیا ہے، اور اسی کی اہمیت مین مبالغہ سے کام لیا گیا ہے +

خاتمہ سے قبل یہ بھی سُن لینا چاہیے، کہ ضمیریت کو جو ضدِّ استقرائیت سمجھا جاتا ہے، سو یہ تعبیر میرے نزدیک صحیح نہین۔ اُن لوگون کو تو استقرائین سے موسوم کرنا بیشک بالکل صحیح ہے جو ایک

---

[1] یورپ کا وہ فرقہ جو اس کا قایل ہوا ہے کہ تمام معلومات انسانی کا ماخذ تجربہ و حواس ہین۔

[2] بونٹ و کانڈلک اٹھارویں و انیسوین صدی مین مذہب حسیت کے سالار عسکر۔

مستقل حسِّ اخلاقی کے وجود سے منکر ہو کر یہ یقین رکھتے ہیں کہ حاسات اخلاقی کا اصل ماخذ وہ تجربہ ہی ہے جو ہمیں مختلف افعال کی منفعت بخشی کے متعلق حاصل ہوتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں، کہ صرف استقرائیین ہی تشکیل اخلاق میں تجربہ کا دخل جائز رکھتے ہیں، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ضمیرئین بھی وجود ضمیر پہ بلا دلیل ایمان نہیں لے آتے۔ استقرائیین ہی کی طرح وہ بھی پوری طرح حاسات اخلاقی کی توجیہ و تعلیل، تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں، ان کی ترتیب ارتقائی پر غور کرتے ہیں، اور ان کی باہمی ترکیب و امتزاج پر کامل توجہ کرتے ہیں، البتہ جب اس ساری تحلیل و تنقید کے بعد انھیں یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب تحلیل اپنے انتہائی حدود تک پہونچ گئی، اور اب مزید تحلیل کی گنجایش نہیں، تب جا کر وہ اُن کا ماخذ ضمیر یا ایک مستقل حسِّ اخلاقی کو قرار دیتے ہیں۔

لیکن اس "مستقل" سے یہ منشا نہیں، کہ آلات حواس خمسہ کی طرح اس حس کے لیے بھی ہم میں کوئی خاص آلہ موجود ہے۔ جس طرح ہم اپنے میں بعض ارادی، جذبی، و عقلی کیفیات کا ظہور پا کر، جن کی تحلیل خواص مادی میں ہم نہیں کر سکتے، اُن کا ماخذ و مرجع ایک غیر مادی ہستی نفس یا ذہن، کو تسلیم کر لیتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح حس اخلاقی کو ایک علٰحدہ و مستقل قوت قرار دینے کا مفہوم صرف اس قدر ہے، کہ ہم میں جو تصورات و احکام اخلاقی پیدا ہوتے ہیں، اُن کا ماخذ کسی اور قوت نفسی کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔

فصل (۶)

ضمیریت

صفحات گزشتہ میں ہم نے جو تصریحات کی ہیں، اگر انھیں ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے تو ان تناقضات کا خاتمہ ہو جائے گا، جو مختلف اساطین ضمیریت میں باہم نظر آتا ہے، کیونکہ

حقیقت حال صرف اتنی ہے کہ ان میں سے ہر ایک حاسات اخلاقی کے علیحدہ علیحدہ امتیازی پہلوؤں پر زور دیتا ہے، اور اس سے تناقض لازم نہیں آتا۔ مثلاً بٹلر جیسی شے پر زور دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ حاسات اخلاقی اپنے ساتھ ہی اپنے وجوب کا بھی حکم رکھتے ہیں، اور وہ اسی احساس وجوب کی بنا پر وجود ضمیر کا قائل ہے، ایڈم اسمتھ، اور اُس کے اتباع، اس کے برخلاف، حاسات اخلاقی کے ہمدردانہ خصوصیات پر خاص زور دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں قدرۃً شقاوت سے نفرت اور الفت وہمدردی کی جانب رغبت ہوتی ہے، اور یہی فطری میلان، یہی جبلی احساس، حق وضلالت کا فاصل ہے۔ کڈورتھ (جسے کینٹ[1] کا اگر پیش رو کہنا چاہیے)، اس پر معترض ہے، وہ کہتا ہے کہ رحم، ہمدردی، انسانیت، صداقت وغیرہ میں صرف یہی خصوصیت نہیں ہوتی، کہ ہمیں بالطبع ان کی جانب میلان ہوتا ہے، بلکہ اُن میں یہ وصف بھی ہوتا ہے، کہ ہم عقلاً و وقوفاً بھی انھیں محمود و مستحسن سمجھتے ہیں اور نہ صرف جذبات، بلکہ خود ہمارا ادراک ہمیں اُن کی جانب ہدایت کرتا ہے، اس بنا پر حاسات اخلاقی، ہماری حیات جذبی سے ماخوذ نہیں ہوتے، بلکہ اُن کا اصل ماخذ خود ہماری عقل و وقوف کی ہدایات ہیں، کلارک اس میں ترمیم کر کے کہتا ہے، کہ اوصاف حسنہ وہ ہیں، جن کے اور ماہیت اشیا کے درمیان ایک خاص طرح کی مناسبت و موزونیت پائی جاتی ہے، اور اس طرح موزونیت و مناسبت کو بتانے والا ہمارا ادراک و وقوف ہے، گویا وہ بھی ایک دوسرے طریقہ پر حاسات اخلاقی کا مبنیٰ عقل و ادراک ہی کو قرار دیتا ہے، ولسٹن اُن ماخذ اصلی راستبازی کو، اور ہچیسن، فیاضی کو تسلیم کرتا ہے، شفٹسبری و ہنری مور کے نزدیک اس وجدان اخلاقی سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہی نیک کرداری کی محرک ہے، ہیوم کا راستہ ان سب سے الگ ہے، وہ اس کا قائل ہے، کہ نیک کرداری کا وصف امتیازی اس کی منفعت بخشی ہے، تاہم ہمیں اوصاف حسنہ کا علم محض معلم فطرت کی وساطت سے ہوتا ہے۔ خود باطن سے

---

[1] کینٹ، جرمنی کا سب سے زیادہ مشہور فلاسفر

ایک آواز آتی ہے، کہ فلان افعال محمود ہین اور فلان مذموم۔ ہیوم ہی نے شیفٹسبری و کلارک کے مذاہب ہین یہ تباکر مصالحت کرادی، کہ اخلاقی فیصلے بسیط نہین ہوتے، بلکہ دو مختلف عناصر سے مرکب ہوتے ہین، ایک عنصر عقلی یا دماغی ہوتا ہے، اور دوسرا قلبی یا وجدانی، اس مصالحت سے شیفٹسبری و کلارک دونون کی بات اپنی اپنی جگہ رہ گئی۔ متاخرین نے اس مسلک کو یہ بیان کرکے اور زیادہ تقویت دیدی، کہ مختلف محاسن اخلاق مین یہ ہر دو عناصر مختلف مدارج کے ساتھ ممزوج ہوتے ہین۔ آخر مین لارڈ کیمس کا یہ مذہب ہوا ہے، کہ جو نیکیان، وجوب، فرضیت و قطعیت کا درجہ رکھتی ہین، مثلاً دیانت داری، عدل، راستبازی، اُن مین عقلی ادراک حق و ضلالت کا پلہ بھاری ہوتا ہے، مگر جو نیکیان محض استحسان یا افضلیت کا مرتبہ رکھتی ہین، مثلاً سخاوت، دریادلی اُن مین جذبی وجدان، رغبت و نفرت کا جزو غالب رہتا ہے۔ غرض یہ کہ آل کار تمام ضمیرئین کا ایک ہی رہا ہے، فرق جو کچھ ہے وہ تشکیل ضمیر کی تعبیر مین ہے، منزل مقصود سب کی ایک ہے، راستون کا اختلاف ایک ضمنی شے ہے۔

ہچیسن شیفٹسبری و لارڈ کیمس، اثناء تحریر مین باربار، علم الاخلاق و علم الجمال کے قضایا کی مماثلت کا ذکر کرتے ہین، جس سے ہمارا ذہن بھی ان کی مماثلت کی جانب منتقل ہوا۔ اور گو اسے پھیلانا، مباحث گزشتہ سے الگ جا پڑتا ہے، تاہم اس کا اجمالی ذکر تو کیے ہی دیتے ہین نیکی و حسن کو لوگ آج سے نہین، ابتدا سے مماثل مانتے چلے آئے ہین، یہانتک کہ یونانی زبان مین نیک و حسین کے لیے ایک ہی لفظ ہے، اور فلاطون نے تو یہانتک کہا ہے، کہ حسن اخلاق وہ نور ہے، جس کا مظہر حسن صورت عکس ہے۔ خود ہماری زبان کا یہ حال ہے کہ ہم نیک کرداری کو حسن اخلاق، سے تعبیر کرتے ہین، اور ہم سب یہ فطرۃً محسوس کرتے ہین کہ مختلف اصناف حسن اور مختلف اوصاف حسنہ مین ایک طرح کا ربط یا مطابقت ضرور ہے، اس مماثلت کے چند نمایان پہلو درج ذیل ہین :-

(الف) ہم بلا عقل و استدلال کی وساطت کے، بہ مجرد مشاہدہ، بعض چیزون کو حسین و خوبصورت

محسوس کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی حیثیت افادی نہیں ہوتی۔ مثلاً آسمان کہ اس کی خوبصورتی سے فی الفور ہر شخص متاثر ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی بیساختگی و بے اختیاری کے ساتھ فیاضی وایثار کے افعال پر بھی ہماری زبان سے صدائے تحسین نکل جاتی ہے۔

(ب) کسی شے کے حسن سے جو اثر ہم پر پڑتا ہے، اگر اس کی تحلیل کریں تو وہ دو مختلف عناصر سے مرکب معلوم ہوگا۔ ایک ادراک (یا کیفیت وقوفی)، دوسرے اس کی طرف سے رغبت یا نفرت کا جذبہ (یا کیفیت احساسی)، اور بالکل یہی حال قضایائے اخلاق، یعنی کسی فعل کو مذموم یا مستحسن قرار دینے والے قضایا کا بھی ہوتا ہے۔

(ج) جس طرح کسی شے کے صاحب جمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُسے پسندیدگی و محبت کی نظر سے دیکھا جائے، ٹھیک اسی طرح کسی امر کے فرض ہونے کے معنی بھی یہ ہیں کہ اُسے ادا کیا جائے۔

(د) ہر شخص جانتا ہے کہ خوبصورتی و بدصورتی دو متباین چیزیں ہیں۔ ہر شخص نیکی و بدی کو بھی دو متباین چیزیں سمجھتا ہے۔

(ھ) ہر شخص جانتا ہے کہ خوبصورتی بہرحال بدصورتی سے افضل ہے۔ ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ نیکی بہرحال بدی سے افضل ہے۔

(و) اشیاء لطیف و جمیل، خواہ وہ اپنی تخلیق و تشکیل کے زمانہ و ماحول کے لحاظ سے باہم کتنی ہی مختلف ہوں، پھر بھی ہر ملک و ہر زمانہ میں مقبول و محبوب ہوتی ہیں۔ ہومر کی "ایلیڈ"، اور کالیداس کی "شکنتلا"، میں کیا شے مشترک ہے، لیکن باایں ہمہ دونوں کو یکساں قبول عام حاصل ہے۔ خوش آوازی، چمن کی شادابی، شفق کا سہانا پن، سبزہ کی لہلہاہٹ، سمندر کی روانی، پہاڑ کی عظمت، عورت کی نزاکت، یہ مناظر ہر ملک و ہر عہد میں اپنی جانب لوگوں کی جلب توجہ کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت مسلم و متعارف افعال محمودہ کی ہے۔ سخاوت، دیانت، عصمت، عدل، راستبازی کو ہمیشہ ہر شخص نے جوہر انسانیت قرار دیا ہے۔

(ز) خوبصورت چیزون کی دو قسمین ہین۔ ایک وہ جو عظمت واجلال کا پہلو لیے ہوتی ہین دوسرے وہ جن مین لطافت ونزاکت کا پلہ بھاری ہوتا ہے۔ اسی کے متوازی، فضائل اخلاق بھی عنوان دوگانہ کے ماتحت لکھے جا سکتے ہین۔ ایک کے تحت مین جانبازی، استقامت، استقلال، حق گوئی، عدل کامل آجاتے ہین، اور دوسرے کے ذیل مین ہمدردی، مروت، رحم، شیرین زبانی، وغیرہ۔

(ح) ارتقا، تمدن، ومدارج شائستگی مین رفعت کے ساتھ لوگون کے تصورات حسن وجمال مین تغیرات ہوتے رہتے ہین کسی زمانہ مین شوخ رنگ پسند کیا جاتا ہے، کسی زمانے مین ہلکا۔ کسی وقت تصاویر کی رنگینی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، و کبھی ان کی سادگی پر۔ کسی ملک مین زیورون پر حسن فنائی کا دارمدار سمجھا جاتا ہے، اور کہین وہ گنوارپن اور بھدےپن کی علامت قرار دیے جاتے ہین۔ پس بالکل یہی حال تصورات اخلاقی مین تغیرات کا ہے۔ ارتقاء تمدن جس طرح مذاق بدل دیتا ہے، تصورات اخلاقی مین بھی تغیرات پیدا کر دیتا ہے۔ اصول وہی رہتے ہین مگر فروع مین زمین وآسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ چہرہ وہی رہتی ہے، مگر برگ و بار ہر موسم بہار مین نئے ہو جاتے ہین۔ اعتدال و بےاعتدالی، انسانیت وحیوانیت، پامردی و بزدلی مین صرف چند قدم کا فرق ہوتا ہے، اور معیار اخلاق مین تغیر ہونے کے ساتھ، ان چیزون کے تسمیہ وتعبیر مین بھی تغیر ہوتا رہتا ہے۔

(ط) خصائص مرز بوم، وخصوصیات زمان ومکان کا، انسان کے ذوق پر نہایت اہم اثر ہوتا ہے۔ مثلاً مختلف قومون مین جو اختلاف مذاق پایا جاتا ہے، اس کا ایک بہت بڑا باعث یہی امر ہے۔ مثلاً اہل حبش جو تخیل "حسن" کا قائم کرین گے، وہ لامحالہ اس سے بالکل مختلف ہوگا، جو باشندگان کوہ قاف قائم کرین گے۔ جو مناظر قدرت، یورپ والون کے نزدیک حسن قدرت کے بہترین نمونے ہین وہ ایشیا والون کے نزدیک قابل اعتنا بھی نہین۔ جو خوشبوئین اہل عرب اپنے لیے مایۂ ناز سمجھتے ہین، باشندگان آسٹریلیا کا ان سے دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ وقس علی ہذا۔ ٹھیک اسی کے متوازی، خصائص مرز بوم وحالات مقامی، تخیلات اخلاق پر بھی بدرجہ موثر ہوتے ہین۔ جو قوم

پہاڑون کے درون، اور گھاٹیون مین ہمیشہ محصور رہتی ہی، اُس کا اخلاق لازماً اُن لوگون سے مختلف ہوگا جو کھلے میدانون یا بیابانون اور ریگستانون مین رہتے ہین، خانہ بدوش فرقون اور ساکنان شہر کی اخلاقی زندگی مین یقیناً تباین ہوگا۔ یا پھر فرض کرو، کہ ایک قوم تھوڑی تعداد مین ایک کوہستانی علاقہ مین آباد ہی، جس کے تمام ہمسایہ اس کے قومی دشمن ہین، اور جو اپنا وجود محض اپنی انتہائی جرأت، شجاعت، اتفاق و یکجہتی و چالاکی کے باعث قائم کیے ہوئے ہی، ایسی قوم کے لیے یہ ایک بالکل قدرتی بات ہی کہ وہ عہد شکنی یا شقاوت کو کچھ زیادہ شدید بداخلاقی نہ سمجھے۔ اسی طرح جو قوم تمدن زائیدہ عیش و عشرت کے منازل اعلیٰ مین ہی، اور جو امن و امان کے ساتھ مشاغل تجارت و صنعت و حرفت مین مشغول ہی، اس کے لیے یہ بالکل فطری امر ہی کہ وہ انھین چیزون کو کبائر عصیان سمجھے، اور اسراف، عیاشی، میخواری وغیرہ کو صغائر کے درجہ مین رکھے۔

(ی) سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض اتفاقی حالات جس طرح تشکیل مذاق مین دخل عظیم رکھتے ہین، اُسی طرح تشکیل اخلاق مین بھی رکھتے ہین۔ مثلاً فرض کیجیے، کہ ایک شخص کسی قوم مین بہ لحاظ عزت و وجاہت نہایت ممتاز مرتبہ رکھتا ہی، اُس نے اپنی کسی ذاتی مصلحت یا مجبوری (مثلاً کسی بیماری کے باعث) سے عام رواج سے ہٹکر اپنے لیے ایک خاص طرح کا لباس اختیار کر لیا۔ اُس نے تو وہ لباس محض کسی مصلحت یا مجبوری سے اختیار کیا، لیکن اُس کو جماعت مین جو مرتبہ حاصل ہی، اُس کے لحاظ سے اُس کی نظیر متعدی ہو گی، عوام اُس کی تقلید کرنے لگین گے، یہانتک کہ رفتہ رفتہ وہی لباس مقبول ہو جائے گا، اس کے سوا، تمام لباس خلاف رواج سمجھے جانے لگین گے، اور یون رفتہ رفتہ قوم کے عام مذاق مین تبدیلی پیدا ہو جائے گی، اور خوش لباسی کا ایک نیا معیار قائم ہو جائے گا۔ بالکل اسی کے مثل، جب کوئی معمولی فعل، کسی خاص اتفاقی سبب سے منظر عام پر آجاتا ہی، یا اس کا انتساب، مذہبی و اخلاقی حیثیات سے کسی مدود ارو ذی وجاہت شخص کی طرف

ہوجاتا ہے، تو لوگ خواہ مخواہ اس کی تقلید کرنے لگتے ہین، اور اسی کو معیار اخلاق قرار دے لیتے ہین۔ ایسے مواقع پر مختصات وقتی و قومی کو حذف کرکے، عام انسانی ضمیر کی طرف صحیح اخلاقی فیصلون کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔

(ک) معترض کہ سکتا ہے، کہ قضایاے اخلاق و قضایاے جمال، خواہ دیگر حیثیات سے کیسے ہی متحد ہون، لیکن اس حیثیت سے ضرور متباین ہین کہ اول الذکر مفید عمل ہین اور آخرالذکر نہین، چنانچہ میکنٹاش اس اعتراض کی ترجمانی ان الفاظ مین کرتا ہے: ”جذبۂ حُسن و جمال، جذبۂ عظمت و لطافت، غرض ہر وہ شے جو مذاق کے تحت مین رکھی جاسکتی ہے، اُس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احساس، و شعور، و انفعال، کے سرحد سے آگے نہین بڑھتی بہ خلاف اس کے حاسات اخلاقی، مودی الی العمل ہوتے ہین“ لیکن میرے نزدیک یہ بنا، امتیاز بھی صحیح نہین۔ قضایاے ذوق تمام تر ہمارے رجحان عمل پر دال ہوتے ہین، یعنی وہ یہ ظاہر کرتے ہین، کہ فلان شی بہ مقابلہ فلان شی کے قابل ترجیح ہے، اور اگر کوئی خاص مانع نہ ہو، تو انسان اسی اول الذکر شی کو اختیار بھی کرلے۔ دوست احباب، پیشہ، مسکن، غرض ہر اختیاری شی کے انتخاب مین ہم حتی الامکان وہی چیزین اختیار کرتے ہین، جو ہمارے مذاق کی ہوتی ہین، اور جن چیزون سے ہمارے مذاق کو مغایرت و بیگانگی ہوتی ہے، انھین ترک کردیتے ہین۔ یہ سچ ہے کہ زندگی مین بہت سے مواقع ایسے پیش آتے ہین جہان ہمین اپنے ذوق سے کام لینے کی حاجت ہی نہین واقع ہوتی، لیکن اسی کے مقابلہ مین بشیار موقع ایسے بھی آتے ہین، جبکہ ہمین اخلاقی فیصلہ کی ضرورت نہین پڑتی، تو کیا اس سے کوئی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حاسات اخلاقی مفید عمل نہین ہوتے؟ اگر نہین، تو پھر حاسات ذوقی کے متعلق یہ نتیجہ کیون قابل تسلیم ہے؟ یہ بھی سچ ہے کہ عملی زندگی مین اکثر ہم اپنے ذوق کی پیروی بھی نہین کرتے ہین، مثلاً اگر کسی مکان کا کچ رکھنا ہی زیادہ سودمند ہے، تو اس کے مقابلہ مین ہم اُس کے تناسب کا کچھ خیال نہ کرین گے، مگر ایسے مواقع پر ہم اپنے فتاوے ضمیر کی کب

پرواکرتے ہین؟ جانتے ہین کہ ایک راستہ غلط ہی، مگرجان بوجھ کربھی اسی پر چلتے ہین۔ البتہ قوا ے ضمیر کی خلاف ورزی مین اذیت وتکلیف ضرور ہوتی ہے، مگر ایسی ہی اذیت وتکلیف اپنے خلاف ذوق، عمل کرنے سے بھی ہوتی ہے۔

مماثلت ومشابہت کے ان کثیر التعداد شواہد نے اکثر اخلاقیین کی زبان سے یہ کہلادیا ہے، کہ نیک کرداری، خوش مذاقی ہی کا دوسرا نام ہے، اور جو شخص جتنا زیادہ خوش مذاق وصحیح الذوق ہوگا، اسی قدر صاحب اخلاق بھی ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ نظریہ اگرچہ اس نظریہ کے مقابلہ مین بدرجہا قابل ترجیح ہی، جو نیکی کو افادیت کے مرادف قرار دیتا ہے، اور اگرچہ قدماء یونان و شفٹسبری نے قطعی طور پر ثابت کردیا ہے، کہ اخلاقیات وذوقیات کا چولی دامن کا ساتھ ہی، تاہم اخلاق کو تمام تر خوش مذاقی ہی کا دوسرا نام قرار دینا، خالی از تکلف نہین۔ بعض اوصاف حسنہ تو بے شبہ ایسے ہین، جن کے متعلق ہم بلا تامل، لطافت کا اطلاق کرسکتے ہین، مثلاً فیاضی، یا عبادت مین خضوع وخشوع وغیرہ۔ مگر انھین کے ساتھ بعض ایسے مکارم اخلاق بھی ہین جو کسی طرح اس عنوان کے ماتحت نہین آسکتے، مثلاً راستبازی، دیانت داری وغیرہ۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ متقدمین مین رواقیہ، اور متاخرین مین بٹلر نے لکھا ہے، ہماری فطرت مین ضمیر کو جو درجہ ومرتبہ حاصل ہے، وہ اپنی ذات سے بالکل منفرد ہے، اور وہ صاف صاف اخلاقیات وذوقیات مین حد فاصل قائم کرتا ہے۔ یہ اس معنی مین، کہ برخلاف ہمارے تمام دیگر حسیات وشتہاآت کے جن کا دائرہ عمل مخصوص ومحدود ہوتا ہے، ضمیر کے فرائض غیر محدود ہوتے ہین۔ وہ ہمارے تمام جذبات واحساسات پر حاکم اور ان کی تحدید کرنے والا ہے۔ اور ہمارے تمام قویٰ سے، بہ لحاظ نوعیت ہی مختلف ومتمایز ہوتا ہے۔ ہم خود ایسے افعال کو، جو فتاوے ضمیر کے منافی ہوتے ہین، غیر فطری سمجھتے ہین، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے تمام قویٰ وجذبات پر حکمرانی وسرداری حاصل ہے، اُس کی طاقت ممکن ہے کہ ضعیف ہو، یعنی وہ اپنے احکام کی ہم سے تعمیل نہ کراسکے تاہم اس کے حق حکمرانی سے کس کو مجال انکار ہوسکتی ہے؟ اس کا یہی حق حکمرانی ہے جو اسے ہر جذبہ، ہر صنف ذوق، سے فائق وممتاز

کیے ہوئے ہی، اور یہی وہ شے ہی جس کی مختلف زبانون نے مختلف تعبیرات کی ہین مثلاً سسرو کہتا ہی کہ وہ خدا ہی جو ہمارے باطن سے ہم پر حکومت کر رہا ہی۔ سینٹ پال کی زبان مین قانون قدرت ہی، اور بٹلر کی اصطلاح مین سرداری ضمیر ہی۔

سطور بالا مین ہم نے کہا ہی، کہ ہماری سرشت کے مختلف اجزا مختلف النوع ہوتے ہین، یعنی بعض پست و ادنی ہوتے ہین، اور بعض بلند و ارفع، یہ تفریق نوعی، جس پر ضمیریت کی ہیئت بہت کچھ منحصر ہی، ایسی تو ہی نہین کہ اس کی کوئی جامع و مانع تعریف پیش کی جاسکے، البتہ اسکا مفہوم مختلف مادی مثالون کے ذریعہ سے، ہم ناظرین کے ذہن نشین کر سکتے ہین۔

فرض کیجیے، کسی دوسرے کرہ سے، کوئی ایسی ہستی دفعۃً ہماری سطح ارض پر آجائے جو وساطت حواس سے مستغنی، اور ادراک اشیاء مین محض عقل کی محتاج ہو۔ فرض کیجیے، کہ ایسی ہستی ہمارے قواے مدرکہ کی بابت تحقیق کرنے لگے، تو اس کے نزدیک یہ ایک مسئلہ لاینحل ہوگا، کہ انسان اپنے حاسۂ ذوق، و حاسۂ سمع کے درمیان پستی و بلندی کا اس قدر امتیاز کیون قائم کیے ہوئے ہی۔ ذائقہ، ہمین کھانے پینے کی لذتون سے محظوظ کرتا ہی اور سامعہ سننے کی لذتون سے۔ ظاہر ہی کہ ہر دو قوی بالکل فطری ہوتے ہین، دونون کا نشو و نما مشق و تربیت سے ہوسکتا ہی، دونون ہماری زندگی کے لیے یکسان ضروری ہوتے ہین، دونون حالت اعتدال مین یکسان مفید ہوتے ہین، دونون بداعتدالیون کی صورت مین یکسان مضر ہوتے ہین، لیکن بہ این ہمہ اشتراک و مماثلت، دونون کے مرتبہ و درجہ مین کس قدر فرق ہوتا ہی! حس سامعہ کا تربیت یافتہ ہونا، خوش مذاقی کی دلیل سمجھا جاتا ہی، بہ خلاف اس کے حس ذائقہ کی ترقی، بدمذاقی کی علامت قرار دی جاتی ہی۔ اسے ہر شخص فخر کے ساتھ کہتا ہی کہ اسے موسیقی کا مذاق ہی یا وہ سماع کا بہت شایق ہی، لیکن یہ کہتے ہوئے ہر شخص جھجکتا ہی کہ وہ کھانے کا بہت شایق ہی۔ دونون حاسات فطری مین یہ فرق، ظاہر ہی کہ مدارج کی بنا پر نہین، بلکہ نوعی ہی۔ ایک حاسہ اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے دوسرے کے مقابلہ مین، زیادہ لطیف، بلند و ارفع سمجھ لیا گیا ہی۔

ایک اور مثال لیجیے، فرض کیجیے کہ ایک تعلیم یافتہ و خوش مذاق کے سامنے آپ دو چیزون کا انتخاب پیش کیجیے۔ ایک ٹریجڈی[1] کا، ایک محض مسخر آمیز نقل کا۔ اور کہیے کہ وہ ان دو مین سے کسی ایک تماشہ کا دیکھنا پسند کرے، تو یقیناً اس کی نظر انتخاب اول الذکر پر پڑے گی، حالانکہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کا نظارہ تمامتر مسرت ناک نہین تھا، بلکہ اس مین غم و اذیت کی بھی آمیزش رہی ہے، بخلاف اس کے آخر الذکر مین شروع سے آخر تک کہین غم و اذیت کا نام بھی نہین آیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی، ہر شخص کا اول الذکر کو ترجیح دینا، صاف اس امر کی دلیل ہے کہ اول الذکر، بہ لحاظ نوعیت، آخر الذکر سے افضل و اشرف ہے، اسی قبیل سے وہ تمام جذبات بھی ہین، جن مین مسرت و حظ کے ساتھ ساتھ ہم درد و رقت انگیزی سے بھی متاثر ہوتے رہتے ہین، اور جنھین ہم یقیناً مسرت محض پر ترجیح دیتے ہین۔

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے، کہ ہمارے تمام اعمال کا مدعا، حصول مسرت ہی ہے، اور لذت کا مدار تمامتر اس کے مدارج حظ انگیزی پر ہے، تو اس مین شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہین، کہ جو شخص سب سے زیادہ بے آمیز مسرت حاصل کرتا ہے، وہی سب سے زیادہ دانشمند ہوتا ہے۔ لیکن یہ عینہ وہ نتیجہ ہے جس کی تغلیط، مشاہدہ ہر ہر قدم پر کرتا ہے۔ بچہ، فطرت کی سادہ سے سادہ چیزون سے مسرت حاصل کرتا ہے، معمولی پھول پتی، ڈنڈا گلڑہی، گڈا گڑیا، اس کی مسرت رسانی کے لیے بالکل کافی ہین، اسی طرح ناتعلیم یافتہ ناخواندہ دہقانی، معمولی سے معمولی باتون مین مزہ لیتا ہے، لیکن عقل و فہم مین ترقی کے ساتھ انسان ان تمام منازل کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ بچپن کے تماشون کو، طفلانہ دلچسپیون، کے حقیر لقب سے موسوم کیا جاتا ہے، ان پڑھ اور دہقانیون کو پھوہڑ، بدتمیز و بدمذاق، خیال کیا جاتا ہے۔

یہی حال، افراد سے گزر کر جماعات کا بھی ہوتا ہے۔ وحشی و متمدن جماعات، یا غیر منظم و منتظم ممالک کی حالتون کا موازنہ کرنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے، کہ مقدار مسرت و راحت کے لحاظ سے

---

[1] ٹریجڈی Tragedy ڈراما کی وہ صنف جس کا خاتمہ درد و الم پر ہو۔

اول الذکر، آخر الذکر سے ذرا بھی پیچھے نہین لیکن پھر بھی کوئی شخص یہ ماننے کو تیار نہ ملے گا کہ دور توحش و عدم تمدن، عہد تمدن و تنظیم جماعت کے مقابلہ مین قابل ترجیح ہے، لندن و پیرس کے ہوٹلون مین، برلن کے عالیشان تماشا گاہون مین، نیویارک کے ہفت منزلہ ایوانون او محلون مین محض بہ لحاظ **مقدار**، شاید اُس قدر مسرت و بےفکری نہ ہو، جتنی افریقہ کے حبشیون، اور عرب کے بادیہ نشینون مین پائی جاتی ہے، لیکن باینہمہ اس کا مدعی کوئی بھی نہ ملے گا، کہ اعلیٰ صناعیون و تمدن زائیدہ تکلفات کو چھوڑ چھاڑ کر انسان اپنے قرن اولیٰ کی انتہائی سادگی اور سہولتون کی جانب لوٹ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ جس بےفکری، اطمینان و سکون کے ساتھ حیوانات اپنی زندگی گزار دیتے ہین، وہ انسان کو کبھی نصیب نہ ہوتی ہو، لیکن باوجود اس کے بھی کوئی شخص یہ پسند نہ کرے گا، کہ وہ قالب انسانیت کو ترک کرکے حیوان کا جنم لیلے، غرض کارزار حیات کے شدائد کا تحمل، کشمکش زندگی کی دشواریون کی برداشت، ہر شخص کو گوارا ہوگی بہ نسبت اس کے کہ وہ ایسی سکون و بےفکری کی زندگی قبول کرے، جس مین کسی طرح کا شور و شر نہ ہو۔ جس سے اس حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے، کہ بعض مسرتین، اپنے مدارج مقدار سے قطع نظر کرکے، بجاے خود لطیف و شریف ہوتی ہین۔

یا پھر، اسی طرح، دماغی راحت کا جسمانی راحت پر مقدم، اور ذہنی تفریحات کا بدنی تفریحات پر افضل ہونا سب کو مسلم ہے۔ لیکن اس افضلیت کا یہ سبب نہین ہو سکتا، کہ اول الذکر کی مقدار حظ بخشی، آخر الذکر سے زائد ہوتی ہے، بلکہ صورت واقعہ شاید اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ سچ ہے کہ اول الذکر، زیادہ متنوع و زیادہ دیرپا ہوتی ہین، لیکن اسی کے ساتھ اُن کے حصول مین بھی تو سخت دقتین اور دشواریان اُٹھانا پڑتی ہین۔ چنانچہ اتنا ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے کہہ سکتا ہے، کہ علما و فضلا، ہرگز بہ مقابلہ کھیل کود والے لوگون کے زیادہ راحت و مسرت سے نہین رہتے، اور نہ عاقل و بالغ انسان، بہ مقابلہ بچون کے زیادہ مسرور و زندہ دل ہین۔ لذائذ دماغی کا طرفدار زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے، کہ وہ انسان کو تحمل شدائد پر آمادہ، اور تصور اذیت

والم کی طرف سے بے پروا کر دیتے ہین، لیکن ہمارے نزدیک یہ دعوی زیادہ صحیح نہین، اپنا مقولہ تو یہ ہے، کہ امریکہ کے جس موجد نے فاقد الحس دواؤن کی ایجاد کی ہے، اُس نے نوع انسان پر اتنا بڑا احسان کیا ہے، کہ سقراط سے لیکر مل تک تمام فلاسفہ کا مجموعہ بھی اُس کا مقابلہ نہین کر سکتا۔ فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ ایک روایت کی صورت مین یون بیان کیا جاتا ہے کہ قدماء مین سے کسی سے، ایک شخص نے پوچھا کہ "فلسفہ سے حاصل کیا ہے، اُس نے جواب دیا کہ "لوگون کو آسانی سے مرنے کی تعلیم دینا" لیکن فلسفہ کا یہ سب سے بڑا کارنامہ، ایک ایسی معمولی و غیر اہم و پیش پا افتادہ حقیقت ہے، جو چین کے میدان مین، ہندوستان کے سبزہ زار مین، عرب کے ریگستان مین لاکھون کرورون مرتبہ دُہرائی جا چکی ہے، جو میدان جنگ مین روزمرہ پیش آتی رہتی ہے، اور جس کی عملی تصدیق وحشی قاتل و ڈاکو برابر کیا کرتے ہین۔ درحقیقت جس دلیری، جس بیباکی، جس بے جگری سے وحشی و ناتربیت یافتہ افراد موت کے منھ مین چلے جاتے ہین، اُس کی نظیر سے حکما و فلاسفہ کی تاریخ خالی ہے۔ اور اس واسطے یہ کہنا صحیح نہین کہ دماغی تربیت انسان کے مجموعۂ راحت مین، کسی صورت، اضافہ کرتی ہے، اس لحاظ سے ہرگز دماغی تربیت کو جسمانی تربیت پر کوئی فوق نہین حاصل، پھر اگر فوق و فضیلت حاصل ہے، تو کس بنا پر؟ اس کا جواب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے، کہ دماغی راحت فی نفسہ، جسمانی راحت پر برتر و راجح ہے۔

آخر مین یہ بھی ملحوظ رہے، کہ ہم اپنے بعض حاسات اخلاقی کو جو اپنی تمام خوشیون پر ترجیح دیتے ہین، تو اس کا کیا باعث؟ کیا اس لیے کہ اُن کا مجموعہ مقدار مین مادی مسرتون سے زیادہ ہوتا ہے؟ کیا اس لیے، کہ اگر ہم سو پچاس مرتبہ نہایت لذیذ غذائین کھائین، تو اُن کے مجموعۂ لذات کی میزان، اُس روحانی مسرت کے مساوی ہوگی، جو ہمین ایک عمل نیک کے انجام دینے سے ہوتی ہے؟ ہرگز نہین، دونون اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جُداگانہ ہین، اور مادی لذات، خواہ شمار مقدار و مساحت مین

کتنی ہی زائد ہون، لیکن پھر بھی پست و دنی المرتبہ کہی جائین گی، اور روحانی لذات ہر حال مین لطیف، بلند، پاکیزہ، و شریفانہ قرار دی جائین گی۔

افعال کے درمیان بہی وہ مہتم بالشان تفریق نوعی ہے، جس سے اکثر اکابر افادئین، مثلاً بیلی و بنتہم نے بکسر غض بصر کر لیا ہے، اور گو الحمد للہ کہ ہمارے بعض معاصرین (مثلاً مِل صاحب) اس کی اہمیت کے پورے اندازہ شناس ہین، لیکن ان بیچارون کی تاویلات خود انھین کے مسلمات کے منافی ہوتی ہین! اور یہ تناقض ناقابل ارتفاع ہے، اس لیے کہ اگر افعال کی یہ تفریق نوعی تسلیم کرلی جائے، تو اس سے یہ ماننا بھی لازم آئے گا کہ افادئین کے علی الرغم، ہمارے ارادے تمامتر ہماری خواہش لذت یابی کے محکوم و تابع نہین، بلکہ اس سے اس قدر بے نیاز ہین کہ مسرات مختلفہ تک مین امتیاز کر سکتے ہین، اور بجائے استلذاذ محض کے، اُن مین ایک کو دوسرے پر اشرف و افضل قرار دیکر اسی کو اختیار کرتے ہین۔ اصول افادیت کے رو سے توکسی کردار کے اعلیٰ و ادنیٰ ہونے کے معنے اس کے سوا کچھ ہین ہی نہین، کہ پہلے سے ہمین مسرت زیادہ حاصل ہوتی ہے اور دوسرے سے کم، حالانکہ مشاہدہ سے، اس کی قدم قدم پر تکذیب ہو رہی ہے۔ پس اگر ہم اصول افادیت کے خلاف اسے تسلیم کرلین، کہ بعض اعمال، بذات خود، بلا لحاظ مسرت بخشی نتائج، دوسرون سے بہتر و برتر ہوتے ہین تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا، کہ ہماری سرشت یا فطرت بھی مختلف حصون مین تقسیم ہے جن مین سے بعض کو دوسرون پر فی نفسہ حق ترجیح حاصل ہے، لیکن اگر یہ بھی مسلم ہو جائے، تو افادیت و ضمیریت مین جھگڑا ہی کیا باقی رہ جاتا ہے؟ ضمیرئین بھی تو یہی کہتے ہین کہ ہماری فطرت کے بعض حصے (جسے وہ ضمیر سے موسوم کرتے ہین) دوسرون پر حق حکومت رکھتے ہین۔ اور یہ وہ مقام ہے جہان افادئیت و ضمیرئیت کے ڈانڈے باہم مل جاتے ہین۔

فصل (۷)

حسِّ اخلاقی کے نام نہاد تناقضات

ضمیریت کے خلاف جن دلائل کی صف آرائی کی جاتی ہے، وہ تحلیل ہو کر شمار مین صرف دو رہ جاتے ہین، پہلی دلیل کا خلاصہ یہ ہے، کہ قضایاے اخلاقی کا اصل منبع و ماخذ افعال کی حیثیت افادی ہوتی ہے۔ اس دلیل پر مجھے جو تنقید کرنی تھی، وہ صفحات بالا مین کر چکا۔ دوسرے اعتراض کا ماحصل یہ ہے، کہ "مختلف اقوام و ممالک مین جن قضایاے اخلاقی کا وجود پایا جاتا ہے، وہ خود باہم متضاد و متناقض ہین۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک بسیط فطری حسِّ باطنی (ضمیر) کے مظاہر نہین"، یہ اعتراض بے شبہ بہت قوی ہے، اور تاریخ اخلاق پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا ہے، اس لیے اگر مین اس پر کسی تفصیل سے گفتگو کرون، تو غالباً طوالت کا مجرم نہ سمجھا جاؤن۔

اس سلسلہ مین سب سے پہلے قابل لحاظ یہ امر ہے کہ اکثر صورتون مین، جہان قضایاے اخلاقی مین تناقض نظر آتا ہے، وہ اخلاقی حیثیت سے مطلق نہین ہوتا، بلکہ تمام تر کسی عقلی غلط فہمی یا مغالطہ پر مبنی ہوتا ہے مثلاً سود خواری کو لیجیے آج یورپ مین یہ ایک بالکل جائز چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن چند صدیون پیشتر ہمارے اسلاف مذہبی حیثیت سے اسے سخت مذموم جانتے تھے۔ اس اختلاف خیال کا اصل باعث صرف یہ ہے، کہ اُنھین علم اقتصاد کے صحیح اصول سے واقفیت نہ تھی۔ وہ لوگ اس غلط فہمی مین مبتلا تھے، کہ روپیہ ایک جامد شے ہے، جو ہمیشہ جون کی تون برقرار رہتی ہے، اس بنا پر آج ایک سو روپیہ دینا اور کل ایک سو ایک وصول کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اُس زمانے مین شرح سود بھی نہایت گران تھی، جس سے غربا کو واقعۃً سخت مصائب کا شکار ہونا

پڑتا تھا، اور اس باعث مذہبی گروہ مین سود خوارون کی طرف سے اور نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن آج جبکہ اقتصادیات کی تعلیمات نے بتادیا ہے کہ روپیہ ایک مردہ و جامد شے نہین بلکہ احداث ثروت کا آلہ ہے۔ اضافہ دولت کا ذریعہ ہے۔ اور اس لیے جو شخص قرض لیکر زر اصل کو مع سود کے واپس کرتا ہے، وہ کچھ اپنے پاس سے نہین دیتا، بلکہ اپنے نفع مین دائن کو شریک کرتا ہے، جس کا وہ پورا مستحق ہے۔ تو اس غلط فہمی کی اصلاح کے ساتھ موجودہ یورپ کا کلیہ اخلاقی بھی بدل گیا ہے۔

اسی قبیل سے یہ مسئلہ کہ قصداً اسقاط حمل کرانا کس حد تک گناہ ہے، تمامتر اس بحث کے تصفیہ پر منحصر ہے کہ جنین مین زندگی کس وقت سے شروع ہوتی ہے؟ قدما کا یہ خیال تھا، کہ جنین کا کوئی مستقل وجود نہین ہوتا، وہ جسم مادہ کا صرف ایک جزو ہوتا ہے، اور اس لیے ان کو اُسے ضائع کرنے کا ویسا ہی اختیار حاصل ہے، جیسے اپنے کسی اور حصہ جسم کی قطع و برید کا۔ چنانچہ افلاطون و ارسطو کے نزدیک اسقاط کوئی مجرمانہ حیثیت نہین رکھتا۔ رومن قانون بھی، عہد الپین سے پیشتر، اس بارہ مین خاموش ہے۔ رواقیہ کا یہ مذہب ہوا ہے کہ جنین مین زندگی، تنفس کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ روم کے بادشاہ جسٹینین نے اپنے قانون مین یہ تسلیم کیا، کہ زندگی کا آغاز، استقرار حمل سے چالیس روز بعد سے ہوتا ہے۔ لیکن قانون حال نے ان سب کے برخلاف، حیات جنین کو حمل کا مرادف مانا ہے، اور اسقاط کو روز اول ہی سے ناجائز قرار دیا ہے۔ ان دونون مثالون مین یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ کلیات اخلاقی، ہمارے معلومات ذہنی و تحقیقات علمی کے تابع تھے، اور جون جون ایک مین ارتقاء ہوتا گیا، دوسرے مین بھی اس کے مطابق تغیرات ہوتے رہے۔

اسی طرح ہمین اس فرق کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے، جو فرائض اخلاقی و فرائض مذہبی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ہم خود یہ محسوس کرتے ہین، کہ جھوٹ، چوری، مکاری، زناکاری، سے ہم پر ضمیر کا جو لعن طعن ہوتا ہے، وہ نوعاً اُس سے بالکل مختلف ہوتا ہے، جو ترک صوم و صلوٰۃ

یا کسی دوسرے مذہبی فرض کی عدم ادائگی سے ہوتا ہے۔ اول الذکر میں ہم براہ راست ملامت ضمیر کے مورد ہوتے ہیں، اور آخر الذکر میں ہم خود ضمیر کی کوئی خلاف ورزی نہیں کرتے ہیں، بلکہ احکام مذہبی کی کرتے ہیں، اور چونکہ اُن میں اور احکام ضمیر میں ایتلاف کا علاقہ راسخ جاگزین ہے، اس لیے ہم بالواسطہ مخالفت ضمیر بھی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، ضمیر کا فرض تو بس اتنا ہی ہے کہ ہمیں تعمیل ارشاد ربانی کی ہدایت کرے۔ رہا یہ کہ کون سے احکام احکام ربانی ہیں؟ سو یہ کام عقل کا ہے، ضمیر کا نہیں۔ اسی واسطے جو لوگ مختلف قوموں میں طریق عبادت وغیرہ کے اختلاف کی بنا پر ضمیریت پر معترض ہیں، اُن کا اعتراض صحیح نہیں۔

ایک اور طبقۂ افکار کو بھی ہمیں خالص اخلاقی تصورات سے الگ رکھنا چاہیے۔ یہ طبقہ اُن اعمال پر مشتمل ہے، جو بذات خود کوئی بداخلاقی نہیں رکھتے، بلکہ جن کا تصور حسب قانون ایتلاف کسی بداخلاقی کے ساتھ ایسا وابستہ ہو گیا ہے، کہ ہم اُنھیں بھی معصیت قرار دینے لگے۔ مثلاً جمہوریت رومانے حفظ عفت کے لیے جہاں اور بہت سی تدابیر جاری کی تھیں، وہاں اُس نے یہ قانون بھی نافذ کر دیا تھا، کہ عورت کے لیے شراب حرام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے شراب کی حرمت بالذات مقصود نہ تھی، بلکہ یہ صرف ایک ذریعہ تھا، (منجملہ دیگر ذرائع کے) عورتوں کے ننگ و ناموس کی حفاظت کا۔ مگر رفتہ رفتہ، رواجاً لوگوں کے ذہن میں اس کا تعلق، بے عصمتی کے ساتھ ایسا مستحکم ہو گیا، کہ لوگ اسے بھی بدچلنی کے برابر ہی معیوب جاننے لگے۔ چنانچہ کیٹو ایک جگہ کہتا ہے کہ "شوہر کو اپنی بیوی پر ہر طرح کا اختیار ہے اسے اختیار ہے کہ اُس کے شرمناک افعال مثلاً زناکاری و بادہ نوشی پر جو چاہے سزا دے"۔ بالآخر کچھ مدت کے بعد جب لوگوں میں علمی بیداری پھیلی، اور اپنے رسوم و عقاید کو عقل کی روشنی میں جانچنے لگے، تو انھیں بھی یہ نظر آیا، کہ تحریم بادہ نوشی کبھی مقصود بالذات ہو نہیں سکتی تھی۔ اس قبیل کے اخلاقی کلیات میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے، مگر ان سے تناقضات ضمیر پر استناد کرنا درست نہیں ہو سکتا۔

تناقض ضمیری کی ایک ظاہری صورت اور بھی ہے جسے اس بحث مین نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اس حقیقت سے غالباً ہر شخص آگاہ ہوگا، کہ ایک فاتح عظیم کی طرف سے ہمارے دل مین عظمت و محبت کے جذبات موجزن رہتے ہین، حالانکہ ہم خوب جانتے ہین کہ اُس نے محض ہوس ملک گیری، حرص زر یا آرزوے شہرت کے خاطر ہزارون عورتون کو بیوہ کر دیا، لاکھون بچّون کو یتیم بنا دیا، اور بیشمار گھرون کو بے چراغ کر دیا۔ برخلاف اس کے ایک عام قاتل یا ڈاکو کو ہم سب نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہین، حالانکہ بالکل ممکن ہے کہ قتل کا باعث کوئی انتہائی اشتعال انگیز واقعہ، یا ڈاکہ کا باعث سخت ترین ناداری و مفلسی ہو۔ اس نظیر کو پیش کر کے معترض کہتا ہے، کہ یہان ضمیر ایک صریحی بداخلاقی پر ملامت کرنے سے ساکت اور ایک مشتبہ بداخلاقی پر ملامت کرنے مین اس قدر بلند بانگ ہے؟ لیکن یہ معترض کی جلدبازی ہے۔ اُس نے فی الحقیقت مسئلہ کے بہت سے پہلوؤن کو چھوڑ دیا ہے۔ کسی فاتح اعظم کے ساتھ جذبات تعظیم و ہمدردی رکھنا اُس کی سفاکیون کی بنا پر نہین ہوتا، بلکہ کچھ تو اس کی قوت و طاقت کا نتیجہ ہوتا ہے، کچھ اس عام خیال کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کی فتحمندیون مین تائید ایزدی شامل حال ہے، اور پھر کچھ حصہ اس مین اُن مادی منافع کا بھی ہوتا ہے، جو اس فاتح کے ہم قومون کو اس کی فتوحات سے حاصل ہوتے ہین۔ یہ سب چیزین مل ملا کر اس کی طرف سے ہمارے جذبۂ نفرت کو گھٹا دیتی ہین۔ لیکن ایک شے ان سب سے بھی بڑھ کر اس کی مقبولیت مین معین ہوتی ہے، اور وہ اُس فاتح اعظم کی جانبازی و سرفروشی ہے۔ مذہب کو مستثنیٰ کرنے کے بعد جس دائرۂ عمل مین انسان سب سے زیادہ بےغرضی، بےلوثی، خلوص، و استقامت کے ساتھ قدم رکھتا ہے، وہ میدان جنگ ہے۔ ہر طرح کے شدائد برداشت کرنا، ہر طرح کے صعوبات پر تحمل، اپنے احباب و اعزہ کو اپنے سامنے دم توڑتے دیکھنا، خود زخمون سے چور چور ہونا، بلکہ خود اپنی زندگی سے دست بردار ہونا، انھین چیزون کی توقعات لیکر انسان لڑائی مین اُترتا ہے، اور اس سے بڑھ کر ایثار و بےنفسی کی کیا مثال ہو سکتی ہے؟ پس سپاہیون کی، ہمارے دل مین جو عزت

وقعت ہوتی ہو۔ اس کا اصل باعث اُن کی یہی ایثار نفسی ہوتی ہو، اور جب صورت حال یہی ہو، تو ان کی طرف سے ہم مین جذبۂ قدر و منزلت پیدا ہوتا، نظریۂ ضمیریت کے منافی نہین، بلکہ عین اس کے مطابق ہو۔ رہا یہ کہ ہزارون لاکھون سپاہیون مین سے صرف جنرل یا فاتح کی عظمت ہم مین اس قدر کیون پیدا ہوتی ہو؟ تو اس کا جواب بہت ہی آسان ہو۔ عام سپاہیون کا نام ہی کون جانتا ہو؟ اُن کی مردانگی کا علم ہی کس کو ہوتا ہو؟ اُن کے کارنامون سے واقفیت ہی کیسے ہوتی ہو؟ جس شخص کا نام سب سے زیادہ واضح و نمایان طور پر لیا جاتا ہو، وہ جنرل یا فاتح ہی ہوتا ہو۔ اور نتیجہ حالات کے اس اُلٹ پھیر کا یہ ہوتا ہو، کہ جو شخص اپنی ہوس پرستی پر ہزارون جانین قربان کر دیتا ہو، اُسی کا نام کمال عظمت و احترام کے ساتھ لیا جانے لگتا ہو۔

ایک اور اعتراض ضمیریت پر یہ عائد کیا جاتا ہو، کہ بعض اوقات حاسات مذہبی و حاسات اخلاقی مین تعارض ہو جاتا ہو، اور حاسات مذہبی بھی چونکہ ایک طرح پر حاسات اخلاقی ہی ہوتے ہین، اس لیے گویا خود حاسات اخلاقی مین تناقض واقع ہو جاتا ہو، لیکن ہمین اس اعتراض کا وزن بھی تسلیم نہین۔ اس طرح کے تناقضات، حقیقۃً اخلاق کے حدود مین آتے ہی نہین۔ اسے سمجھنے کے لیے پہلے ہمین اس قبیل کے خالص عقلی تناقضات کو دیکھنا چاہیے۔ کچھ عرصہ ہوا، یہ عقیدہ تمام دنیاے مسیحیت کا تھا، اور اس کے بیشتر حصہ کا تو اب بھی ہو، کہ ایک شب کو مسیح نے کھانا کھاتے وقت اپنے جسم کو اپنے ہاتھ مین لے لیا، اور اُسے ریزہ ریزہ کر کے اپنے مریدون مین تقسیم کر دیا، جنھون نے اُسے کھا لیا، پھر یہ سب کچھ ہوتا رہا، اور مسیح جون کے تون قائم رہے۔ کون ہو، جو اس واقعہ کو بلا تامل قطعاً مستبعد و محال نہ قرار دے گا؟ لیکن باایں ہمہ کرورون ذی ہوش مسیحیون نے اسے بےچون و چرا تسلیم کر لیا، اور اب بھی تسلیم کر رہے ہین۔ اس کا باعث سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہو، کہ اعتقاد، قواے فطرت کی زبان بند کر دیتا ہو۔

یہ تو ایک عقلی مسئلہ کی مثال تھی۔ بالکل اسی کے متوازی اخلاقی حدود میں ہم یہ عقیدہ شائع پاتے ہیں، کہ جو بچہ بغیر بپتسمہ لیے ہوئے فوت ہوجائےگا وہ ایک دائمی عذاب الیم کا مستحق ہوگا۔ خیال کرنے کی بات ہے، کہ وہ معصوم مخلوق، جس کی مدت حیات کا شمار چند سکنڈ یا چند منٹ پر محدود ہے، اور جو گناہ کے مفہوم سے بھی نا واقف ہونے پایا، وہ اگر بغیر ایک خاص طرح پر پانی اپنے جسم پر ڈالے ہوئے مرجائے، تو اُسے بغیر باز پرس ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دینے والا، بھلا کبھی بھی عادل و منصف کہا جاسکتا ہے؟ اُس کی معدلت شعاری پر ایک بچہ بھی ایمان لاسکتا ہے؟ اُسے رب عادل کہنا چاہیے یا شیطان مجسم؟ لیکن پھر بھی لاکھوں کروڑوں اچھے تعلیم یافتہ و سمجھ دار افراد ایسی ہی ہستی کو اپنا خدا تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ اُن کو ایسے خدا میں بداخلاقی نظر نہیں آتی، نظر آتی ہے، مگر ساتھ ہی اُنھیں یہ بھی یاد آجاتا ہے، کہ یہ مذہب کا ارشاد ہے، اور یہ خیال، اُن کے قوت انصاف کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ انھیں احساس ہوتا ہے، کہ ایسی ہستی ہرگز بدکرداری کے الزام سے پاک نہیں ہوسکتی، لیکن معاً مذہب کا زبردست ہاتھ اُن کے اس احساس کو دبا دیتا ہے۔ اور وہ بہ کمال انکسار و تعبد، بےچون و چرا، فرمان دینی کے آگے گردن ڈال دیتے ہیں۔ پس اس سے یہ استنباط صحیح نہیں، کہ ان کے حساسات اخلاقی میں تناقض ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے، کہ وہ اس خاص مسئلہ کو عام اخلاقی قوانین کے ماتحت رکھتے نہیں۔ وہ اسے ایک طرح کا معجزہ یا خرق عادت سمجھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ معجزات و خوارق عادت کے لیے کوئی قانون نہیں۔

یہ جو مثال ہم نے ابھی بیان کی، اس میں تو تناقض اخلاقی لوگ تسلیم کرتے ہیں، لیکن ایک اور مثال ایسی ہے، جس میں دو مقدمات کی منطقی ترتیب سے ایک بالکل اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے، البتہ یہ مقدمات خود ہی ایک فرمان مذہبی کی آڑ میں ایک سخت بداخلاقی کے کلیہ کو پناہ دیے ہوئے ہیں۔ یہ مثال مذاہب غیر کے لوگوں کو تعزیر دینے کی ہے، اور اس کے مقدمات یہ دو ہیں، کہ (۱) مسیحیت کے خلاف تمام مذاہب کے ماننے والے سخت ترین جرم بداخلاقی کے

مرتکب ہین، اور (۲) جرم و بداخلاقی کے مرتکب، سخت ترین تعزیرات کے مستحق ہین۔ ان کے ملانے سے یہ استنباط بالکل صحیح پیدا ہوتا ہے، کہ غیر مسیحیون کو شدید ترین تعزیر دینا چاہیے۔ اسی اصول پر عملدرآمد ہے، فی نفسہ نہ کسی اصول اخلاق کی خلاف ورزی ہوتی ہے، نہ کسی قانون منطقی کی، بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ ایک غلط کلیہ کو مذہب کے اثر سے لوگون نے صحیح تسلیم کرلیا ہے۔

ان تمام مثالون سے یہ حقیقت، ناظرین کے ذہن نشین ہوگئی ہوگی، کہ رواج یا مذہب کا قانون، اکثر ضابطۂ اخلاق پر غالب آجاتا ہے، اور ضمیر کی آواز کو مدھم کردیتا ہے، بلکہ بعض حالتون مین اُسے مریض تک بنادیتا ہے، مثلاً جب ہمارے شارعین مذہب نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگاکر منقولات سے معقولات کو دبا دیا ہے، جب انھون نے سیکڑون ہزارون سال کی پیہم کوششون سے نفس بشری مین یہ اعتقاد راسخ جمادیا ہے، کہ ایمان بالغیب تحقیق و عقل پرستی سے افضل ہے، تو ایسی حالت مین لازمی ہے، کہ ہم جبلۃً عقلی دیانت داری کی طرف سے آنکھین بند کرلین، اور کورانہ تقلید کے ڈھرے پر لگ لین۔ حس اخلاقی کی یہ مغلوبیت، یہ شکست پذیری، بے شبہ لوگون کو ضمیریئیت کی راہ مین ایک بڑی رکاوٹ معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی بنا پر وجود ضمیر سے انکار کرنا جائز نہین ہوسکتا۔ یہ حال تو ہمارے تمام حاسات وقویٰ کا ہے۔ ہماری ہر فطری قوت بعض حالات مین ضعیف و مریض یا مردہ ہوجاتی ہے۔ ذوق کی ابتدائی بدتربیتی انسان کو بدمذاق بنادیتی ہے، عقلی تعلیم کا نقص اُسے مدۃ العمر بدعقل رکھتا ہے، لیکن ان واقعات سے یہ کوئی بھی نتیجہ نہین نکالتا، کہ سرے سے ان قوتون کے وجود ہی سے منکر ہوجائے۔ ایسے موقع پر ہم اپنے گرد وپیش عام حالت کا اندازہ کرکے اوسط نکالتے ہین، اور یہی طریقہ ہمین حاسات اخلاقی کے بارہ مین بھی اختیار کرنا چاہیے۔

میرے علم مین مخالفین کی طرف سے ضمیریئیت پر ایک جو بڑے سے بڑا اعتراض وارد ہوسکتا ہے، اُس کی بنا انکے اس خیال پر ہے، کہ ضمیریئین کے نزدیک نفس بشری کے اندر

ایک پُراسرار قوت موجود رہتی ہے، جو نیکی و بدی کے ہر موقع پر ہمیں ایک قطعی و متعین ہدایت دیتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ ایسا خیال رکھنا ضمیریت کی بالکل غلط تعبیر کرنا ہے۔ ضمیرئین کا ہر گز یہ دعوے نہیں۔ وہ جو کچھ مانتے ہیں، اُس کا ماحصل دفعات ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔

اولاً یہ کہ ہمارا ارادہ، تمامتر قانون حظ و الم کا محکوم نہیں، بلکہ احساس فرض کا بھی محکوم ہے، جو اول الذکر سے بالکل علیحدہ ایک شے ہے، اور جو اپنے ساتھ وجوب وقطعیت کا عنصر بھی رکھتا ہے،

ثانیاً یہ کہ ہمارے تخیل فرض کی بنیاد ایک باطنی ادراک پر ہے، جو ہمارے متعدد جذبات احساسات، و رجحانات سے متعلق یہ بتاتا ہے کہ ان میں سے بعض بذات خود نیک و قابل اختیار ہیں، اور بعض بذات خود بد و قابل ترک۔ ضمیرئین اسے بطور ایک مسلم حقیقت نفسی کے مانتے ہیں، کہ ہمیں یہ از خود فطرۃً معلوم ہو جاتا ہے، کہ فضائل اخلاق، رذائل اخلاق سے اشرف ہیں۔ انصاف ناانصافی سے، راست بازی ناراستی سے، عفت شہوت پرستی سے، شکر گزاری محسن فراموشی سے، بہرصورت افضل و اعلیٰ ہے۔ اور یہ کہ ہر زمانہ و ملک میں نیکی کا زینہ جذبات فاضلہ رہے ہیں نہ کہ جذبات رذیلہ۔ یہ ممکن ہے کہ احساس فرض کسی میں اتنا کمزور ہو کہ ضمیر کی قوت، اعمال کی دستگیری نہ کر سکے؛ یہ ممکن ہے کہ بعض جماعات میں اُن کے حالات اُن کی نیک کرداری کے سرچشمہ کو کسی ایک مخصوص رُخ پر محدود کر دیں (مثلاً یونان قدیم میں اور معاشرتی خوبیاں تو تھیں لیکن عصمت و عفت کی طرف بے اعتنائی تھی)؛ یہ ممکن ہے کہ کہیں کہیں ہمارے مختلف جذبات فاضلہ کے درمیان بھی تعارض واقع ہو جائے (مثلاً انصاف و رحم، یا حق گوئی و مروت میں)، اور یہ بھی ممکن ہے کہ معتقدات مذہبی کے نشہ میں بیخود ہو کر انسان کسی غیر مرئی ہستی کی خوشنودی کے لیے ایسے اعمال بھی کر گزرے جو ضابطۂ اخلاق کے مطابق نہ ہوں؛ غرض اس طرح کے مخصوص حالات کا، ارتقاء اخلاقی کے راہ میں حائل ہوتے رہنا بالکل ممکن ہے تاہم ایک صداقت ان سب سے اہم تر ہے، اور وہ بدستور اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ وہ صداقت یہ ہے کہ کوئی شخص خود

اپنے نزدیک نیک کرداری کے مدارج پر فائز نہیں ہوسکتا تا وقتیکہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق ہمدردی کو نقصان رسانی پر، راستی کو ناراستی پر، پاکبازی کو شہوت پرستی پر، ترجیح نہ دے۔

اب یہ ایک واضح حقیقت ہے، کہ نظریۂ ضمیریت کے مطابق، ہر ملک و زمانہ میں، معیار اخلاق یا اعمال اخلاق کی تعیین میں اتحاد و یکسانیت ہرگز ضروری نہیں، بلکہ جس شے میں یکسانیت تلاش کرنا چاہیے، وہ رجحان طبعی و میلان فطری ہے۔ انسان جس وقت عالم شہود میں قدم رکھتا ہے، تو اُس وقت اس کے جذبات ایثار مغلوب، اور جذبات خودی غالب ہوتے ہیں۔ اخلاقیات کا کام اس ترتیب کو اُلٹ دینا ہے۔ لیکن چونکہ افراد سے جذبات خودی، و انانیت کا یکسر فنا ہوجانا محال ہے، (کیونکہ پھر ہیئت اجتماعیہ کا نظام ایک دن کیا ایک گھڑی نہیں قائم رہ سکتا)، اس لیے اخلاقیات کے پیش نظر ہمیشہ مدارج کا سوال رہتا ہے۔ ایک زمانہ وہ ہوتا ہے، جب جذبات ہمدردی و ایثار تمامتر اپنے خاندان پر محدود ہوتے ہیں، اس کے بعد اپنی ذات یا مذہب پر پھیلتے ہیں، پھر وسیع ہو کر قوم و ملک کو اپنے دایرہ میں لیتے ہیں، یہانتک کہ چندروز میں اپنے ابنائے جنس سے گزر کر، حیوانات تک پہونچ جاتے ہیں۔ غرض ہر پچھلے دور تمدن میں اپنے پہلے دور تمدن سے معیار اخلاق مختلف ہوتا رہتا ہے، تاہم نیکی و نیک کرداری کی جانب رجحان طبعی ہمیشہ جوں کا توں رہتا ہے۔

اس حقیقت کے مسلم ہوجانے کے بعد ضمیریت پر سے اکثر اعتراضات خود بخود اُٹھ جاتے ہیں۔ مثلاً اس طرح کے اعتراضات کا جو ہم پر پیہم برسا دیا جاتا ہے، کہ وحشی قبائل میں والدین کشی کا رواج ہے، بعض متمدن اقوام میں قتل اولاد جائز ہے، اہل روما میں سیّافی[1] رائج تھی، صدیوں تک سیاسی قتل کو کسی نے ناجائز نہیں قرار دیا، غلامی مدتوں تک غیر ممنوع رہی، وغیرہ۔ سو اس طرح کے واقعات سے اس نتیجہ پر تو ہم بھی پہونچتے ہیں، کہ جو افعال ایک زمانہ میں

---

[1] یعنی تیغ زنی کا پیشہ۔

معصومانہ سمجھے جاتے ہین، وہی دوسرے زمانہ مین مجرمانہ ہوجاتے ہین، مگر ساتھ ہی ہم یہ بھی کہتے ہین، کہ اگر تحلیل وتحقیق کی جائے، تو یہ اختلاف، ہمیشہ اختلاف حالات واحوال پر مبنی نکلے گا۔ مثلاً اَرومن سیّائی کا یہ جواب ہے کہ یہ انسانی قربانی کی شکل مذہب کی مقرر کردہ تھی، یا والدین کشی کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وحشیون کی خانہ بدوش صحرائی زندگی مین معمر وضعیف والدین کو نقل وحرکت مین انتہائی تکلیف ہوتی ہے، اس لیے اُنھین قتل کرڈالنا ہی اُن کے ساتھ ہمدردی کرنا ہے، یا نظام جماعت کی تشکیل کے قبل غاصبان حکومت کے پنجہ سے رہائی پانے کا کوئی علاج ہی بجز اس کے نہ تھا کہ وہ قتل کرڈالے جائین، یا وحشیون مین جائداد مشترک ہوتی تھی، اس لیے چوری معیوب نہ تھی؛ یا اسپارٹا کے قانون مین چوری کچھ تو اس بنا پر جائز تھی کہ اس سے لوگون مین جنگی دستبرد کی قابلیت بڑھتی ہے، اور زیادہ تر اس خیال سے کہ اس سے اجتماع ثروت کا رواج مٹے، یا پھر اسی طرح جواز غلامی کی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ اس زمانہ مین جبکہ وحشی فاتحین، اپنے مفتوحون کو لازمی طور پر قتل کرڈالتے تھے، اُن کے زندہ رکھنے کی صرف یہی صورت تھی کہ اُنھین غلام بنالیا جائے۔ غرض اسی طرز پر ہر اعتراض کا جواب ہوسکتا ہے، لیکن ان تمام جوابات سے قطع نظر کرکے بھی اصل مسئلہ یہ ہے، کہ اس کا تو کوئی مدعی ہی نہین، کہ کسی خاص عہد مین جو اعمال، نیک کرداری کے مظاہر سمجھے جاتے ہین، وہ ہمیشہ ایسے ہی سمجھے گئے، یا آیندہ سمجھے جائین گے۔ ضمیریت کا جو کچھ دعویٰ ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ نیک کرداری کا جو رجحان۔ جو میلان طبعی۔ ہر نفس مین ودیعت ہے، وہ یکسان، عالمگیر وناقابل تغیر ہے۔ دوسرے ممالک، یا دوسری اقوام کے جو اعمال ہم کو وحشیانہ وظالمانہ نظر آتے ہین، دوسرون کے نزدیک وہی نیک تھے۔ یہ اپنا اپنا نقطۂ خیال، اور اپنی اپنی بصیرت ہے، مگر نیکی وانسانیت کا قابل پسند، اور بدی وظلم کا قابل ترک ہونا جیسا ہم کو مسلم ہے، ویسا ہی اُن کو بھی تھا۔

اس ضمن مین مجھے یہ بھی کہدینا ہے، کہ جو لوگ وجود ضمیر اور ارتقاء اخلاق مین تناقض

سمجھتے ہین، وہ شدید غلطی پر ہین۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہین، اُنھین دو باتون کو پیش نظر رکھنا چاہیے: اول یہ کہ اگرچہ ضمیرئین یہ اعتقاد رکھتے ہین کہ بعض اعمال قدرتاً و لازماً اعمال حسنہ ہین تاہم اسکے وہ بھی پوری طرح قایل ہین کہ اُن کے مطابق عمل کرنے کے مدارج بدلتے رہتے ہین، گویا تمدن کی ترقی کے ساتھ، معیار اخلاق مین بھی ترقی ہوتی رہتی ہے؛ دوسرے یہ کہ گو وہ افادہ و نیک کرداری کو مرادف نہین سمجھتا، تاہم اسے یہ بالکل مسلم ہے کہ افادہ و نفع رسانی نیک کرداری کی ایک خاص صفت ہے، اور اس لیے جو اعمال ہمین رفتہ رفتہ زیادہ منفعت بخش ہونے لگتے ہین، اُسی مناسبت سے ہمارے تخیل فرض مین بھی ترمیم ہوتی رہتی ہے۔

ابھی چند سطرین اُدھر، رحم و انسانیت کے متعلق مین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ پوری طرح ایک دوسری صفت حسنہ، یعنی عفت شعاری پر بھی صادق آتے ہین۔ جس زمانہ مین انسان کے جذبات مطلق العنان ہوتے ہین، ازدواج کی تعداد غیر محدود ہوتی ہے، اور ہر طرح کی شہوت پرستیان رائج ہوتی ہین، کچھ عرصہ کے بعد جب انسان اس مین اصلاح کرنا چاہتا ہے، تو اُسے یہ نظر آتا ہے کہ اس کا سرے سے انسداد ممکن ہی نہین، بلکہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس کے حدود معین کر دیے جائین۔ کیونکہ اول تو بغیر اعمال شہوانی کے نسل انسانی نہین چل سکتی اور دوسرے یہ کہ یہ جذبہ کچھ ہے ہی اس قدر قوی، کہ کچھ نہ کچھ ہمیشہ انسان کو اس کے مقابلہ مین دینا پڑے گا۔ اس بنا پر اول اول صرف یہ اصلاح ہوتی ہے کہ چند نہایت ہی قریب کے اعزہ محرمات ابدیہ قرار دیے جاتے ہین، اور ازدواج کی کوئی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے۔ اس سے اصلاح کا ایک زینہ تو طے ہو گیا، لیکن اس کے آگے ہر ملک و زمانہ مین اصلاح کی نئی نئی صورتین ظاہر ہونے لگتی ہین، اور معاشری تغیرات کے ساتھ ان مین بھی تنوع پیدا ہوتا رہتا ہے، مثلاً یہود کی قانون مین زناکاری قطعاً ممنوع ہو گئی، اور تعداد ازدواج کو ایک خاص تعداد مین محدود کر دیا گیا۔ یونان مین پہلے تو وحدت زوجی کا قانون نافذ ہوا، لیکن حالات نے اسے چلنے نہ دیا، اور اس لیے اس بارۂ خاص مین یونانیون کا معیار اخلاق

بہت ہی پست رہا۔ اور لوگ شادی کے علاوہ بھی ہر طرح کی بد چلنی کے مرتکب رہے، روما مین معیار اخلاق بہت ہی بلند رہا، وحدت زوجی پر لوگ سختی سے عامل رہے عورت کی عصمت شعاری کا مثل عیسائی قومون کے احترام ہوتا رہا۔ البتہ مردون مین شادی کے قبل کسی سے تعلق پیدا کر لینا کچھ معیوب نہ تھا، گو اسی کے ساتھ ہی امرد پرستی و زناکاری جرم قرار دی گئی تھی۔

ان تمام مثالون کے درمیان ہمین اس بارہ مین تو بے شبہ بہت بڑا فرق نظر آتا ہے کہ مختلف اقوام کس حد تک ضبط نفس پر قادر رہ سکی ہین، اور اپنے جذبات اسفل کو دبا سکی ہین۔ لیکن نفس نیکی کی جانب میلان ہونے مین سب متحد و مساوی ہین۔ کسی زبان و لٹریچر کو اٹھا کر دیکھو، کسی ملک کے رسم و رواج پر غور کرو، کسی قوم کے عادات و خصائل پر نظر کرو، سب کا نتیجہ یہ نکلے گا، کہ یہ جذبہ شہوت، فی نفسہ انسانیت کامل سے دون مرتبہ کوئی شے ہے۔ یہ اس قابل نہین کہ انسان اس پر فخر کرے، بلکہ ایسا ہے، جس پر شرم و حجاب کا پردہ پڑا رہنا ہی موزون ہے۔ اور یہ وہ نتیجہ ہے، جس کی ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے تصدیق کرے گا۔ یہی وہ احساس جبلی ہے، جو رومن کیتھولک عیسائیون سے لیکر قدیم ترین اقوام تک ہر ملک و ہر زمانہ مین اپنے تئین بہ اشکال مختلفہ ظاہر کرتا رہا ہے۔ یہودیہ، مصر، ہندوستان، تاتار، غرض جس ملک کی تاریخ اٹھا کر دیکھو، اس کے شواہد ملین گے۔ اور بعض ایشیائی اقوام مین تو اس کے متعلق عجیب عجیب افسانہ مشہور ہین، چنانچہ چاین مین یہ روایت مشہور ہے کہ جب بدو خلقت مین خدا نے ایک مرد اور ایک عورت کو اس غرض سے پیدا کیا، کہ ان سے نسل انسانی چلے، تو عورت کو اپنی دوشیزگی اس قدر محبوب تھی، کہ اُس نے اس کے تحفظ کی خاطر مرد کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اُس کا یہ انکار خدا کو بھی بہت پسند آیا، اور بالآخر اُس نے اسے عام طریق زوجیت سے مستثنی کر کے اُس مین یہ استعداد پیدا کر دی، کہ مرد کے محض نظر ملانے سے وہ حاملہ ہو گئی اسی طرح یونان مین بھی اگرچہ عملاً شہوت پرستی کی انتہائی گرم بازاری تھی تاہم دلون مین دوشیزگی کا

اس قدر احترام باقی تھا کہ معابد میں باکرہ دیویوں سے دعائیں مانگی جاتی تھیں، اور انھیں کا مندر سب سے زیادہ مقدس و معزز سمجھا جاتا تھا۔ حکما و علما، مذہب تجرد پر خاص طور سے زور دیتے تھے اور افلاطون، فیثاغورث وغیرہ نے تو اپنے نظام فلسفہ میں اسے ایک ممتاز جگہ دی ہے۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ تھریس میں صلحا کی ایک جماعت ایسی ہے، جو مجرد رہ کر قرب خدا حاصل کرنا چاہتی ہے، پلوٹارک بعض فلاسفہ کا ذکر کرتا ہے، کہ وہ ایک سال تک، شراب و عورت سے علیحدہ رہنے کا عہد کر کے عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ روما میں عموماً متاہل زندگی کی بہت قدر کی جاتی تھی، اور فرائض خانہ داری کی جانب لوگوں کو خاص ترغیب دی جاتی تھی، مگر بایں ہمہ وہاں بھی تجرد و دوشیزگی کا یہ احترام تھا، کہ جو عورتیں مذہب کے نام سے ہمیشہ کے لیے کنواری رہتی تھیں اُن سے کسی طرح کی چھیڑ کرنا قانون کی انتہائی سزاؤں کا مستوجب تھا، اُن کے وجود سے سلطنت کا دم وابستہ سمجھا جاتا تھا۔ اُن کی دعاؤں میں معجزانہ قوت خیال کی جاتی تھی، اور وہ شہر کے بعض راستوں سے اُس وقت بھی گزرنے کی مجاز تھیں جبکہ وہ راستہ بادشاہ بیگم تک کے لیے بند ہو جاتا تھا، عام خوش اعتقادی اُن میں سپیرانہ قوتوں کا وجود تسلیم کرتی تھی، قانون نے اُن کو سزائے موت سے ہر حالت میں مستثنیٰ کر دیا تھا، اور اُن کی کرامات و خرق عادات کی متعدد روایات آج تک زبان زد عام ہیں۔ آخر میں مسیحیت نے تجرد و کنوارے پن کو جو درجہ دیا ہے، اگرچہ رومن کیتھولک لوگوں نے اس میں بہت غلو سے کام لیا، اس سے متعدد جرائم و نقصانات بھی ظہور پزیر ہوئے، اور خانگی زندگی کی برکت و مسرت پر اکثر اس سے بہت مضر اثر پڑا، تاہم اس سے اتنا تو بہرحال ثابت ہوتا ہے، کہ مسیحیت نے بھی اس بارہ میں عام فطرت بشری کا بالکل صحیح اندازہ کیا۔

علاوہ بریں، یہ کہنا بھی صحیح نہیں، کہ قدیم اقوام میں، بعض جس طرح تجرد و دوشیزگی کو حسن کردار سمجھتی تھیں، اسی طرح بعض، تعدد ازدواج کو سمجھتی تھیں۔ کیونکہ کسی شی کو جائز سمجھنے اور اسے نظر تقدس و احترام سے دیکھنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی بہشت،

عیش پرستی و شہوت رانی کا بازار ہی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان عیش پرستیوں کو احترام و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہین، بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہی کہ اُن کے نزدیک دنیا دار العمل ہی اور بہشت نام ہی اُس مقام کا ہی، جہان دنیا کی نیکیون کے صلہ مین ہر طرح کے لذائذ و نعائم موجود ہین۔ اسی طرح جو قومین، اس قوت شہوت رانی کی پوجا کرتی ہین، اُن کا مدعا بھی اپنے تمام معبودون کی پرستش کرنا ہوتا ہی، اور اُس وقت اُن کے نفوس اتنے تربیت یافتہ نہین ہوئے کہ وہ اپنے معبودون کے ساتھ اخلاقی تصورات وابستہ کر سکین، بلکہ وہ صرف اُنھین مختلف قوتون کے مظاہر سمجھ کر اُن کی عبادت کرتے ہین۔ یا پھر اسی طرح جن قومون نے تجرد کو مذموم قرار دیا ہی، اُن کا مقصد بھی یہ ظاہر کرنا نہ تھا کہ تاہل بذات خود تجرد کے مقابلہ مین قابل ترجیح ہی، بلکہ اس سے ان کی غرض یہ تھی، کہ اُن کا مختصر و قلیل التعداد، قبیلہ اپنی تعداد مین اضافہ کر کے ہمسایون سے مغلوب نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہود قدیم اپنی حیات قومی کو تمام تر اپنی کثرت تعداد پر منحصر سمجھتے تھے، اور اس لیے تاہل کو ضروری جانتے تھے۔ باایںہمہ تقدس و احترام جس شی کا نام ہی، وہ ان کے یہان بھی تجرد و دوشیزگی ہی کے ساتھ وابستہ تھا۔

اس تمام نقد و بحث، توضیح و تصریح سے ناظرین کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا، کہ لاک کے زمانہ سے آج تک ضمیریت پر یہ جو اعتراض چلا آتا ہی، کہ افعال کا حسن و قبح ہر زمانہ مین متغیر ہوتا رہا ہی، وہ کس قدر بے بنیاد و بادر ہوا ہی؟ معیار اخلاق ہمیشہ بدلتا رہا ہی، لیکن نیکی کی جانب رجحان طبعی ہمیشہ یکسان و بدستور رہا ہی، یہ حقیقت ہم نے صفحات گزشتہ مین واضح کر دی، اور اُس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اعتراض بالاقطعاً ساقط ہو جاتا ہی، دراصل "بلند و پست"، "اعلیٰ و اسفل"، "شریفانہ و غیر شریفانہ"، اس طرح کے الفاظ اعمال اخلاقی کی زیادہ صحیح تعبیر کر سکتے ہین بہ مقابلہ اس کے کہ اُنھین محض نیک و بد سے موسوم کیا جائے۔ رہا یہ یہ سوال کہ افعال کا حسن و قبح، مطلق ہی یا اضافی؟ تو میرے خیال مین اس کے دونون جواب اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہین۔ بعض افعال کا پہلوے حزم اس قدر نمایان ہوتا ہی کہ وہ روز ازل ہی سے ہر شخص کی نظر مین

معیوب دکھائی دیتے ہیں، مثلاً راست بازی و دروغ گوئی کہ ان کا فرق کوئی ایسا نہیں جسے
نظر نہ آئے (یہ دوسری بات ہے کہ کوئی قوم اس پر عملدرآمد زیادہ کرتی ہے اور کوئی کم) اور بعض اعمال
کے حسن و قبح کے درمیان کوئی نوعی فرق نہیں ہوتا، بلکہ صرف تفاوت مدارج ہوتا ہے۔ یہ کام
سوسائٹی کا ہے کہ وہ بتائے کہ فلاں فعل نیک ہے اور فلاں بد، اور سوسائٹی کا یہ فیصلہ منحصر ہے اُسکے
درجہ تمدن پر۔ اب جو شخص اس سطح سے پست ہوتا ہے، وہ بدکرداریوں کا مرتکب ہوتا ہے، جو شخص
اس کے ہم سطح ہوتا ہے وہ متوسط درجہ کا اخلاق رکھتا ہے، اور جو اس سے بلند تر ہوتا ہے، اُس کا
اخلاق نہایت ہی اعلیٰ و شریفانہ ہوتا ہے۔ مذہبی پیرایہ بیان میں یوں سمجھیے کہ پہلا شخص تارک
فرائض ہے۔ دوسرا محض فرائض کا عامل ہے، اور تیسرا فرائض کے ساتھ واجبات و مستحبات کو بھی
نظر انداز نہیں ہونے دیتا۔ پہلے میں حیوانیت کا غلبہ ہوتا ہے، دوسرے میں انسانیت کا، اور
تیسرے میں ملکوتیت کا۔ اس نکتہ کے صاف ہو جانے کے بعد میرے نزدیک اس طرح کے
مباحث میں پڑنا قطعاً لاحاصل ہے کہ اسیران جنگ کا قتل، سیاہ فامی، تعدد ازدواج، فطرۃً جرائم ہیں
یا نہیں۔ آج ممکن ہے کہ یہ معاصی ہوں، لیکن جس زمانے نے ان کے جواز کا فتویٰ دیا تھا،
اُس کے نزدیک یہ معاصی نہ تھے۔ اور اس اعتراف سے ضمیریت کو مطلق صدمہ نہیں
پہونچتا۔ اُس کا دعویٰ تو بس اسی قدر ہے کہ نیکی کا رجحان ہماری فطرت میں ودیعت ہے، اور
بدکاری ابتدا سے ہماری طبیعت کے جذبات اسفل کی مظہر ہے۔

اس موقع پر ایک نازک سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ مانا ہمارے اخلاقی قویٰ کو
ہمارے ذہنی و جسمانی قویٰ پر غلبہ کا حق حاصل ہے، تو کیا یہ کسی حالت میں بھی
ممکن نہیں، کہ ہم اپنے قوائے اخلاقی کا تھوڑا سا نقصان گوارا کرکے اس کے معاوضہ میں
بڑے سے بڑے مادی منافع کو خرید کر سکیں؟ اس سوال پر فقہا و علماء مذہب مدت سے
بحث کرتے چلے آرہے ہیں، اور ایک گروہ نے تو اس کا ایسا جواب دیا ہے جس پر اگر عمل کیا
جائے تو تمدن کی ترقی و تنزل کا کیا ذکر ہے، سرے سے نظام جماعت کا قیام ہی ناممکن ہو جائے

یہ گروہ اس کا قایل ہے کہ کوئی معصیت، خواہ وہ کتنی ہی حقیر و غیر نقصان رسان ہے، اور اس کے ارتکاب سے خواہ کتنے ہی عظیم الشان فوائد حاصل ہوتے ہوں، لیکن چونکہ وہ معصیت ہے اس کا ارتکاب کسی صورت بھی جائز نہیں، خواہ اس سے اجتناب کا نتیجہ یہی کیوں نہو کہ ساری دنیا مبتلاے اذیت ہو کر فنا ہو جائے۔ گویا حیات انسانی کا مقصود اصلی حصول معصومیت ہے، اور حصول معصومیت کا طریق وحید یہ ہے کہ انسان ہر طرح کی خواہشات سے دست بردار ہو جائے۔ کیونکہ ضروریات کے دائرہ کو وسیع کرنا، لازماً ترغیبات و تحریصات میں بھی اضافہ کرنا ہے، اور یہی چیزیں محرکات معصیت ہیں۔ خواہشات کو بالکل مردہ کر دینا بھی اگرچہ اعلیٰ ترین اخلاقی زندگی کی علامت نہیں، لیکن چونکہ ایک معمولی و حقیر معصیت کا کفارہ بھی (اس جماعت کے نقطۂ خیال سے) تمام دنیا کے محاسن و منافع نہیں بن سکتے، اس لیے خواہشات کو بالکل مردہ ہی رکھنا چاہیے۔ اس خیال پر عملدرآمد کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اس پر ناظرین کو خود اپنی اپنی جگہ غور کرنا چاہیے۔ ایک بادشاہ جانتا ہے کہ اگر اس وقت جنگ نہ شروع کی گئی تو اس کی رعایا کی ساری تجارت و حرفت برباد ہوئی جاتی ہے، اور اُس کے ہاتھ سے اُس کے بہترین مقبوضات نکلے جاتے ہیں، لیکن وہ ہرگز جنگ شروع نہیں کر سکتا، کہ مبادا اثناء جنگ میں کسی سپاہی سے کسی قسم کا کوئی گناہ سرزد ہو جائے۔ اُسے معلوم ہے کہ اس وقت اگر غنیم سے مقابلہ نہ کیا گیا تو اُسے ناقابل تلافی سیاسی و مادی نقصانات پہونچیں گے، لیکن اجتماع افواج سے غالباً شہوانی بداخلاقیوں کو تحریک ہوگی، اور اس خوف سے وہ خاموش بیٹھے رہنے پر مجبور ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ ایک شدید ترین قحط یا وبا سے اس کی ساری رعایا کی جان لبوں پر آرہی ہے، لیکن وہ اپنے دل میں بیحد مسرور ہو رہا ہے کہ اس ابتلاے عظیم میں لوگوں کو گناہ کے مواقع بہت قلیل حاصل ہیں۔ تجربہ اُسے یقین دلا رہا ہے کہ شہروں کی آبادی ہر طرح کی علمی، معاشرتی، تجارتی، مادی منافع کی جان ہے، لیکن شاید اس سے کسی ایک شہری کو گناہ کی ترغیب ہو، اس اندیشہ سے وہ کوئی شہر آباد نہیں کر سکتا۔ غرض اس اصول پر اگر عمل کیا جائے تو وہ تمام ایجادات جن سے

معیشت مین سہولت پیدا ہوتی ہی، تمام اختراعات، اور تقریباً تمام فنون و صنائع ناجائز ٹھہرتے ہین، کیونکہ ان سے جو کچھ منافع ہون گے وہ مادی و دنیوی ہی ہون گے، اور ممکن ہو کہ ان سے لوگون کو ارتکاب معاصی کی تحریک ہو۔ حالانکہ تمدن کی بنیاد تمامتر ذہنی قوی کی تربیت ہی اور منافع مادی کے حصول پر ہی، چاہے اس کے لپیٹ مین ایک آدھ اصول اخلاق کا خون ہی کیون نہ ہو جائے۔

غرض یہ کہ یہ اصول ایسا تو ہی نہین جس پر پوری طرح ایک منٹ کے لیے بھی عمل کیا جا سکے۔ البتہ لوگون کے درمیان اس خیال سے متاثر ہونے کے حدود مین بہت اختلاف ہی، اور اس اختلاف سے لوگ سند پکڑ کر ضمیریت پر سخت سے سخت اعتراض کرتے ہین۔ اس عقیدہ پر جو شخص نسبتہً سب سے زیادہ عامل ہوتا ہی وہ فقیر ہی۔ یہ مان کے، کہ خفیف سے خفیف گناہ کا، بڑے سے بڑے مادی منافع بھی معاوضہ نہین بن سکتے، فقیر ترک دنیا کر کے ایک خلوت مین جا بیٹھتا ہی، اور ہمہ وقت مصروف عبادت رہا کرتا ہی۔ اپنے ہر طرح کے جذبات، خواہشات، اور اُمنگون کو وہ دبا تا ہی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ خود حیات اخلاقی مین جمود آجاتا ہی، حالانکہ حیات کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہی کہ اُس مین حرکت ہوتی رہے۔ ایسی حالت مین انسان ہر قسم کے قوت و ارادہ سے محروم ہو کر، ایک بحس و حرکت مشین کی طرح رہ جاتا ہی۔ انکسار و تواضع جس پر فقیرانہ ضابطۂ اخلاق مین اس قدر زور دیا جاتا ہی، اکثر انھین طبائع کے لیے موزون دیکھا گیا ہی، جو خود ہی پہلے سے افسردہ و مردہ دل ہوتے ہین۔

پھر اس فقیرانہ زہد و ریاضت کو تو کبھی ثبات نہین، بلکہ آئے دن اسے زوال ہی ہوتا جاتا ہی، جس سے معلوم ہوتا ہی کہ اس کی بنیادین کیسی بودی تھین۔ لیکن اس کو بھی جانے دیجیے۔ اور بہت سے مسائل پڑے ہین، ہمین تو نظر آتا ہی کہ ان سب کے بارہ مین مختلف گروہون مین شدت سے اختلاف آرا ہی۔ مثلاً

(۱) مسئلہ تعلیم ہی کو لیجیے کیتھولک نقطۂ خیال سے تعلیم کا اصل مدعا نیک کرداری کی طرف

بچون کو مائل کرنا، اور ان کے نفس سے تخم عصیان کو فنا کرنا ہے۔ برخلاف اس کے انگریزون کے یہان جو طریق تعلیم رائج ہے، اُس کا مقصود طلبہ کے تمام قواے فطری کو نشو و نما دینا، اور اُن مین دماغی بلندی پیدا کرنا ہے۔

(۲) یا اُن لوگون کے نقطہاے خیال پر نظر کیجیے، جو مروجہ مذہبی عقائد کو غلط سمجھتے ہین ایسے لوگون کی تین ٹکڑیان ہوگئی ہین، ایک گروہ، ایسے عقائد کی ہر موقع پر زور شور سے تردید کرتا ہے، اور کسی موقع پر سکوت اختیار کرنا، جرم و عصیان مین معاونت سمجھتا ہے، دوسرا فرق اس کے بالکل برعکس، ایسے عقاید کی، جو اگرچہ عقلاً غلط و مہمل ہین، تاہم عملاً اُن سے دنیا کو فائدہ پہونچ رہا ہے، خود بھی پابندی کرتا رہتا ہے، اور اُن کے ترک کو نظام اجتماعیہ موجودہ مین خلل انداز خیال کرتا ہے، تیسری جماعت ان دونون کے بین بین ہے، جو اگرچہ خود تو غیر معقول مراسم کی پابندی نہین کرتی، اور جہان کہین موقع دیکھتی ہے، علانیہ ان سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کردیتی ہے، تاہم عوام اور نافہمون کے سامنے ساکت رہنے ہی کو مفید قرار دیتی ہے۔

(۳) یا پھر صغر سنی کی شادیون کو لیجیے۔ ماہرین اقتصادیات اس پر اس لیے معترض ہین کہ اس سے مادی راحت و آرام کا معیار بہت پست ہوا جاتا ہے، برخلاف اس کے ائمۂ مذہب کیتھولک اس کے اس لیے موید ہین کہ اگر شادیان زیادہ سن مین ہوا کرین گی، تو لوگون کو زناکاری کی طرف زیادہ رغبت ہوگی۔

(۴) یا پھر آخر مین۔ اسی قبیل سے یہ مسئلہ بھی ہے، کہ اُن مشاغل لہو و لعب کو کہان تک جائز قرار دینا چاہیے، جو اگرچہ بذات خود معصیت نہین، تاہم ممکن ہے کہ اُن سے بداخلاقی کی تحریک ہو؟ اس کے جواب مین بھی تین صفین رونما ہوتی ہین۔ ایک صف مین اسکاٹ لینڈ کے پیورٹین لوگ (Puritans) ہین، جو ان چیزون کے شدید مخالف ہین۔ دوسری صف مین پیرس کے دلدادگان فیشن ہین، جن کی غذا ہی تماشہ ہین، ان کے بین بین انگریز ہین، جو اقرار و انکار کے عالم برزخ مین ہین۔

ان تمام مثالوں مین یہ ظاہر ہے کہ مختلف گروہون کے درمیان کوئی نوعی اختلاف نہین بلکہ صرف مدارج کا اختلاف ہے۔ یعنی ایسا تو کوئی بھی فریق نہین، جو ایک شے مین سرے سے معائب ہی معائب سمجھتا ہو، اور دوسرے کو اس مین محاسن ہی محاسن نظر آتے ہون۔ ہر فریق، منافع و مضار، محاسن و معایب، دونون کو تسلیم کرتا ہے، لیکن ایک پر زیادہ زور دیتا ہے، اور دوسرے پلہ کو ہلکا سمجھتا ہے۔ کوئی فریق، ایک شے کے اخلاقی پہلو کو زیادہ قابل وقعت قرار دیتا ہے، اور کوئی اُس کے مادی پہلو کو۔ اب سوال یہ ہے کہ افراط و تفریط کے درمیان کس مقام پر خطِّ اعتدال کھینچنا چاہیے؟ اور فریقانہ تعصبات کا حلقہ کس نقطہ پر پہنچکر ختم ہوتا ہے؟

ضمیرئین، اس سوال کے جواب مین خود نفس بشری کی کمزوری کا اعتراف کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ اس طرح کا خطِّ اعتدال قائم کرنا ناممکن ہے۔ حیات اخلاقی کے مختلف رنگ باہم اس قدر پیوستہ و ملتصق ہین کہ غیر محسوس طریقہ پر ایک دوسرے سے ملتے چلے جاتے ہین۔ بے شبہ، حیات انسانی کی یہ غایت ضرور ہے کہ اس کا نشو و نما قانون اخلاق کی ماتحتی مین ہوتے رہنا چاہیے، اور جس شخص مین یہ احساس نہ ہو وہ اخلاقی حیثیت سے مریض ہے، لیکن اس کے حدود بالکل غیر متعین اور سوسائٹی کے حالات کے تابع ہین، معلم اخلاق صرف عام اصول بتا سکتا ہے۔ اُن کی تفصیل یا جزئیات کی تعلیم، ہر فرد کے ذاتی افتاد طبیعت، اور سوسائٹی کے حالات پر تمام تر منحصر ہے۔

غرض اس سے انکار نہین ہوسکتا، کہ اس موقع پر ضمیرئین کو ایک حد تک اپنے عجز کا اعتراف کرنا ہوتا ہے، لیکن کیا صرف ضمیرئین کو؟ کیا اُن کے حریفون کے پاس اس سے بہتر کوئی جواب ہے؟ افادئین زور شور سے اُٹھتے ہین اور کہتے ہین کہ ہمارے قانون، نفع اکبر نے اس طرح کے ابہام و غلط فہمیون کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ہے، لیکن کیا یہ ظاہر فریب دعویٰ صحیح ہے؟ مادّی چیزون کے وزن و پیمایش کے لیے ہمارے پاس کوئی خاص پیمانہ ہوتا ہے، یا اُن کی قیمتون کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی خاص جنس مبادلہ

ہوتی ہے۔ لیکن افادئین بتائین کہ اخلاقی پہلوون کے وزن ومساحت کے لیے اُن کے پاس کون پیمانہ ہے؟ ان کی قیمت کا اندازہ کرنے کو وہ کون جنس مبادلہ رکھتے ہین؟ اور اگر نہین، تو پھر اُن کا دعویٰ کیا معنی رکھتا ہے؟ فرض کیجیے ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اخلاقی حیثیت سے نمائشین اور میلہ کہان تک جائز ہین؟ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان کے انعقاد سے نہایت عظیم الشان مادی منافع حاصل ہوتے ہین۔ تجارت کو ترقی ہوتی ہے، صنعت وحرفت کی گرم بازاری ہوتی ہے، لوگون کو تبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے، نظر مین وسعت اور خیالات مین بلندی پیدا ہوتی ہے، سیر و تفریح سے صحت جسمانی کو فائدہ پہونچتا ہے، وغیرہ۔ اس کے مقابلہ مین اخلاقی مضرات کا پہلو یہ ہے کہ مرد وزن کے اس اجتماع مین اکثر بداخلاقیون کا ارتکاب بھی ہوجاتا ہے۔ مے نوشی کو تحریک ہوتی ہے، پاے تقوے کو لغزش ہوجاتی ہے، وغیرہ۔ اب فرمائیے کہ منافع کا پلہ بھاری ہے یا مضار کا؟ غریب ضمیریت تو صاف اعتراف کرتی ہے کہ اُس کے پاس اس طرح کی کوئی ترازو نہین، لیکن افادیت سامنے آکر بتائے کہ اُس کے پاس کون سی ترازو ہے؟ کیا اس کے یہ بندھے بندھائے الفاظ، کہ "زیادہ سے زیادہ لوگون کو زیادہ سے زیادہ راحت" اُسے اس موقع پر کچھ بھی مدد دیسکتے ہین؟ پس اصول اخلاقی کی جزئیات کی تعیین سے قاصر رہنے کی مجرم جس طرح ضمیریت ہے، اُسی طرح افادیت بھی ہے۔

ہم پیشتر کہہ آئے ہین، کہ نفع وراحت کی افادئین نے دو قسمین کی ہین۔ ایک فاعل کا ذاتی نفع، جو اس کے لیے محرک افعال ہوتا ہے۔ دوسرے نفع جمہور، جو نیک کرداری کی غایت ہے۔ ان مین سے دونون کے متعلق ضمیری کو کچھ کہنا ہے، اول الذکر کے بارہ مین تو وہ یہ کہتا ہے کہ ذاتی نفع کو نیک کرداری مین کچھ دخل ہی نہین ہوسکتا۔ ایک شخص اگر نقب زنی کرنے جائے، اور راستہ مین یہ دیکھ کر کہ پولیس کا آدمی اُس کی گھات مین بیٹھا ہوا ہے، اُلٹے پاؤن واپس چلا آئے تو اخلاقی حیثیت سے اس کا نقب زنی سے یہ اجتناب کچھ بھی وزن نہین رکھتا، لیکن اگرچہ خود غرضی و نیک کرداری مین شدید تباین ہے، تاہم اس سے انکار نہین ہوسکتا کہ بعض اوقات

خود غرضانہ محرکات بھی بالآخر حیات اخلاقی پر مفید اثر ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً عذاب و ثواب، تعزیر و صلہ، کی توقعات اکثر انسان کو جادۂ مستقیم پر قائم رکھتی ہیں یا پھر جس حالت میں انسان نیکی و بدی کی راہ اختیار کرنے میں مذبذب ہوتا ہے، اگر نفع ذاتی کا خیال، نیکی کی تائید کر دے تو وہ یقیناً نیک کرداری اختیار کرے گا، اور اسی طرح متعدد مواقع کے پیش آنے کے بعد رفتہ رفتہ وہ نیک کرداری کا خوگرفتہ ہو جائے گا، اور اضطراراً اس سے اعمال حسنہ سرزد ہونے لگیں گے۔ رہا آخر الذکر یعنی نفع جمہور کا خیال، تو اس بارہ میں ضمیری کو دو باتیں گزارش کرنی ہیں۔ اول یہ کہ اگرچہ دوسروں کی نفع رسانی، نیک کرداری کی ایک صنف ہے تاہم وہ اس کے مرادف نہیں، اور گو بہت سے افعال ایسے ہوں، جو ضمناً دوسروں کے لیے مفید بھی ہوں، تاہم اُن کی نیکی اُن کی نفع رسانی پر منحصر و مشروط نہیں۔ ثانیاً یہ کہ گو بعض حالات میں ممکن ہے کہ انسان کو بعض نہایت عظیم الشان منافع کے مقابلہ میں اُن افعال سے دست بردار ہونا پڑے جو بذات خود محمود و مستحسن ہیں، مثلاً کسی بےگناہ کو پھانسی سے اُتارنے کے لیے جھوٹ بولنا، یا بعض لغو مراسم کو محض اس لیے برتے جانا کہ وہ عوام کی اخلاقی شیرازہ بندی کے ضامن ہیں، وغیرہ، لیکن ان حالات سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا، کہ فی نفسہ خیال افادہ کو نیکی پر غالب آجانے کا حق حاصل ہے۔ نیکی نیکی ہی ہے، خواہ اُسے بعض اوقات مصالح پر قربان ہی کر دینا پڑے۔ اور مصلحت بینی مصلحت بینی ہی ہے، خواہ بعض حالات اُسے نیکی پر غالب ہی کیوں نہ کر دیں۔ چاندی کے ایک من کے ڈھیر کے آگے کون شخص سونے کی ایک رتّی کی پروا کرے گا، لیکن کیا اس تقابل کا نتیجہ نکلنا چاہیے، کہ سونا فی نفسہ، چاندی کے مقابلہ میں کم قیمت یا کم وقعت ہے؟

سب سے آخر میں ضمیریت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "ایک عالمگیر فطری حاسۂ اخلاقی کا وجود مشاہدہ نے غلط ثابت کر دیا ہے، اور تلاش سے معلوم ہوا ہے کہ صدہا وحشی قبایل ایسے ہیں جن میں کسی قسم کا حس اخلاقی موجود ہی نہیں"۔ یہ اعتراض بہت آب و تاب سے پیش کیا جاتا ہے، اس کی تائید میں سیاحوں کے مشاہدات کی زبردست فوج صف آرا کی جاتی ہے، اور

سفرناموں و سیاحت ناموں کے صدہا مجلدات کھنگال ڈالے جاتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان سیاحوں کے بیانات خود ہی بہت کچھ ناقابل استناد ہیں۔ کیونکہ یہ سیاح عموماً بہت کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، وحشیوں کی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں، ان کی مدت قیام چند ہفتوں یا چند مہینوں سے زائد نہیں ہوتی، یہ اُن کی اندرونی زندگی سے جاہل مطلق ہوتے ہیں، اور یہ اپنی اخلاقی زندگی سے ان کی زندگی میں کوئی نسبت نہ پاکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اُن میں سرے سے کوئی حس اخلاقی ہے ہی نہیں۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جن قبائل کے معریٰ عن الاخلاق ہونے کی اگلے سیاحوں نے شد و مد سے شہادت دی تھی، مزید تحقیقات نے اُن کو اعلیٰ ترین اخلاق سے متصف ظاہر کیا، اور اگلوں کو اپنے بیانات واپس لینا پڑے۔ مگر خیر ہم یہ بھی فرض کیے لیتے ہیں کہ یہ بیانات سچ سہی، اور واقعی بعض وحشی قبائل معریٰ عن الاخلاق ہوتے ہیں، تو بھی اس سے ضمیریت کو کیا نقصان پہونچتا ہے؟ ضمیریت کا دعویٰ تو بس اسی قدر ہے کہ انسان میں نیکی و بدی، فضیلت و رذالت کے تمیز کی فطری استعداد موجود ہے۔ اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہر شخص میں یہ استعداد یہ صلاحیت، قوت سے فعلیت میں بھی آجاتی ہے؟ کیا یہ ناممکن ہے کہ چشم بصارت کی طرح چشم بصیرت بھی کور ہو؟ ایک تخم میں نشو و نما کی استعداد بلا شبہ موجود ہے، لیکن آپ اُسے زمین ناموافق دیتے ہیں، اور پھر اُس پر یہ الزام دھرتے ہیں کہ وہ اُگا نہیں، یہ کیا انصاف ہے؟ بعینہ یہی حال انسان کا ہے۔ اُس میں عقلی و اخلاقی نمو کی پوری قابلیت موجود ہے، لیکن اُسے ایسے حالات میں بھی تو رکھیے، جن میں اُسے اس قابلیت سے کام لینے کا موقع ملے اور اگر آپ اُسے ایسے حالات کے درمیان نہیں رکھتے تو برا ئے خدا اُس کی استعداد نمو سے تو منکر نہ ہوجیے۔ فرض کیجیے، کہ ہم کسی ایسے ملک میں پہونچے جہاں کے باشندوں کی وحشت کا یہ عالم ہے کہ اُن میں انسانیت کے ادنیٰ ترین عقلی اعمال و ذہنی ریاضتوں کا بھی پتہ نہیں چلتا، اور اپنی حیات دماغی کے لحاظ سے وہ بالکل بندروں کے ہم سطح ہیں

توکیا ہم اُنھیں انسانیت کے درجے سے نکال کر بندروں کے طبقے میں رکھ دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اُن میں خلقیت کی استعداد تو موجود ہی، اب تک اُس سے اُنھوں نے کام نہیں لیا نہ سہی، حالانکہ بندروں میں تو اس کی استعداد ہی سرے سے موجود نہیں۔ اسی پر حیات اخلاقی کو قیاس کرنا چاہیے۔ مانا کہ بعض وحشی قبائل کی عملی زندگی میں اس وقت تک احساسات اخلاقی کی کوئی ظاہری علامت نہیں پائی گئی، لیکن اس سے حیات اخلاقی کی صلاحیت و استعداد سے انکار کیونکر درست ہوسکتا ہی؟ اور اگر آپ اس سے منکر نہیں، تو ضمیریت کے دائرہ سے بھی خارج نہیں۔

فصل (۸)

ضمیریت و افادیت کا تعلق سطح تمدن کے ساتھ

صفحات گزشتہ کے مطالعہ سے ناظرین کو یہ معلوم ہوچکا، کہ اخلاق کے دو مذاہب ضمیریت وافادیت، کے درمیان سخت اختلاف ہی، مگر انھیں یہ بتا نا رہ گیا تھا، کہ یہ اختلاف بجائے خود مستقل نہیں، بلکہ تابع ہی، دو مذاہب فلسفہ کے باہمی اختلاف کے۔ یہ مسئلہ کہ ہمارے تصورات اخلاقی کا ماخذ کیا ہی، دراصل تفریع ہی اس مسئلہ کی، کہ ہمارے تصورات و افکار، بحیثیت مجموعی، کہاں سے ماخوذ ہوتے ہیں؟ آیا تمام تر تجربہ و حواس سے یا خود وجدان و نفس کی اندرونی قوت سے بھی؟ فلاطون نے شق آخرالذکر اختیار کی تھی، اُس نے کہا تھا کہ اس عالم مادی کے پرے ایک عالم مثال ہی، اور اسی کا عکس و پرتو اس عالم مادی میں نظر آتا ہی۔ سترھویں صدی عیسوی میں خفیف رد و بدل کے بعد اس نظریہ کو لارڈ ہربرٹ آف چربری نے اختیار کیا، اور لاک نے اس پر پرزور حملے کیے۔ آج یہ مذہب گو اپنی اصلی صورت میں ناپید ہی، تاہم جبلت حیوانی کے متعلق حال میں جو تحقیقات ہوئی ہی، اُس نے اس خیال کو تقویت دی ہی

کہ نفس میں بعض قوتیں ایسی موجود ہیں، جو حواس ظاہری کی مدد سے نہیں، بلکہ خود اپنے بل پر علم حاصل کرتی ہیں اور یہ خیال بھی اسی مذہب قدیم کی ایک مسخ شدہ صورت ہے۔ شفٹسبری ولانیبڑ اس مذہب کے پرجوش وکیل ہوئے ہیں۔ کینٹ نے صراحت کے ساتھ اور برکلی نے دبی زبان سے اس کا اقرار کیا ہے۔ اور تو اور خود لاک صاحب تک کہیں کہیں اپنے مخالفین کی بولی بول گئے ہیں۔ نفس میں اس قوت کا وجود، عرصہ سے حکماء یورپ کی طبع آزمائیوں کا جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ جس میں ایک فریق انگلستان و فرانس کے استقرائیین ہیں، اور دوسری جانب جرمنی واسکاٹ لینڈ کے وجدانیین ہیں۔ پہلا گروہ تمام انسانی معلومات کو محسوسات سے ماخوذ بتاتا ہے، اور کہتا ہے کہ اعمال نفسی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں، جسکی تحلیل حس و تجربہ تک نہ ہوسکتی ہو۔ دوسرا فریق، اس کے مقابلہ میں نفس کے جبلی و فطری پہلو پر زور دیتا ہے، اور دعوے کرتا ہے کہ حیات نفسی کے بہت سے مظاہر ایسے ہیں، جو محسوسات کی مدد سے مستغنی اور صرف نفس کی فطری واندرونی قوت کے محتاج ہیں۔

ان میں سے مذہب اول الذکر یعنی تجربیت، کا تعلق افادیت کے ساتھ آج سے نہیں مدت سے چلا آتا ہے۔ ارسطو جو تجربیت کا معلم اول ہوا ہے، افادیت کا بھی زبردست وکیل ہوا ہے۔ ارسطو کی تعلیمات، ازمنہ وسطی میں پھیلتی رہیں، اور وہیں سے لاک نے اخذ کیں، لاک اور اس کے معاصرین کی تحریروں میں تو پھر بھی کہیں کہیں ابہام و تناقض ہے، لیکن متاخرین نے اس گتھی کو بالکل سلجھا دیا۔ ایک صدی ڈیڑھ صدی ادھر جب سے کانڈلک اور اس کے اتباع کے ہاتھ میں امامت تجربیت کی باگ آئی، یہ مسئلہ بالکل واضح و غیر مشتبہ ہو گیا، کہ افادیت و تجربیت میں، اور ضمیریت و وجدانیت و مثل میں چولی دامن کا ساتھ ہے، یعنی ایک کی حمایت کیجیے تو دوسرے کی بھی تائید ہوگی، اور اس پر حملہ کیجیے تو اس کی بھی خیر نہیں۔

فلسفہ جدید کے بانی اول، بیکن اور فلسفہ قدیم کے مدون اول، سقراط کی کوششوں کے درمیان عجب قسم کا تشابہ و تضاد ہے۔ جس طرح، حیثیت افادی پر زور دیگر سقراط نے قدما کی

توجہ فلکیات و وجودیات وغیرہ کے دوراز کار مباحث سے ہٹا کر اخلاقیات کی جانب مبذول کردی تھی اسی طرح بیکن نے بھی اپنے معاصرین کا رخ الہیات سے علوم طبیعی کی طرف پھیر دیا۔ ادھر تازہ آلات کے اختراع اور جدید طریق تفتیش کے انکشاف نے بھی بیکن کی ایسی تائید کی کہ اسکی کوششوں کے نتائج نے مستقل طور پر جڑ پکڑ لی۔ قدما کی بیداری و دماغی جدوجہد پر ایک مستمر تلون طاری رہتا تھا اس لیے یونان کا آج ترقی ہے تو کل تنزل ایک قوم کا آفتاب حکمت نصف النہار پر ہے لیکن کل اس پر وحشیوں کا حملہ ہوا اور فضل و کمال علم و تمدن کا چراغ دفعۃً گل ہو گیا۔ پھر قوم اپنے اخلاف کے لیے ترکہ چھوڑ مر جاتی تھی لیکن اس ترکہ کی کوئی مادی شکل تو ہوتی نہ تھی محض خیالات و افکار کا مجموعہ ہوتا تھا اور اس لیے اس کے دوام کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی تھی۔ بخلاف اسکے زمانہ حال کی شاہراہ ترقی بالکل صاف ہے۔ آلات ایک ایسی شے ہیں جو ایک مرتبہ اختراع ہو کر پھر غائب نہیں ہو سکتے مطبع کی ایجاد نے علوم کو فنا ہونے سے امن کر دیا ہے ریل و جہاز نے مشرق کے ڈانڈے مغرب سے ملا دیے ہیں اور صنعتی ترقیوں و صنعتی کمالات نے آدمی سامان راحت کا دریا بہا دیا ہے۔

اب جو لوگ نفس بشری کے طریق کار سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ تین چیزیں یعنی علوم طبیعی کا مطالعہ قوت اختراع اور صنعتی ترقی ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتی ہیں۔ کیونکہ قطع نظر اسکے کہ قوانین طبعی سے واقفیت از خود اختراعات کا سبب بنتی ہے اور انکی صنعتی ترقیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں خود نفس بشری کی ساخت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ یہ تینوں چیزیں اس میں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں یہ تینوں چیزیں انسان کی اس قوت کی مظہر ہیں جسے قوت عملی کہنا چاہیے اور جسکا تعلق کلیتہً مادیت سے ہے۔ بخلاف اس کے قدما جن چیزوں میں مصروف رہتے تھے وہ علوم نظری تھے یعنی جن کا مقصد محض غور و فکر و تخیل رہی یا دوسرے مختلف خیالی نظریات تعمیر کرنا تھا۔ اس تغیر حالات کا ایک اہم نمایاں نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ تمدن قدیم تمدن سے بہ مراحل آگے بڑھ آیا۔ گو جدید علمی انکشافات

کی گرد کو بھی قدما نہین پہونچتے۔ تاہم مادیت و محسوسات پرستی آج ہر شے پر چھا گئی ہے۔ جو دماغ ہر وقت خواص مادہ کی تحقیق و تفتیش مین مشغول رہتے ہین، وہ اگر اخلاق مین بھی انھین نظریات کو خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ رہتے ہون جن سے اُن کی مادیت کو تقویت پہونچتی ہو، تو مطلق حیرت نہ کرنا چاہیے۔

اس اقتضاے حالات کا، اخلاقیات پر ایک اور نمایان اثر یہ پڑا ہے کہ مختلف مذاہب اخلاقیات مین عملاً اُس قدر تخالف و تضاد نہین باقی رہا، جتنا اُن کی نظری تعلیمات و اصول کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ آج کل کے حکماء اخلاق، گوشۂ عزلت مین تو بیٹھتے نہین، ہر وقت سوسائٹی مین ملتے جلتے رہتے ہین، اور اس لیے اپنے سے مختلف الخیال لوگون کے حاسات و جذبات سے پوری طرح واقف ہوتے ہین۔ اس سے اُن مین ایک طرح کی خاص رواداری آجاتی ہے، وہ دوسرون کے حاسات کو بھی واقعیت پر مبنی تسلیم کرنے لگتے ہین، البتہ ساتھ ہی یہ کوشش بھی رکھتے ہین، کہ اپنے اصول کی ماتحتی مین مخالفین کے نظریات کو بھی ڈھال لین۔ ایک طرف تو یہ صورت واقعہ ہے۔ دوسری جانب مختلف نظریات اخلاق کی یہ ایک طبعی خصوصیت ہے کہ وہ خاص خاص محاسن اخلاق کی مزید ترویج کا باعث بنتے ہین۔ مثلاً رواقیت کا اس کا سنگ بنیاد ضبط نفس ہے، جانبازی و ایثار پر خاص طور سے زور دیتی ہے؛ یا مذہب ہچیسن، کہ نیکی کو فیاضی کا مرادف قرار دیتا ہے، لطیف و نازک فضائل اخلاق کی اشاعت کی تحریک کرتا ہے، یا افادیت، ایسے اوصاف کو زیادہ فروغ دیتی ہے جو حرفتی و اقتصادی کمالات کا ذریعہ ہین۔ پس جس سوسائٹی مین یہ تینون مذاہب پہلو بہ پہلو موجود ہونگے، وہان ہر قسم کے محاسن اخلاق کو ترقی ہوگی۔ چنانچہ ماضی مین رواقیہ و لذتیہ اسی طرح ایک دوسرے کے مصلح و متمم کا کام دیتے تھے۔ ان حالات کی بنا پر، تمدن جدید مین ضمیریت و افادیت کے تصادم کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ دونون ایک دوسرے کے معین و مصلح ہین۔ ضمیریت، افراد کے شخصی حاسۂ اخلاقی کو مرکز قرار دیکر اُن کا معیار اخلاق بلند کرتی ہے اور افادیت ماحول کے

اثرات کو مقدم شے قرار دیکر طرح طرح کی اصلاحات کا باعث بنتی ہے۔ اور اس طرح عام ہیئت اجتماعی کے حق مین دونون کا وجود باعث رحمت ہے خرابی صرف اس وقت پیدا ہوسکتی ہے، جب ایک فریق تمام تر اپنے ہی اصول پر زور دیکر اپنے حریف کی صداقتون کی طرف سے بھی چشم پوشی کرلیتا ہے۔

یہان تک اُن نظریات کی ماہیت کا ذکر تھا جنھین لوگ اپنے حاسات اخلاقی کا معیار سمجھتے، اور جن کے مطابق وہ انھین ڈھالتے ہین۔ اب یہ دیکھنا ہے، کہ وہ کیا کیا اسباب ہین، جن کی بناپر سطح اخلاقی بلند ہوتی رہتی ہے، اور قوم کا رجحان کن مخصوص فضائل اخلاق کی جانب ہوتا رہتا ہے۔ مین یہان جو کچھ کہونگا، وہ صرف اصولی حیثیت سے کہونگا، اور ان اصولون کو عملاً چسپان آیندہ ابواب مین کرون گا۔

یہ ایک بالکل غیر مخفی حقیقت ہے کہ ہیئت اجتماعی جون جون زیادہ مہذب و متمدن ہوتی جاتی ہے، اُسی نسبت سے وہ فضائل اخلاق جو مردانگی و رہبانیت سے متعلق ہوتے ہین، پست ہوتے جاتے ہین، اور وہ جن کا تعلق لطافت، لینت و محبت سے ہوتا ہے، ترقی پاتے جاتے ہین۔ انسانی فضیلتون کا اول ترین مظہر غالباً تحمل شدائد ہے جس کے اظہار کا وحشیانہ زندگی مین ہر ہر قدم پہ موقع رہتا ہے، اور جسے وہ لوگ دلیل فضیلت سمجھتے ہین۔ ہیئت اجتماعی جب تک ایک غیر مہذب و غیر متمدن حالت مین رہتی ہے، اس قسم کے واقعات بہت عام رہتے ہین، لیکن جون جون اس مین تنظیم و تہذیب آتی جاتی ہے، اس صنعت کے اظہار کے مواقع شاذ ہوتے جاتے ہین اور تمدن کی ترقی کے ساتھ جو جو آلات و ایجادات پیدا ہوتے جاتے ہین، وہ طبائع کو بجائے جفاکشی و تحمل شدائد کے آرام و سہولت کا خوگر کرتے رہتے ہین، اور اس طرح انسان کو لازمی طور پر

تو آسانی میں زیادہ مزہ آنے لگتا ہے۔ پھر وحشیانہ زندگی میں جس آسانی کے ساتھ ترکِ دنیا، گوشہ نشینی و رہبانیت ممکن ہے، وہ سوسائٹی کے جنجال میں پھنس جانے کے بعد، کیونکر ممکن رہ سکتی ہے۔ جب ہر شخص کسی نہ کسی تجارتی و کاروباری جال میں جکڑا ہوا ہوتا ہے، جب تخیلِ زر مطمحِ نظر بن جاتا ہے، جب تمدن زائیدہ سہولتیں اور آسانیاں ہر شخص کا قبلۂ مقصود بن جاتی ہیں، اور جب خود قانون "جواز و عدم جواز" کا معیار کسی شے کے حق و باطل ہونے کو نہیں، بلکہ محض اس کی حیثیتِ افادی کو قرار دے دیتا ہے، تو یہ تمام صورتِ حالات بدل جاتی ہے۔ ان حالات کے درمیان نفس کشی، تقشف، تحملِ شدائد کی طرف نہ کسی کی توجہ رہ جاتی ہے، اور نہ زہد و قناعت کچھ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

اسی کے پہلو بہ پہلو ترقیِ تمدن کے یہ بھی عوارض ہوتے ہیں کہ انتقام گیری کی قوت افراد کے ہاتھ سے نکل کر حاکمِ عدالت کے ہاتھ میں آ جاتی ہے، جو جذبات سے علیحدہ ہو کر محض شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر کرتا ہے، عام جنگیں اور روزانہ کشت و خون کے بجائے قوم کے مشاغل پُرامن ہو جاتے ہیں، مذاق میں بجائے وحشت و درشتی کے ایک لطافت و نفاست آ جاتی ہے، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تعلیم کی اشاعت کے باعث قوتِ تخیل نہایت قوی ہو جاتی ہے۔ یہی قوتِ تخیل درحقیقت ہمارے قوائے اخلاقی و ذہنی کے درمیان رابطہ کا کام دیتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہم دوسروں کے دکھ سے سخت متاثر ہونے سے ناآشنا رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ہم جتنا زیادہ کسی مصیبت زدہ کے دکھ درد کا اپنے تخیل میں احساس کر سکیں گے، اسی نسبت سے ہم اس کے ساتھ زیادہ ہمدردی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اسی تخیل کے عمل کا نتیجہ ہے کہ ہم سے

ہزاروں کوس کے فاصلے پر اگر کسی کو کوئی عالمگیر مصیبت، مثلاً کسی بڑے زلزلے، کسی عظیم الشان سیلاب، کسی وسیع آتش زدگی کی واردات پیش آجاتی ہے، تو ہم اس سے اتنا اثر قبول نہیں کرتے جتنا اپنے گرد و پیش کے کسی فردِ واحد کی ہولناک موت سے۔ اور یہ اسی تخیلہ کی کرشمہ سازی ہے کہ ہم مشاہیر افراد کی، جن کی زندگی کا ایک ایک خط و خال ہمارے پیش نظر ہوتا ہے، ہر چھوٹی مصیبت پر اشک افشانی و سینہ کوبی کو تیار ہو جاتے ہیں، بخلاف اس کے بڑی بڑی جماعات کی مظلومیت و ستم رسیدگی، جن کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے بالکل دھندلا ہوتا ہے، انھیں متاثر کرنے میں بالکل ناکام رہتے ہیں۔ سکندر اعظم آج مشاہیر رجال عالم کا سرتاج ہے اس کی سوانح زندگی کا ایک ایک حرف ہمیں نوک زبان ہے۔ لیکن کتنے ایسے ہیں جن کو یہ یاد ہوگا کہ یہ وہی شقی و ظالم ہے کہ جس نے تیس ہزار آزاد انسانی ہستیوں کو غلام بنا کر فروخت کیا، اور تائر میں ۸۰۰۰ نفوس بشری کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا؟ جولیس سیزر کی شہرت و عظمت کے افسانے ہمیں ازبر ہیں، لیکن کیا کسی کو یہ بھی یاد ہے کہ اس کی شہرت کا منارہ گیارہ لاکھ انسانی ہستیوں کے قطع شدہ سروں پر قائم ہے؟ ہم جب یہ سنتے ہیں کہ نپولین اعظم پر قید میں یہ سختیاں ہوتی تھیں، تو ہم میں سے ہر شخص آبدیدہ ہو جاتا ہے لیکن کیا کسی نے ان ہزاروں لاکھوں مظلوموں کی حالت پر بھی کبھی توجہ کیا ہے جن کو اس کی ہوس ملک گیری نے یتیم بنا دیا، بیوہ کر دیا، اور بے خانماں کر ڈالا۔ تیمور، یزید و چنگیز کو ہماری قوت تخیلہ دنیا کے اعاظم رجال میں شمار کرتی ہے لیکن جو بے شمار انسانی جانیں ان کے ظلم و ستم کے ہاتھوں ضائع ہوئیں، ان کا بھولے سے بھی کوئی خیال

نہیں کرتا۔

غرض ہمارے رحم، ہمدردی و خداترسی کے جذبات، متخیلہ کے تمامتر تابع ہوتے ہین۔ اور جب اس حقیقت کے ساتھ ہم یہ مقدمہ ملاتے ہین کہ تعلیم سے تخیل کو ترقی ہوتی ہے، تو یہ لازم آتا ہے کہ تعلیم و شایستگی کی اشاعت کے ساتھ جذبات مذکور بھی پھیلتے رہین۔ اور یہ وہ نتیجہ ہے جس کی تصدیق مشاہدۂ ہم روزانہ کرتے رہتے ہین ایک جاہل شخص بجز اپنے ذاتی معاملات کے دنیا کے کسی کاروبار سے سروکار نہین رکھتا۔ دوسرے ملک، دوسرے مذہب، دوسرے طبقے کے لوگ اُس کے لیے بالکل غیر ہین۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ شخص، اس کے مقابلے ہین، دور دراز ممالک و غیر اقوام کے معاملات و حالات مین بھی پوری دلچسپی لیتا ہے۔ اُسکی زندگی محض اُس کے مادّی ماحول قریبہ پر محدود نہین رہتی، بلکہ جب وہ کسی اخبار یا کتاب مین کسی غیر ملک کے متعلق کچھ پڑھنے لگتا ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت وہین ہے۔ تخیل کی مدد سے وہ اس طرح بعدِ زمانی و مکانی کو مٹا سکتا ہے۔ چنانچہ متمدن و شایستہ جماعات کے افراد کے احساسات جو لطیف و نازک ہوجاتے ہین، اور وہ لوگ ظلم کے خفیف سے خفیف تصور سے جو جھجک اُٹھتے ہین۔ اُس کا ایک سبب یہی ہے۔

یہان ظلم کا لفظ تشریح طلب ہے۔ یہ لفظ دو مختلف مفہومات پر دلالت کرتا ہے۔ ایک ظلم وہ ہے جو شقاوت و بے دردی سے پیدا ہوتا ہے، اور دوسرا وہ جو انتقام پرستی و کینہ پروری سے۔ اول الذکر زیادہ تر سخت گیر، تندخو، جنگ جو و فاتح اقوام کے درمیان، اور معتدل آب وہوا کے باشندون مین پایا جاتا ہے، اور اس کا سبب عموماً متخیلہ کی کمی ہوتا ہے۔ دوسرے قسم کے ظلم مین ایک طرح کی زنانی جھجک پائی جاتی ہے، اور یہ علی العموم اُن جماعتون مین پایا جاتا ہے، جو گرم

ممالک میں رہتی، مدت سے مظلوم چلی آتی، اور مغلوب الجذبات ہوتی ہیں۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کینہ پروری و لطیف الاحساسی، اور شقاوت و شریف المزاجی کا ساتھ رہا ہے، لیکن کینہ پروری و شرافت، اور لطافت و شقاوت کا اجتماع شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ قدیم اہل رومہ میں انتہائی شقاوت و سنگ دلی کے ساتھ شرافت و نیک نفسی تھی، بہ خلاف اس کے موجودہ باشندگان اٹلی میں کینہ پروری و انتقام گیری کے ساتھ ذکی الحسی و لطافت مجتمع ہے۔ ظلم کے یہ اصناف دوگانہ میرے نزدیک ترقی تمدن کے ساتھ مختلف اسباب سے، اور مختلف مدارج میں، دفع ہوتے جاتے ہیں۔ مثلاً شقاوت تو اس لیے دفع ہوتی ہے کہ تخئیل میں شایستگی و نفاست آتی جاتی ہے، اور کینہ پروری میں اسلیے ضعف آجاتا ہے، کہ انفرادی طریق انتقام گیری کے بجاے عدالتیں قائم ہوجاتی ہیں۔

یہی قوت متصورہ، جس کی بنا پر ہم دوسروں کے دُکھ درد کی ذہنی تصویر قائم کرسکتے ہیں، ہمیں اس قابل بھی بناتی ہے کہ ہم دوسروں کے خیالات و آراء کو بھی پوری طرح سمجھ سکیں، اور اس سے لامحالہ ہم میں رواداری پیدا ہوتی ہے۔ فریقانہ تعصب و مغایرت کا، جو اکثر منافرت تک پہنچ جاتی ہے، اصلی باعث یہ ہوتا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کے نقطۂ خیال پر پوری طرح عبور نہیں حاصل کرتا۔ وہ ہمیشہ اُس اسپرٹ، اُس رُوح، سے نابلد رہتا ہے جو اس کے مخالفین کی ہوتی ہے اور یہیں سے عدم مسالمت و عدم رواداری کی بنیاد پڑتی ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کی فضائے دماغی نہایت وسیع ہوجائے اور اُسے دوسروں کے ساتھ ایک ذہنی ہمدردی حاصل ہوجائے تو خود بخود اس سے وسیع المشربی و رواداری لازم آجائے گی پھر یہی سبب عموماً اس نفرت کا بھی ہوتا ہے، جو ہمیں مجرموں سے ہوتی ہے۔ دوسرے

کو ارتکاب جرم کرتے ہوئے ہم سب دیکھتے ہیں، لیکن جو حالات ذہنی اُس ارتکاب جرم کے باعث ہوئے، اُن پر شاذ و نادر ہی کسی کی نظر پڑتی ہے۔ کتنے اہل اتقا ایسے ہیں، جو کسی شراب خوار، کسی زانی، کسی قاتل کی دماغی حالت کا صحیح تصور کر سکتے ہیں؟ ہم کسی سخت مجرم کا حال سُن کر بے اختیار مجرم کو بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں، لیکن اسے کبھی تصور میں نہیں لاتے کہ اس بیچارے نے کن شدید جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی حرکت کی ہوگی، یا یہ کہ اُس کی ناقص تربیت اُس کی اس بداخلاقی کی کہاں تک ذمہ دار ہے۔ اور تو اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم خود اپنے ہی گذشتہ افعال کے حق میں سخت نامنصفانہ فیصلہ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک ضعیف العمر شخص اپنی نوجوانی کے افعال پر سخت افسوس کرتا نظر آتا ہے، حالانکہ اس وقت گو اُسے وہ افعال یاد رہتے ہیں، تاہم وہ اُن حالات و جذبات کو جو اُن کے محرک ہوئے تھے، بالکل بھول گیا ہے۔ پس اگر اب ایک پاکباز شخص کو کسی مجرم سے سخت متنفر و بیزار پاتے ہیں تو اسے اول الذکر کی معصومیت و اتقا کی اس قدر واضح دلیل نہ سمجھنا چاہیے جتنا کہ اس کی قوت متصورہ کی کمزوری کی، جس کے باعث وہ مجرم کے مخصوص حالات و جذبات کو اپنے احاطہ تخیل میں لا ہی نہیں سکتا۔ اب چونکہ کسی شخص کی قوت متصورہ کامل و محیط نہیں ہو سکتی، اس لیے رواداری کامل تو صرف وہ ذات مطلق ہی رکھ سکتی ہے جو ہر فرد کے مقامی و زمانی خصوصیات کو حلقہ تصور میں لا سکتی ہو۔ البتہ جوں جوں انسان کی قوت متصورہ وسیع ہوتی جاتی ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ آدمی کس حد تک مجبور واقع ہوا ہے، اور تشکیل سیرت میں کہاں تک حالات کو دخل ہے، اس سے غلو و تعصب ہلکا پڑتا جاتا ہے اور رواداری و مسالمت بڑھتی جاتی ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھائیے۔ یہ قوت متصورہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اپنے

ابتدائی مدارج مین صرف مادیات و محسوسات تک محدود رہتی ہے، اور مجردات پر حاوی نہین ہوتی، مجردات تک وہ رفتہ رفتہ ایک مدت ہی کی ترقی کے بعد محیط ہو سکتی ہے، کتابت کی ابتداء پیرو نقالات یا خط تصویر کشی سے ہوئی، عبادت کی ابتدا بُت پرستی سے ہوئی، خطابت کی ابتدا استعارہ سے ہوئی، فلسفہ کی ابتدا افسانہ سے ہوئی، غرض یہ کہ تخئیل ہر شعبہ مین مادیات و محسوسات سے شروع ہوتی ہے، اور بتدریج مجردات و افکار تک پہونچتی ہے۔ یہ جو ارتقاء دماغی کے متوازی ارتقاء اخلاقی کے تین مشہور مدارج کیے جاتے ہین یعنی بادشاہ پرستی، وطن پرستی، اور انسانیت پرستی، میرے نزدیک یہ تینون، اُن ادوار کے بالکل مماثل ہین جو تاریخ مذہب کی منازل ثلثہ قرار دی جاتی ہین، یعنی بت پرستی کلمہ گوئی، اور اخلاقی ہمہ سطحی

ناظرین کو یہ فراموش کرنا چاہیے کہ یہ جو کچھ کلیات بیان کیے جا رہے ہین، یہ صرف ایک تقریبی یا تخمینی حیثیت سے صحیح کہے جا سکتے ہین، درحقیقت ارتقاء اخلاقی کے قوانین بمثل قوانین آب و ہوا کے ہین، ہم خط استوا کو مرکزی خط مان کر کچھ کلیات قائم کرتے ہین، کہ جو ملک اس کے قریب ہوئے تو آب و ہوا اس طرح کی ہوگی اور اگر اس سے فاصلہ پر ہوے تو اس طرح کی ہوگی، اور علی العموم یہ کلیات صحیح ثابت ہوتے ہین، تاہم کہین کہین بعض اتفاقی اسباب ایسے پیش آجاتے ہین، جو ان مین ترمیم کر دیتے ہین، مثلاً پہاڑ یا سمندر کا قرب، زمین کی بلندی وغیرہ۔ بعینہ یہی حال قوانین متعلقہ تاریخ اخلاق کا ہے۔ یعنی جو قوانین اساسی ہوتے ہین، اُن مین متعدد عوامل مختص المقام و مختص الوقت، مثلاً جغرافیانہ خصوصیات، مذہبی نظامات، سیاسی آئین وغیرہ، ارتقاء اخلاق کے خط مستقیم کو جا بجا سے کج کر دیتے ہین لیکن اس سے اس حقیقت پر کچھ اثر نہین پڑتا، کہ اخلاق کی ایک تاریخ طبعی کا وجود ہے۔ ارتقاء اخلاق ایک خاص نہج و اسلوب پر ہو رہا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر، بعض محاسن اخلاق ایسے ہین، جو غیر متمدن جماعات سے عقلی مقتضیات کے لحاظ سے از خود پیدا ہوتے ہین، اور بعض ایسے ہین جو متمدن و شایستہ جماعات کے ساتھ مخصوص ہین۔ غیر متمدن جماعات کے محاسن اخلاق کو متمدن جماعات

محاسن تو صرف تسلیم کرتی ہین، لیکن نہ اُن پر زیادہ زور دیتی ہین اور نہ اُن کے اظہار کا اُن کے درمیان زیادہ موقع ہوتا ہو۔ اس طرح کے فضائل کی نمایان مثالین ہمارے خیال مین حسب ذیل ہو سکتی ہین، ایثار نفس انحطاط، فیاضی و ہمدردی کی اشاعت، اور بادشاہ پرستی کے بجاے حریت و حب وطن کا استیلا۔

ایک اور اخلاقی وصف، جسے تمدن کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہتی ہو، راستبازی ہو۔ راستبازی سے یہی مراد نہین، کہ انسان دیدہ و دانستہ غلط بیانی سے پرہیز کرے، بلکہ واقعات کو بے کم و کاست بغیر سعی انتشار روایت کرنا، اور کسی شے کو جبتک اس کی صحت و واقعیت کی طرف سے پوری تحقیق کے ساتھ اطمینان نہ ہو جائے، بیان نہ کرنا، یہ سب راستبازی کے مفہوم مین داخل ہو۔ راستبازی کی غالباً اولین صورت جس پر اکثر قدیم مذاہب مین زور دیا گیا ہو، سچا حلف اٹھانا ہو، اس کے بعد رفتہ رفتہ ارتقاء کے اثر سے آج اس کی تین صورتین نمودار ہو گئی ہین، ایک تجارتی راستبازی، دوسری سیاسی تیسری عقلی یا دماغی۔ تجارتی راستبازی سے مراد معاملات کی صفائی اور بات کی پختگی سے ہو، بات کی آن بان اگرچہ ایک حد تک ایک سپاہیانہ خصوصیت بھی ہو، لیکن اس کا دار و مدار زیادہ تر کاروبار کے پھیلاؤ پر ہو، کیونکہ گو بعض مواقع پر تجارت پیشہ اشخاص کو خیانت کی خاص تحریک ہوتی ہو، تاہم یہ قطعی ہو کہ کاروباری زندگی کی بنیاد ساکھ پر ہو، اور اگر اعتماد باہمی و دیانت داری سے کام نہ لیا جائے، تو کاروباری زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہو، اسی بنا پر کاروباری ترقی کے ساتھ دیانت داری کی اس صنف کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہو۔ تاآنکہ رفتہ رفتہ راستبازی، اخلاق کا سب سے زیادہ جلی عنوان قرار دے لی جاتی ہو، اور اسی معیار پر انسانی سیرت کی خوبی و زشتی کا فیصلہ کیا جاتا ہو۔ اور یہ صرف نظری حیثیت تک محدود نہین رہتا، بلکہ اس پر عملدرآمد کی بھی پوری کوشش کی جاتی ہو، چنانچہ یورپ کی جن قومون مین تجارتی کاروبار کو زیادہ فروغ ہو، وہ اس صنف اخلاق مین، اہل اٹلی، اہل اسپین

واہل آیرلینڈ پر علانیہ فوق رکھتے ہین ان آخر الذکر جماعتون کے خصایص یہ ہوتے ہین کہ ان کے افراد وعدہ کی پابندی نہین کرتے، گفتگو مین مبالغہ کو معیوب نہین خیال کرتے، اور خفیف بددیانتی کو جائز رکھتے ہین، انگریز عموماً ان کی یہ حالت دیکھ کر یہ نتیجہ نکالتے ہین، کہ یہ جماعات اخلاق سے معریٰ ہین، لیکن یہ نتیجہ صحیح نہین۔ زیادہ تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی مین کاروباری اسپرٹ پیدا ہی نہین ہوئی، اور اس لیے یہ لوگ اس طرح کی ناراستیون کو کوئی اخلاقی جرم ہی نہین سمجھتے۔ ورنہ انھین جماعتون مین بہ کثرت ایسے افراد ملتے ہین، جو پاکیزگی اخلاق کے بہتر سے بہتر نمونے ہوتے ہین جن کی زندگی نفس کشی، ایثار کی تصویر ہوتی ہے، جن کے خمیر مین ہمدردی و فیاضی داخل ہوتی ہے، جن کے مذہبی معتقدات کو دنیا کی بڑی سے بڑی طمع یا بڑے سے بڑا خوف متزلزل نہین کرسکتا، اور صبر و قناعت جن کی سرشت کا جزو ہوتا ہے، لیکن بااینہمہ انھین ناراستی و بددیانتی مین مطلق تامل نہین ہوتا۔

کاروباری راستبازی ہی وہ صورت وحیدہ ہے جس مین صنعت وحرفت کی ترقی، ارتقاء اخلاق پر مفید اثر ڈالتی ہے لیکن سیاسی راستبازی سے اس کا کوئی تلازم نہین یعنے یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی جماعت مین تجارتی دیانت داری تو پوری طرح موجود ہو لیکن یہ نہ پایا جاتا ہو کہ امور مابہ النزاع مین مخالفین کے دلائل، شواہد و آرا کا ذکر انصاف وصفائی کے ساتھ کیا جائے۔ یہ وصف صرف آزاد جماعتون مین پایا جاتا ہے، اور اس کی اشاعت سیاسی زندگی ہی کے سبب سے ہوتی ہے بحث و مباحثہ کے خوگر ہو جانے سے افراد مین یہ احساس پیدا ہوجاتا ہے کہ فریق ثانی کے نقطۂ نظر کو مخفی رکھنا ایک طرح کی ناانصافی ہے، اور یہ احساس رفتہ رفتہ عقلی زندگی کے تمام شعبون مین سرایت کرتا جاتا ہے تا آنکہ یہ بھی قومی خصایص کا ایک جزو غیر منفک ہوجاتا ہے، اب ارتقاء ایک قدم اور بڑھاتا ہے علم و تعلیم کی اشاعت، روشن خیالی کے اقتضا، اور معاشرت پر ایک عام فلسفیت

چھا جانے کے اثر سے انسان راستی کو صرف راستی کے غرض سے اختیار کرنے
لگتا ہے۔ حق کی صرف اس بنا پر پیروی کرنے لگتا ہے کہ وہ حق ہے، اس لیے کہ اس کے نتائج
کہاں تک مفید ہوں گے۔ اور ذاتی و فرقہ وارانہ تعصبات سے بلند ہو کر اپنی عقل کو خالص
دیانت داری کی راہ پر لگا لیتا ہے۔ اس دور میں پہنچ کر افراد تنگ خیالی و محدود نظری کے
قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں، اور ان میں بجائے فرقہ وارانہ پاسداری کے، ایک روشن خیال
و وسیع المشرب فلسفی کی شان زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔

دیانت داری کے مذکورہ بالا اشکال ثلثہ میں سے آخر الذکر دو صورتیں ایسی ہیں
جو صرف اعلیٰ ترین متمدن جماعات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ خصوصاً آخری شکل یعنی عقلی
دیانت داری کا تو بجز ایک متمدن دماغ کے اور کہیں گزر ہی نہیں ہو سکتا، اور یہ انسانی
نشو و نما کا بہترین ثمر ہے۔ لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ سیاسی و فلسفیانہ راستبازی کے نشو و نما
کا راستہ بالکل صاف رہا ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ مذاہب، قدم قدم پر اس کی مخالفت بیجا
کرتے رہے ہیں۔ اور صدیوں تک ان کا یہ شیوہ رہا کیا ہے کہ جہاں کوئی تصنیف
ان کے عقائد کے خلاف نکلی، بس اس کو ممنوع الاشاعت قرار دے دیا، اور جب تک
اپنا اقتدار باقی رہا، تو یہ کوشش بہر صورت جاری رکھی، کہ آزاد خیالی و روشن خیالی کو
معصیت قرار دیتے رہے۔

کاروباری معاشرت کے اخلاقی اثرات میں سے علاوہ ان کے جن کا ذکر گزر چکا،
دو اور قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ جماعت میں کاروباری پھیلاؤ سے دو بالکل مختلف طرح
کی سیرتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایک تو کفایت شعاری کی تحریک ہوتی ہے۔ دوسرے
اسراف کی۔ ہر دو تحریکات کا منبع اصلی، مادی سہولتوں کی آرزو سے حصول ہوتی ہے،
لیکن یہ ایک خواہش دو بالکل مختلف بلکہ متضاد رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کفایت شعاری
کا سارا زور احتیاط و دور اندیشی پر ہوتا ہے، اور اسراف سارا حال ہی کے بل بوتے پر ظاہر ہوتا ہے

کفایت شعاری زندگی کو منظم بناتی ہے۔ انسان میں اعتدال، سنجیدگی، ضبط، خودداری، شفقت پسندی، اور تمام وہ خصوصیات جو ایک بھلے مانس میں ہونے چاہیں پیدا کرتی ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کا بھی احتمال رہتا ہے کہ انسان میں فیاضی وہمدردی کے سرچشمہ کو خشک کر دے، اور اسے تنگ خیال بنا دے۔ اس کے مقابلہ میں اسراف آدمی میں تلون، عدم استقلال، زود تاثری، پیدا کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی ہمدردی وفیاضی کے جذبات کو بھی تقویت دیتا جاتا ہے، غرض یہ کہ کاروباری پھیلاؤ سے ہر دو تحریکات پیدا ہوتی ہیں، رہا یہ کہ کسی خاص جماعت میں ان میں سے کون تحریک زیادہ شایع ہوتی ہے، تو یہ اس جماعت کے مخصوص حالات ومقامی اثرات پر موقوف ہے۔ مثلاً جو لوگ لین دین وکاروبار کے بڑے بڑے مرکزوں میں مقیم رہتے ہیں، اُن میں اسراف زیادہ پھیلتا ہے، اور جو لوگ مرکزی مقامات سے دور ایسی جگہوں پر رہتے ہیں جہاں افزائش ثروت، صرف تدریجی اجتماع زر سے ممکن ہے، اُن میں لازماً کفایت شعاری کو ترقی ہوتی ہے۔

کاروباری معاشرت کا اخلاقی زندگی پر دوسرا اثر یہ پڑتا ہے کہ افراد میں دوراندیشی پیش بینی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مذہبی زندگی کے ادوار ابتدائی میں انسان ہر واقعہ کو علل واسباب کے سلسلے سے علیحدہ براہ راست حکم ایزدی کا نتیجہ سمجھتا ہے، اور اسلیے کسی طرح کا سامان اس کی روک تھام کا نہیں کرتا، بلکہ ہر قسم کی کوششوں پر توکل کو غالب رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے کاروباری تمدن میں پیش بینی جائز ہی نہیں بلکہ فرض اور فرض ہی نہیں بلکہ اعلیٰ ترین فرض سمجھی جاتی ہے۔ اس دور میں ہر نیک چلن وخوش اطوار کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی شادی اُس وقت تک ملتوی رکھے، جب تک اُس کی آمدنی اس قدر نہ ہو جائے کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے مصارف کا متحمل ہو سکے، یا پھر اسی طرح خرچ کرتے ہوئے وہ صرف اپنی آمدنی ہی یا اپنی ذاتی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھتا، بلکہ اولاد کی پرورش و پرداخت، لڑکوں کی تعلیم، لڑکیوں کے جہیز وغیرہ متعدد چیزوں کو پیش نظر رکھتا ہے، اور انجام بینی گویا اس کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے۔ درحقیقت

ترقی تمدن کا اس سے بہتر کوئی معیار ہی نہیں، کہ یہ دیکھا جائے کہ افراد مین انجام اندیشی کہان تک جاری وساری ہو۔ توکل و رضا بہ قضا کا تخیل یا تو سرے سے مٹ جاتا ہی، اور یا اس کے معنے صرف یہ رہ جاتے ہین کہ جن چیزون کو کوئی انسانی پیش بینی، کوئی سعی بشری ٹال نہین سکتی تھی اُن پر صبر کیا جائے۔

علاوہ دیگر موثرات کے، اس انقلاب حالت کا بھی یہ نتیجہ ہوتا ہی کہ جون جون تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہی، افراد کے دلون سے تقدس کا جذبہ مٹتا جاتا ہی۔ معیار افادیت پر جانچیے، تو اس جذبہ کی قیمت بہت مشتبہ رہے گی، اس معنی کر کے کہ آپ کے لیے یہ فیصلہ کرنا یقیناً دشوار ہی، کہ اس سے دنیا مین جو مسرت و راحت پھیلی ہی، اُس کا پلہ بھاری ہی، یا اُس تکلیف و اذیت کا جو مذہبی وہم پرستی و سیاسی غلامی کی صورت مین اس سے پیدا ہوئی ہی لیکن مسرت افزائی کی بنا پر جو چاہیے، کہ لیجیے تاہم اس قدر تسلیم کرنے سے شاید ہی آپ انکار کر سکین کہ جن افراد مین یہ جذبہ غیر موجود ہوتا ہی، وہ اخلاق کے اعلیٰ مدارج طی کرنے کے ناقابل ہوتے ہین۔ درصل فضائل اخلاق کی تمام صورتون مین صرف یہی ایک وصف ایسا ہی جس سے متعلق ہم "لطیف"، یا "جمیل"، کی صفت استعمال کر سکتے ہین۔ مگر با این ہمہ تمدن کا تقاضا ہی کہ اس جذبہ کو مٹا دیا جائے، کیونکہ جذبۂ تقدس کا اصل منبع انسان مین یہ احساس ہی کہ وہ کسی دوسرے کا محکوم و محتاج ہی، اسی واسطے یہ جذبہ مذہبیت کے اُس دور مین پیدا ہوتا ہی، جب یہ اعتقاد عام طور پر شایع ہوتا ہی کہ جو کچھ پیش آتا ہی، وہ پیشتر سے مقدر مین تحریر ہو چکا ہوتا ہی، یا سائنس کے اس عہد مین پیدا ہوتا ہی جبکہ ہر واقعۂ طبعی براہ راست کسی حاکم مطلق کے فرمان کی تعمیل سمجھا جاتا ہی، یا پھر حیات سیاسی کے اُس دور مین پیدا ہوتا ہی، جب وفاداری یا بادشاہ پرستی، رعایا کے خمیر مین داخل ہوتی ہی، اور جبکہ طبائع مین بجز انقیاد و فرمان برداری کے کسی قسم کا حوصلہ موجود ہی نہین ہوتا۔ غرض یہ کہ اس کا وجود ایسے ہی زمانے مین ہوتا ہی، جبکہ بغاوت، جمہوریت، و تشکیک کا تخیل ناپید ہوتا ہی۔

لیکن ہر بڑا انقلاب، خواہ وہ حالات میں ہو خواہ اقلیم افکار و معتقدات میں، جذبات کی نوعیت میں بھی انقلاب پیدا کرتا رہتا ہے، چنانچہ کچھ عرصہ میں یہ نظر آنے لگتا ہے کہ حریت کی خواہش، جمہوریت کی ہوا، تنقید کی اشاعت، افزائش آبادی، نقل و حرکت کی سہولتیں اور اقتصادی تغیرات جنھوں نے ذات پاک کی بندشیں توڑ دی ہیں، یہ سب کی سب ایسی قوتیں ہیں، جن کے ہاتھوں دوشیزگی کا ایمان غیر ملموس رہ ہی نہیں سکتی، بے شبہ آج ہم میں فیاضی، اخلاقی جرات، بلند حوصلگی عقلی دیانت داری، حریت پسندی وہم شکنی، وغیرہ متعدد اوصاف حمیدہ پیدا ہو رہے ہیں، لیکن وہ سادہ و معصومانہ کیریکٹر جو اپنے میں بیجا انکسار، اور دوسروں پر بیجا اعتماد رکھتا تھا، آج ناپید ہے۔ اب فطرت کے دلکش مناظر کے مشاہدہ سے چند ہی نفوس ایسے ہوں گے جن میں جذبۂ تقدس پیدا ہوتا ہے، ورنہ علی العموم تو اس سے ذہن یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ نظام فطرت، اٹل اور ناقابل تغیر قوانین کے بل پر چل رہا ہے، جس میں جذبۂ تقدس ہی کی کوئی گنجایش نہیں اس جذبہ کے مظاہر لطیف اگر پائے جاتے ہیں، تو موجودہ فرانس و امریکہ کے تمدن میں نہیں، بلکہ اُن دور افتادہ قوموں میں کہ جن کے نام سے بھی متمدن افراد گوش آشنا ہوں گے یا اگر فنی حیثیت سے اس کے نمونے کہیں ملتے ہیں، تو موجودہ ماہرین فنون لطیفہ کی صناعیوں میں نہیں، بلکہ صدیوں پیشتر کے ٹوٹے پھوٹے آثار قدیمہ میں۔ ضعیف الاعتقادی کا ایک دور ہوتا ہے، اور ہر دور کی طرح یہ دور بھی اپنے کچھ امتیازی خصوصیات رکھتا ہے جن کے مٹے بغیر، تمدن و شایستگی کا دور شروع ہی نہیں ہو سکتا۔

تعلقات جنسی کی بنا پر جن فضائل و رذائل کی تکوین ہوتی ہے، انھیں کلیات و تعمیمات کی شکل میں بیان کرنا دشوار ہے، کچھ تو اس لیے کہ اس موضوع پر شرم و حجاب کچھ زیادہ کھُلے سننے کی اجازت نہیں دیتا، اور کچھ اس لیے کہ اس کی تاریخ، حالات مخصوص سے بہت متاثر ہوتی رہی ہے۔ اس سے پیشتر ہم نے جن جاسات اخلاقی کا ذکر کیا، اُن کا

ارتقاء صرف معمولی و عام موثرات سے متاثر ہوتا تھا اور خارجی عوامل کا اگر اثر ہوتا تھا تو محض ضمناً۔ ذاتی حسن اخلاق کی توسیع، ایثار و بادشاہ پرستی کا انحطاط، اور کاروباری عوائد کی اشاعت، ایسی چیزیں ہیں، جو عموماً ہر تمدن کے لیے لازمی ہیں، اور اس لیے اس کا ارتقاء مختلف اقوام میں متحد اصول کے ماتحت ہوتا ہے، لیکن اعمال شہوانی کے ارتقاء کا سراغ لگانا اس قدر آسان نہیں۔ قوانین ازدواج، غلامی کا رواج، اور مذہبی عقاید، وغیرہ کا اس مسئلہ پر انتہائی اثر پڑا ہے۔ بحیثیت کل اس پر کیا اثر پڑا ہے، اس کی تفصیل تو میں کہیں آیندہ کروں گا۔ یہاں صرف دو ایک عام اور معمولی باتیں اس خاص معصیت کے متعلق کہنا ہیں، اور یہ بتانا ہے کہ تمدن کے مختلف مدارج کا اس کے ارتقاء پر کیا اثر پڑا ہے۔

ہمارے معاصرین کا ایک عام دستور یہ ہے کہ وہ اقوام میں ناجائز بچوں کی شرح پیدائش دریافت کرتے ہیں، اور اس سے اُن کی بداخلاقی پر استناد کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ طریقہ سخت مغالطہ آمیز و گمراہ کن ہے۔ کیونکہ قطع نظر اس صریحی نقصان کے کہ اس میں معمولی تماش بینی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اس میں ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ بہت سے اسباب کا نتیجہ ناجائز اولاد کا پیدا کرنا ہی ہوتا ہے، تاہم وہ شہوت پرستی پر ہرگز دال نہیں ہوتے۔ مثلاً انگلستان کے بعض اقطاع میں یہ جو خیال شایع ہے کہ نکاح سے پچھلی شہوانی لغزشیں دُھل جاتی ہیں، یا یورپ کے بعض ممالک میں یہ دستور رائج ہے کہ بغیر رسم نکاح کے مرد و عورت ایک مستقل جنسی تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ ان خیالات و رواجات کو ہم خواہ کتنا ہی لغو و مہمل سمجھیں تاہم یہ نتیجہ تو بہر حال نہیں نکلتا، کہ جن جماعتوں میں یہ رائج ہیں وہ سخت بدچلن و شہوت ران بھی ہیں۔ چنانچہ سویڈن کے بابت تو تجربہ طور پر معلوم ہے کہ اگر ناجائز بچوں کی تعداد ہی کو معیار بدچلنی قرار دے لیا جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی بدچلن ملک نہیں، حالانکہ اس کا

اصلی باعث وہ شدید رکاوٹیں اور دقتیں ہیں، جو وہاں کے قوانین ازدواج نے شادی سے متعلق پیدا کر رکھی ہیں۔ پھر شہوت رانی کے مختلف مظاہر کے جو فروق ہوتے ہیں، ان کی بھی کوئی توجیہ و تعلیل محض اعداد کے بھروسہ پر نہیں ہو سکتی۔ فرانس کا وحشیانہ بہیمانہ و نمائشی تعیش، اٹلی و اسپین کی لطیف و نازک طرز عیش، اور بعض شمالی اقوام کی مخفی شہوت رانی، یہ سب ایسے جذبات سے پیدا ہوتے ہیں، جو باہم بالکل مختلف ہیں، اور جن کا افراد کی سیرت پر اثر بھی بالکل مختلف پڑتا ہے۔

اخلاق کی اس صنف پر آب و ہوا کا بھی نہایت گہرا اثر پڑتا ہے نہ صرف اس حیثیت سے کہ جذبات کو برانگیختہ اور مدھم کرنے میں آب و ہوا موثر ہوتی ہے، بلکہ اس کا اثر اس حیثیت سے بھی گو بالواسطہ ہوتا ہے، مگر نہایت قوی ہوتا ہے کہ عورت کے مکانات کے اندر رہنے یا باہر پھرنے کو اس کی سیرت و مذاق کی تشکیل اور اس کے فرائض کی تعیین میں دخل عظیم ہوتا ہے، اور یہ بجائے خود موسم کی نوعیت پر منحصر ہے، پھر اس سوال کا، کہ کسی ملک میں صنف نازک کے کن کن طبقات میں حسن پایا جاتا ہے، جو اب بھی بہت کچھ موسمی حالات پر مشروط ہے، مثلاً شمالی ممالک میں حسن کا معیار رنگ خیال کیا جاتا ہے، لیکن ہوا کی سردی اور مشقت شدید، رنگ کی نزاکت و تازگی کی قاطع ہوتی ہیں، اس لیے ان ممالک میں غربا کے طبقہ میں حسن معدوم ہے۔ بہ خلاف اس کے جنوبی ممالک میں، آفتاب کی تیز شعاعیں، رنگت کو اور نکھار دیتی ہیں، اس لیے یہاں حسن کسی خاص طبقہ میں محدود نہیں، بلکہ جھوپڑے اور محل دونوں جگہ یکساں پایا جاتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عفت و پاکدامنی کا وجود اُن جماعتوں میں سب سے زیادہ ہوتا ہے جو نیم شائستگی کی حالت میں ہوتی ہیں، مگر بربریت کی منزل سے گزر چکی ہوتی ہیں، اور اعلیٰ تہذیب و شائستگی کا وجود اس کے حق میں سخت مضر ہے۔

دراصل، شہوت پرستی، نوعمر افراد، اور کبیر السن اقوام کے خصائص میں داخل ہوتی ہے جو قومیں، ذہنی یا معاشری حیثیت سے اعلیٰ ترین سطح تمدن پر پہونچ چکی ہوتی ہیں، مگر جو سیاسی اسباب کی بنا پر اپنی قوتوں کے اظہار کا کوئی معقول مصرف نہیں رکھتیں، ان کی عام کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں اصول لذتیہ کا عمل در آمد رہا کرتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں چند افراد کے پاس جو کثیر التعداد دولت مجتمع رہتی ہے، اور عام طور پر لوگوں میں جو عیش پسندی کے جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ عفت نسائی کے بقا کی کوئی صورت نہیں رہنے پاتی، اور پھر تفریح و تماشہ کے جو طریقے علی العموم رائج ہوتے ہیں وہ اور اس جذبۂ عفت کو فنا کرنے میں معین ہونے لگتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح کہ جیسے زمانۂ بربریت کی وحشیانہ تفریحات، ظلم و شقاوت کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں، دور شائستگی کے عوامہ معاشری، ڈراما، وغیرہ دلوں میں شہوت رانی کے جذبات برانگیختہ کرتے ہیں پھر اشاعت تعلیم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ غریب طبقہ کی بہت سی عورتیں، تعلیم و تہذیب کے زیور سے آراستہ ہو کر اس قابل نہیں رہتیں، کہ اپنے ہی طبقہ کے مردوں کے پہلو میں زندگی گزار دیں، بلکہ اس قابل بن جاتی ہیں کہ اونچے طبقوں میں بیاہ کر جائیں۔ کاروباری مشاغل بے شبہ طبایع میں بہت ضبط نفس پیدا کرتے ہیں، اور خصوصاً عسکریت کو تو بالکل محدود ہی کر دیتے ہیں، تاہم ان سے جو مزاج میں پیش بینی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، وہ افراد کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ شادی بہت بڑی عمر میں کریں، اس سے نوعمری میں طرح طرح کے ترغیبات و تحریصات کا مقابلہ کرتے رہنا پڑتا ہے، اور کثرت ترغیبات ہمیشہ کثرت بدچلنی کا باعث رہتی ہے۔ رہا یہ کہ تحدید نسل پر تجرد ارادی کا کہاں تک اثر رہا ہے؟ تو تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثر بہت ہی کم رہا ہے۔ اس بارہ میں ردک تھام کی جو کچھ قوت ہے، وہ ان اخلاقی و جسمانی مفاسد میں ہے، جو اس سے نتائج کے طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور یہ دونوں چونکہ باہم خود متناقض ہیں، اس لیے اکثر ان کے درمیان تناسب معکوس پایا جاتا ہے۔ یہ پایا جاتا ہے

کہ ایک کی کمی دوسرے کی زیادتی کی مستلزم ہے۔ مثال کے لیے ہم آیرلینڈ کو لیتے ہین، یہان صغر سنی کی شادی کا عام رواج ہے، اور اسی بنا پر یہان کے زراعت پیشہ طبقہ مین عفت نسائی کا وجود جس قدر پایا جاتا ہے، اُس کے لحاظ سے اہل آیرلینڈ کو سارے یورپ مین امتیاز حاصل ہے، لیکن یہی رواج، جو ایک طرف آیرلینڈ والون کی اخلاقی برتری کا ضامن ہے، دوسری طرف اُن کے افلاس کا بھی ذمہ دار ہے، اور ان کی تجارتی ترقی کی راہ مین سخت رکاوٹ حایل کیے ہوئے ہے۔ ان لوگون مین اگر عفت و عصمت کا اس قدر خیال نہ ہوتا، تو یہ یقیناً زیادہ مرفہ الحال ہوتے۔ وہ ہیبتناک قحط، جس نے اس صدی (یعنی اُنیسوین صدی مین) آیرلینڈ مین گھر کے گھر صاف کر دیے، اگر کسی ایسے ملک مین آتا، جہان کے باشندون مین اجتناب معاصی کے بجاے اجتماع ثروت پر زیادہ توجہ ہوتی، تو ہمین یقیناً وہ نظارہ نہ دیکھنا پڑتا، جو آیرلینڈ مین پیش آیا۔

آیرلینڈ کی مثال سے ہمین یہ نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ کوئی حاسۂ اخلاقی، جن مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، کچھ ضرور نہین کہ اُس کا اثر انھین حالات تک محدود رہے، بلکہ اکثر وہ ان سے متجاوز بھی ہو جاتا ہے، بات یہ ہے کہ آیرلینڈ کے پادریون اور راہبون سے بڑھکر متقی اور پاکباز راہب یورپ بھر مین کہین نہین ہوتے، حالانکہ تجرد کے عہد سب ہی کرتے ہین۔ تجرد کے مدعی بہت سے ہوتے ہین، مگر اپنے عہد کا عملی نباہ جیسا آیرش پادری و راہب کرتے ہین، اور کوئی نہین کرتا۔ ان کی یہ پاکبازی اس لیے اور بھی حیرتناک ہے کہ اُن کی حکومت کا مذہب پروٹسٹنٹ ہے، رومن کیتھولک نہین، اور اس واسطے ان کی عہد شکنی پر مواخذہ کرنے والا کوئی محتسبانہ قانون بھی رائج نہین۔ پھر موسمی خصوصیات بھی اس کیفیت کا کافی سبب نہین بن سکتے۔ مگر اس کا اصلی باعث جو ہے، وہ میرے نزدیک بہت کھلا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے، کہ صغر سنی، یعنی ابتداے بلوغ مین شادی ہو جانے کے عام دستور سے یہان کے راہبون مین شروع ہی سے ناجائز تعلقات کی جانب سے سخت نفرت کا جذبہ

پیدا ہو جاتا ہے، اور یہی طبعی ناپسندیدگی و نفرت انھین مدۃ العمر عہد تجرد کے نباہ دینے پر قایم و ثابت رکھتی ہے۔

بیانات بالا سے ناظرین کو نظر آ گیا ہو گا، کہ گو نیکی و بدی اپنی اصلی ماہیت کے لحاظ سے ہمیشہ یکسان و غیر متغیر رہتی ہین، مگر سوسایٹی کی ترقی کے ساتھ مختلف نیکیون اور بدیون کے اخلاقی تخیلات مین فرق ہوتا رہتا ہے، اور اس مین بھی تغیر ہوتا رہتا ہے کہ وہ اخلاقی تخیلات سوسائٹی کے مختلف مدارج مین عملاً بڑھے کس حد تک جاتے ہین۔ ناظرین پر یہ بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ گو جماعتون مین اخلاقی ترقی ہوتی رہتی ہے تاہم یہ نہین کہا جا سکتا کہ کوئی اخلاقی ترقی خالص و بے آمیز ہوتی ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی جماعت مین فضائل اخلاق زیادہ پیدا ہون اور رذائل کم ہو لیکن یہ نہین ممکن ہے کہ رذائل سرے سے پیدا ہی نہ ہون۔ بہت سے محاسن اخلاق ایسے ہین، جو متمدن اقوام مین معدوم ہوتے ہین، اسی طرح جیسے کہ بہت سی اخلاقی خوبیان صرف غیر متمدن جماعات ہی مین موجود ہوتی ہین مثلاً ایک با اخلاق شخص کے لیے اس سے بڑھ کر دردناک و تاسف انگیز منظر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مظلوم قوم کسی اجنبی حکمران کے مظالم کا تختہ مشق بن رہی ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایثار، سرفروشی، جانبازی، واخوت حقیقی کے جیسے نظایر اس محکوم قوم مین ملین گے، ویسے غالباً اور کہین نہین ملنے کے، اور جون جون حریت پھیلتی جائے گی، ان مخصوص محاسن اخلاق کے وجود مین کمی آتی جائے گی یا مثلاً جنگ، کہ یقیناً ہولناک معاصی کا پیش خیمہ ہے، تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ بہت سے ایسے اعمال حسنہ کی بھی مظہر ہوتی ہے، جو حالت امن و صلح مین ظاہر ہی نہین ہو سکتے۔ اور لہٰذا وجود قمار بازی سے جو محاسن گوناگون مترتب ہوتے ہین، (مثلاً یہ کہ جو لوگ اس مین ہارتے ہین، وہ صبر کے ساتھ مالی نقصانات کو برداشت کرنے کے خوگر ہو جاتے ہین وغیرہ) ان سے یک سر اغماض نہین کیا جا سکتا۔

مختلف اقوام کے مدارج تمدن مین اب تک اس قدر اختلاف ہے کہ مختلف اقطاع ارض

گویا مختلف ادوار ہین، یعنی دنیا مین اتبک عہد بہ عہد جتنے تمدن، پست یا بلند، گزرے ہین، اُن سب کے نمونے آج بھی مختلف قومون مین نظر آتے ہین لیکن یہ اختلافات جلد جلد مٹتے جاتے ہین، چند اسباب سے، کچھ تو اس سبب سے کہ علم و تعلیم کی اشاعت عالمگیر ہوتی جاتی ہے کچھ اس لیے کہ وسایل سفر و نقل و حرکت کی سہولتون نے مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملا دیے ہین، اور پھر کچھ اس کی تہ مین وہ سیاسی و جنگی اسباب بھی ہین، جو سارے یورپ کو مرکزی و جمہوری ریاستہاے متحدہ کی شکل مین تبدیل کر رہے ہین۔ مگر یہ انقلاب ایک معنی کر کے افسوسناک ہے، اور اس کے اس پہلو کا مخالف و موافق سب کو اقرار ہے کیونکہ قطع نظر اس کے، کہ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستین، جنھین کچھ مدت مین آپ تلاش سے بھی یورپ کے جغرافیہ مین نہ پائیے گا، اپنی رعایا کی آسان و آرام دہ طرز معاشرت، مالی خوشحالی، سیاسی آزادی، علمی ترقی و مشاغل صلح، کے لحاظ سے بڑی بڑی سلطنتون پر فوق رکھتی ہین، ایک بڑی بات یہ ہے کہ امن و آشتی، قناعت و استغنا کے مناظر، جن کا تمدن جدید مین کہین شایبہ بھی نہین، انھین مقامات مین نظر آتے ہین، اور اس مین شبہ نہین کہ بین الاقوامی اخلاق کا سہارا انھین چیزون کے دم سے ہے، خیالات ہون کے قیام و احیا کا جو طریقہ پیشتر جاری تھا، وہ یقیناً ایک خاص قسم کی سیرت رکھنے والے اشخاص کے لیے نہایت قابل قدر و مامن تھا، مگر افسوس ہے کہ وہ جدید تمدنی انقلاب جس کا خمیر عاقبت اندیشی سے ہے، مادیت روز افزون کے اس مصلح کی بھی جڑ کاٹ رہا ہے، ہر قوم کے لیے بجاے خود تو یہ بے شبہ مفید ہے کہ اسے شایستگی کے بلند ترین بام پر پہونچنا چاہیے، لیکن یہ نہایت مشتبہ ہے کہ نوع انسان کے لیے تمام قومون کا تمدنی حیثیت سے ہم سطح ہو جانا، عام اس سے کہ وہ تمدن کی بلند ترین سطح ہی کیون نہ ہو، مفید ہے کیونکہ جیسا کہ ہم سمجھتے ہین ارتقاے اخلاقی کی تکمیل کے لیے اختلاف حالات و اختلافات موثرات کا وجود لازمی ہے، اسی واسطے میرا یہ بھی خیال ہے کہ اخلاقی حیثیت سے مختلف

ذاتون اور طبقون کی جدا گانہ سیاسی نیابت قابل ترجیح ہے عام و مشترک نیابت پر، نیز تمدن کے مختلف مدارج کا قیام بہتر ہے، تمدن کی ہم سطحی و ہم رنگی سے، کیونکہ پہلی صورت مین حالات و موثرات کے تنوع و چگونگی سے اخلاق کے ہر پہلو کا پورا نشو ونما ہوتا رہے گا۔ ہندوستان و آسٹریلیا کے نیم وحشیانہ تمدن مین سیرت کے بعض خاص اجزا کی جو تربیت ہوتی رہتی ہے، اس سے انگلستان کبھی بے نیاز نہین رہ سکتا۔

مجھے امید ہے کہ ارتقاء عقلی و ارتقاء اخلاقی کے باہمی تعلقات کے معرکۃ الآرا مسئلہ پر میرے معروضات سے کافی روشنی پڑی ہوگی۔ ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ارتقاء انسانی کے مورخ کو اپنا دایرۂ تحقیقات انسان کی صرف عقلی زندگی تک محدود رکھنا چاہیئے کیونکہ (بہ قول اس گروہ کے) اخلاق ایک ساکن و منجمد شی ہے، جس مین نہ کوئی حرکت ہوتی ہے نہ ارتقاء اس لیے اس کی تاریخ نگاری پر متوجہ ہونا ایک بے معنی کوشش کرنا ہے، اور وحشی سے وحشی قبائل متمدن سے متمدن اقوام کے اخلاقی حیثیت سے ہم سطح ہوتے ہین۔ مین نے اس گروہ کے علی الرغم، یہان یہ دکھایا ہے، کہ اگرچہ اخلاق کے جواہر فرد (یا اولین عناصر ترکیبی) ہر جگہ یکسان رہتے ہین، تاہم وہ معیار جس کے مطابق عملدرآمد ہوتا ہے، نیز وہ اضافی وقعت جو مختلف محاسن اخلاق سے متعلق نفس مین قائم ہوتی ہے، ہر ملک و ہر زمانے مین تغیر پزیر ہوتے ہین، اور یہ تغیرات سرسری نظر سے دیکھے جانے کے لائق نہین، بلکہ تاریخ عامہ پر نہایت گہرا اثر رکھتے ہین۔ ایک اور جماعت اس امر کی قایل ہے، کہ یہ تغیرات ہوتے تو رہتے ہین، اور تاریخ عالم کو متاثر بھی کرتے رہتے ہین، تاہم اپنا کوئی علیحدہ مستقل وجود نہین رکھتے، بلکہ معلول ہوتے ہین ذہنی علل کے۔ یعنی ذہنی تغیرات سے اخلاقی تغیرات خود بخود بہ طور نتیجہ کے لازم آجاتے ہین۔ یہ قول ایک حد تک ضرور صحیح ہے لیکن یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ صرف ایک حد تک اور ایک خاص معنی مین ورنہ اگر اس سے زیادہ اس مین وسعت پیدا کرنا چاہیے گا، تو اس کی واقعیت مسلم نہ رہے گی۔ کیونکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے

کہ افراد ہون خواہ اقوام، کسی کے لیے بھی جو علمی وعقلی حیثیت سے ممتاز ہون یہ ضرور نہین کہ اخلاق مین بھی بلند پایہ ہون، اور یہ تو آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ اعلیٰ مادی وذہنی تمدن اکثر شدید بد اخلاقیون کا معاصر رہتا ہے، بلکہ ارتقاء دماغی کی بعض اصناف تو صریحاً ارتقاء اخلاقی کے منافی ہین۔ دوسری چیزون کو جانے دیجیے، صرف اسی ایک بات کو لے لیجیے کہ تمدنی معاشری، و دماغی ترقیون کے بہترین مظاہر ومراکز، بڑے بڑے شہر ہوتے ہین، حالانکہ بدکاریون کی کان بھی شہرون ہی کی گنجان آبادی ہوتی ہے، اور پھر یہ بھی نہین ہوتا کہ شہر مین کچھ مخصوص محاسن معاشری کی تولید ہوتی ہو کیونکہ یکجہتی وخلوص وغیرہ معاشری خوبیون کا وجود بھی مشاہدہ سے قصبات ودیہات ہی مین زیادہ پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازین، بڑے بڑے اخلاقی کارنامے عموماً نتیجہ ہوتے ہین، زبردست ومستحکم اعتقاد کا، اور اعتقاد کا استحکام پھر جو کچھ پایا جاتا ہے، وہ تمدن سے بیگانہ، سادہ دل افراد ہی مین ہوتا ہے نہ کہ عالی دماغ اہل شہر مین جو بال کی کھال نکالنے اور مسائل کو تشکیک وتنقیض کی نظر سے دیکھنے مین مشغول رہتے ہین۔ البتہ اس مین شبہ نہین، کہ تمدن گو معاصی کو نہ دبا سکا تاہم اس نے جرائم کو بہت مغلوب کر دیا ہے۔ اور دوسرا کارنامہ اس کے فہرست مناقب مین یہ لکھا جا سکتا ہے کہ یہ روزانہ معاشرت کے عوائد رسمیہ کو زیادہ لطیف، پسندیدہ وخوش کن بنا دیتا ہے، اور جہان غلامی نہین موجود ہوتی، وہان اُن محاسن اخلاق کو اُبھار دیتا ہے جن کا تعلق دماغی مشاغل وکاروباری زندگی سے ہے۔ باقی رہا ایثار، جوش خلوص، تقدس، وپاکدامنی تو یہ فضائل اخلاق تو تمدن کے بہت ہی کم شرمندۂ احسان ہین۔

باایں ہمہ اس سے انکار نہین ہو سکتا، کہ وہ اخلاقی تغیرات جو تمدن سے متاثر ہوتے ہین، وہ بالآخر اکثر عقلی اسباب ہی کے معلول نکلتے ہین، کیونکہ تمدنی زندگی کی بنیاد موثرات عقلی ہی پر ہے۔ یہ عقلی موثرات، جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے، کبھی کبھی براہ راست عمل کرتے ہین، اور کبھی بالواسطہ۔ بالواسطہ اس طرح پر کہ ان کی مطابقت مین لوگون کا ایک

خاص طرز معیشت بن جاتا ہے، اور پھر اس کی بنا پر اُن مین فرائض کا احساس و تخیل پیدا ہوتا ہے جس سے اخلاقی نقطۂ نظر کی تشکیل ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ لوگون کے اخلاق اُن کے اصول و نظریات سے نہین، بلکہ اُن کے مشاغل و طرز معیشت کے تابع ہوتے ہین۔ پہلے حالات و مقتضیات ماحول کی بنا پر وہ اپنے ذہن مین حسن اخلاق کا ایک خاص سانچہ قائم کرتے ہین، اور پھر اس کے مطابق اپنے نظریات و افکار کو ڈھالتے ہین۔ مثلاً فرض کیجیے، کہ دو قومین مساوی درجہ کی مہذب و تعلیم یافتہ ہین، لیکن جغرافیانہ و ماحولی خصوصیات نے ایک مین عسکریت کو ترقی دیدی ہے، اور دوسری مین کاروبارت کو تو اسی کے مطابق دونون مین مختلف نیکیون اور بدیون کا جو تخیل پیدا ہوگا، وہ باہم بالکل مختلف ہوگا۔

یہانتک اصل بحث پر گفتگو تھی۔ اب مین تاریخ اخلاق کے تخیل سے متعلق چند عامۃ الورود غلطیون، اور بعض اُن اہم نتیجون کا ذکر کرکے جو اخلاقی سانچون کی ماہیت پر غور کرنے سے پیدا ہوسکتے ہین اس باب کو ختم کرتا ہون۔

پہلی بات یہ ہے کہ بمقابلہ خانگی زندگی کے جس مین افراد کے اغراض شخصی زیادہ متعلق رہتے ہین، سیاسی زندگی مین عموماً لوگ معیار اخلاق بہت پست کردیتے ہین۔ یہ تماشا روزمرہ دیکھنے مین آتا ہے کہ ایک شخص اپنی پرایوٹ زندگی مین راستبازی و دیانتداری کا مجسمہ ہے، مگر وہی شخص جب سیاسی معاملات مین پڑتا ہے، تو بلا تامل انتہائی بددیانتی کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر یہ سخت غلطی ہوگی، کہ جو لوگ اس طرح کی بددیانتی کو جواز و منظوری کا فتویٰ دیدیتے ہین، ہم اس سے ان کی عام اخلاقی پستی کا نتیجہ نکال لین۔ اکثر ایسا بھی اتفاق عجیب ہوتا ہے، کہ سیاسی جرائم خود قومی محاسن کے ساتھ وابستہ ہوجاتے ہین۔ مثلاً ایک قوم مین بالطبع بہت ہی اطاعت کیشی، حلم، وفاداری کا مادہ موجود ہے، تو یہ قوم اپنی خصوصیات کی بنا پر کسی خودمختار فرمانروا کے زیرنگین آجائے گی اب جب اس حاکم غیر مسئول کو غیر محدود اختیارات حاصل ہون گے، تو لامحالہ اس سے

ظالمانہ و جابرانہ افعال کا ارتکاب بھی ہوگا۔ اس کا اثر یہ پڑیگا کہ آیندہ مورخ اس حکمران کے
طرز عمل کو دیکھکر اُس قوم کے جانب، جسکا وہ فرد ہے، اُس خاص سیرت کو منسوب کردے گا
اور یہ رائے قائم کرے گا کہ اس حکمران قوم کی قومی خصوصیت ہی یہ تھی۔ اس کے
علاوہ یہ بھی ہوتا رہتا ہے کہ ہر قوم مین بہت سے محاسن و معایب مساوی قوت و اثر کے
ساتھ موجود ہوتے ہین، لیکن تاریخ کے مرقع مین بعض زیادہ آب و تاب کے ساتھ نظر آتے
ہین، اور بعض کا رنگ و روغن بالکل گویا اُڑجاتا ہے۔ مثلاً تاریخ مذاہب مین حاملین شریعت
کا، باہم چھوٹے چھوٹے اختلافی مسائل مین دست و گریبان ہونا، ایک دوسرے پر لعن طعن
سب و شتم کرنا، ہر اصلاح کا شدید مخالف ہونا، علمی ترقیون کی راہ مین روڑے اٹکانا، اپنے
معتقدون سے اپنی بیجا تعظیم کرانا، لباس وضع و قطع کی حقیر سے حقیر جزئیات کی بنا پر تکفیر کے
فتوی دیدینا، غرض تمام اسی قبیل کے مکروہ مناظر تو ہماری آنکھون کے سامنے پھرائے جاتے
رہین جس سے ہم پر بالکل قدرتی طور پر یہ اثر پڑتا ہے کہ یہ علماء مذہب نرے ہی جاہل و کم ظرف
رہے ہین۔ لیکن اس کا مقابل رخ ہماری نگاہ سے بالکل اوجھل رہتا ہے۔ ان حاملین مذہب
کا اپنے مریدون کو وعظ و پند کرتے رہنا، اپنی زاہدانہ و بے لوث زندگی سے ان کو اخلاقی سبق
دینا، عملاً صبر و شکر و استغنا کے نمونے پیش کرنا، مرنے والے کو نزع کے وقت تلقین کرنا، اور
اُس کے پسماندگان کو تسکین دینا، غرض اس طرح کے بیسیون اعمال حسنہ ان کے ہاتھون
روز انجام پاتے رہتے ہین، مگر کتنے تاریخ ادیان کے طلبہ ہین، جنھین ان چیزون کی
کانون کان خبر بھی ہے؟ پھر کسی انجمن یا جماعت کے کارنامون کی بنا پر اُس کے ارکان
کی سیرت سے متعلق فرداً فرداً رائے قائم کرنے کا اصول یون تو ہمیشہ غلط ہے، لیکن تاریخ
مذہب مین اس اصول پر عمل کرنا اور بھی زیادہ مغالطہ خیز ہے، کہ شاید دنیا مین کوئی اور طبقہ
بجز طبقۂ علماء مذہب کے ایسا نہین ہے، جسکے افراد کے ذاتی فضائل اُس کے مجموعی رذائل
کے سامنے اس قدر دب گئے ہین۔

دوسری بات یہ ہے کہ مختلف قوموں میں، نیک کرداری کے محرکات مختلف ہوتے ہیں، اور اس لحاظ سے ایک قوم پر دوسری قوم کو قیاس کرنا شدید غلطی کا ارتکاب کرنا ہے۔ مثلاً اہل فرانس کے جو قومی محاسن ہیں، وہ نتیجہ ہیں اُن میں نہایت قوی جذبۂ ہمدردی کے پائے جانے کا، اور یہی جذبہ بنیاد ہے اُن کی اعلیٰ ذہنی خوبیوں کی، اُن کی عوائد رسمیہ کی، اور یورپ بھر میں اُن کے اثر کی۔ کوئی غیر قوم اپنی سیاسی حریت کے لیے جد و جہد کر رہی ہو، تو جتنی ہمدردی فرانس کو اُس کے ساتھ ہوگی، اتنی کسی اور کو نہیں ہوتی۔ کسی ملک کے ادبیات (لٹریچر) میں غیر اقوام کے افکار کی صحیح ترجمانی اور اُن کے جذبات کے ساتھ ہمدردی جس خوبی کے ساتھ فرنچ لٹریچر میں کی گئی ہے، اتنی اور کہیں نہیں۔ دنیا کے کسی حصہ میں کوئی مظلوم رعایا اپنے تئیں ظالم حکمران کے پنجہ سے آزاد کرنے میں کوشش کر رہی ہو، تو اس کی اعانت و امداد پر جس قدر فرانس آمادہ ہوگا، اتنا اور کوئی نہ ہوگا، فرانس کے قومی جرائم خواہ کتنے ہی کثیر و شدید ہوں، تاہم اُس کے جرم کو ہلکا کر دینے کے لیے یہ امر بس کرتا ہے کہ وفور محبت و ہمدردی میں وہ یکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اینگلو سیکسن اقوام پر غور کرو، بے شبہ کبھی کبھی یہ بھی بہت بڑی جوش کی مظہر بن جاتی ہیں لیکن علی العموم ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں نہ کسی کی ہمدردی سے مطلب، نہ کسی کے دکھ درد میں کام آنے کا شوق، بس اپنے کام سے کام اور اپنی غرض سے غرض۔ ان کے محاسن قومی کا اصل ماخذ ان کی فرض شناسی ہے۔ ان کا یہ احساس ہے کہ فرض کو صرف فرض کے خیال سے انجام دینا چاہیے، بلا لحاظ اس کے کہ اس سے کون خوش ہوگا کون ناخوش۔ کیا نفع حاصل ہوگا اور کیا نقصان۔ دوسری قومیں، دوسرے اوصاف کے لحاظ سے اس پر فوق و فضیلت رکھتی ہیں، لیکن یہ وصف، اینگلو سیکسن ہی قوم کے ساتھ مخصوص ہے کہ اس نے سب سے زیادہ واشنگٹن و ہیمڈن کی طبیعت کے افراد پیدا کیے ہیں، ایسے افراد جو نام و نمود کے نہیں، بلکہ حقیقی عزت و عظمت کے خواہاں تھے، ایسے افراد جو مدۃ العمر شاہراہ فرض پر چلتے رہے، ایسے افراد جنھوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ نازک سے نازک حالات میں، ان کے قدم کو جادۂ حق سے نہ بڑی سے بڑی

طمع لغزش دے سکتی ہے اور نہ بڑی سی بڑی تخویف۔ انگلستان نے غلامی کے خلاف جو مسلسل صبر آزما و غیر نمایشی جہاد مدتوں جاری رکھا، وہ تاریخ کے ضخیم مجلدات مین کم از کم چند اوراق مین تو یقیناً آب زر سے لکھا جائے گا۔ اس کیریکٹر کے لحاظ سے اگر انگریزون کی کوئی نظیر مل سکتی ہے، تو قدیم رومن سیرت مین، اور علی الخصوص مارکس آرلیس کی سیرت مین۔

یہ تو نہین کہہ سکتے، کہ کوئی ایک نیکی کسی دوسری نیکی سے تناقض ہوتی ہے، تاہم اس مین شک نہین، کہ مختلف نیکیان مختلف طبقات مین، کسی خاص تشابہ و اشتراک کی بنا پر، جگہ پانے کے لائق ہوتی ہین چنانچہ ہم محاسن عقلی، محاسن کاروباری، محاسن معاشری، و محاسن ایثاری، کو چار مختلف عنوانات کے ماتحت رکھ سکتے ہین۔ اور کہہ سکتے ہین، کہ بعض حالتون مین کسی خاص نیکی کا محض وجود نہین، بلکہ ترقی یافتہ شکل مین وجود، کسی دوسری نیکی کے منافی ہے، جس تمدن مین کاروباریت کی روح سرایت کیے ہوئے ہو اس مین قناعت و توکل کا کہان پتہ لگ سکتا ہے؟ جس جماعت کی بنیاد عسکریت پر ہے، اُس مین اطاعت کیشی و حلم و تحمل کا وجود کیونکر باقی رہ سکتا ہے؟ جو ہیئت اجتماعیہ خوش اعتقادی و ایمان بالغیب کو زبدۃ الفضائل قرار دیتی ہے، اُس مین ذہنی و عقلی فضائل کا گزر کہان؟ تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے، کہ تمدن کی یہ صورتین کسی نہ کسی صنف اخلاق کے لیے ضرور موزون ہین کسی اخلاقی سانچہ کا حُسن امتیازی اُس کے عناصر ترکیبی کی نوعیت پر اتنا مشروط نہین ہوتا، جتنا اِن عناصر کی مقدار و کمیت پر سقراط، کیٹو[1]، بے آرڈ[2]، فینلن[3]، سینٹ فرانسس، اِن مین سے ہر ایک سیرت فاضلہ رکھتا تھا، لیکن ان کی سیرتین آپس مین نہ صرف بلحاظ مدارج، بلکہ بلحاظ نوعیت بھی مختلف ہین۔ اور اس کی سعی کرنا، کہ کیٹو مین سینٹ فرانسس کے یا سینٹ فرانسس مین کیٹو کے فضائل مخصوصہ آجائین، گویا یہ چاہنا ہے کہ بلاوئین شیر برج کا ادب

---

۱ قدیم روم مین عہدۂ احتساب پر تھا، کہا جاتا ہے کہ مروت، طمع، خوف کوئی شے اسے جادۂ اخلاق سے کبھی نہ ہٹا سکی۔

۲ سنہ ۱۴۷۶ء تا سنہ ۱۵۲۴ء نہایت شجاع سردار فوج۔

۳ سنہ ۱۵۵۵ء تا سنہ ۱۶۲۱ء۔

شیر برنج مین پلاؤ کا مزہ آجائے۔ کیٹو یا بے آرڈ کی سیرت سے اگر اُن کے چند عنصر کو حذف کر دیجیے تو اُن کے فضائل دھوئے رہ جائین گے، حالانکہ سینٹ فرانسس کے فضائل کی روح انکسار ہو۔ اصولاً کوئی وصف ایسا نہین، جو مرد مین ممدوح ہو اور عورت مین مذموم ہو تاہم مختلف فضائل کو جس خاص ترتیب و توازن کے ساتھ عورت کی ذات مین مجتمع ہونا چاہیے، اگر وہ اسی طرح مرد کی ذات مین ہون، تو یہ ایک بہت ہی عجیب اور بے جوڑ بات ہوگی۔ اخلاقی سانچہ اس حیثیت سے بالکل جسمانی سانچہ کے مماثل و مشابہ ہوتا ہو۔ جس طرح عورت و مرد کے حُسن مین، بچہ اور جوان کے حسن مین، اور انگریز و اٹالین کے حُسن مین فرق ہوتا ہو، اُسی طرح مختلف اشخاص و اقوام کے فضائل اخلاق مین بھی فرق ہوتا ہو۔ ہر چہرہ حسین نہین ہوتا، اسی طرح ہر سیرت محمود نہین ہوتی لیکن حُسن کے بہت سے مظاہر ہوتے ہین۔ اسی طرح فضیلت اخلاق بھی کسی ایک خاص صورت پر محدود نہین، بلکہ فضائل اخلاق کے مختلف انواع و اقسام ہوتے ہین۔

اس حقیقت کو ہم بہ الفاظ دیگر یون ادا کر سکتے ہین، کہ جب انسان کے اخلاق کے کسی ایک جزو مین خامی ہوتی ہو، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہین ہوتا کہ اس کے دیگر اصناف اخلاق مین بھی خامی و نقص ہو۔ تاہم دنیا کے نزدیک کوئی ایک ایک فضیلت اساسی ضرور ہوتی ہو جسے تمام فضائل اخلاق کا منبع کہنا چاہیے، اور جسکی کسی شخص مین غیر موجودگی اس امر پر دلالت کرتی ہو کہ وہ شخص یکسر زیور اخلاق سے معریٰ ہو۔ مگر یہ فضیلت اساسی کون ہو؟ اس کا جواب ہر ملک ہر طبقہ، اور ہر زمانے مین ایک نیا ملتا ہو۔ مثلاً قدیم جمہوری حکومتون مین حُب وطن کو اس الفضائل قرار دیتے تھے، کہ بغیر اس کے مرقع اخلاق نامکمل تھا، حالانکہ ہمارے ملک و زمانے مین بالکل ممکن ہو کہ کوئی شخص قومی اغراض سے بے اعتنائی برتتا ہو، تاہم اپنے ذاتی اخلاق کے لحاظ سے مجموعۂ فضائل ہو۔ یا چند صدی پیشتر ہمارے یہان اعتقادی جمود جملہ مکارم اخلاق کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا تھا، لیکن آج ہم بہت سے نیک کردار و ذی اخلاق لوگون کو جانتے ہین، جو اس وصف سے بالکل تہی دامن ہوتے ہین۔ یا دیانت داری و راستبازی کاروباری جماعتون کے

نزدیک شہرت اخلاق کا سب سے زیادہ جلی عنوان ہوتی ہے لیکن دوسری جماعتون کا یہ حال نہین، یا پھر آخر مین عفت، چنانچہ اسی اسوقت انگلستان مین عورتون کے لیے فضیلت اساسی کا درجہ رکھتی ہے لیکن مردون کے لیے نہین، اور عورتون کے لیے بھی ہر ملک ہر زمانہ مین اس کا یہ مرتبہ نہین رہا ہے۔ مورخ اخلاق کے فرائض مین اس سے زیادہ اہم فرض کوئی نہین، کہ ہر عہد کی فضیلت اساسی کا پتہ چلائے، کہ تمام دیگر مکارم اخلاق اسی کے تابع اور اسی پر متفرع رہتے ہین۔

ان تصریحات سے ناظرین پر واضح ہوگیا ہوگا، کہ کسی ایک خاص طرز سیرت کو مثل سانچے کے قرار دے لینا جسکے مطابق تمام سیرتون کو ضرور ڈھلنا چاہیے کیسی سخت غلطی کا مرتکب ہونا ہے، کوئی سیرت، خواہ اپنے رنگ مین کتنی ہی محمود ہو، مگر ایسی ہمہ گیر تو نہین ہوسکتی کہ ہر طرز سیرت اسی ایک سانچہ مین ڈھل جائے، اور یہ کیسے ہوسکتا ہے، دراں حالے کہ کسی سیرت کی تکمیل صرف اس کے عناصر ترکیبی کے وجود پر نہین، بلکہ اس امر پر مشروط ہوتی ہے کہ وہ کس تناسب اور کس مقدار سے موجود ہین پس کسی طرز سیرت کو اسوۂ حسنہ قرار دیے جانے کے مستحق محض اسی قدر ہوتے ہین کہ وہ اپنے رنگ مین کامل ہو، مقتضیات عصر یہ کے سانچے مین ڈھلی ہو، اور نوع انسانی کے لیے نسبتہً سب سے زیادہ مفید ہو۔ مسیحیت نے اخلاق کا جو سانچہ قرار دیا ہے، اس مین نفس بشری کے ملنساری و معاشرت کے پہلوون پر زیادہ زور دیا گیا ہے، اس کے مقابلہ مین رواقیت کے سانچہ مین ایثار و نفس کشی کو زیادہ نمایان رکھا گیا ہے، یہین سے یہ نتیجہ ہاتھ آتا ہے، کہ رواقیت کی بہ نسبت مسیحیت تمدن کی صدر نشینی کی زیادہ مستحق ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ تمدن جون جون زیادہ پھیلتا جاتا ہے، ایثار و نفس کشی کی بہ نسبت، ملنساری و خوش معاشرتی کے جذبات اس کے لیے زیادہ مفید ہوتے جاتے ہین۔

مین سمجھتا ہون، کہ اس اخلاقی عدم رواداری کی جانب، جو تمام سیرتون کو ایک ہی سانچہ مین ڈھالنا چاہتی ہے، تاریخی حیثیت سے ابتک کسی نے کافی توجہ نہین کی ہے، اور اس لیے مجھے اس کا ذکر صفحات آئندہ مین بار بار کرنا پڑیگا۔ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ ہر شخص اپنے مذاق اور اپنی

سیرت کو ایک معیار قرار دے لیتا ہے، جس پر وہ تمام سیرتوں اور اخلاقی فضیلتوں کو جانچتا ہے، اور جس کو اپنے سے مختلف پاتا ہے، اُسے پست، ناقص، و فاسد المذاق وغیرہ القاب سے موسوم کرنے لگتا ہے۔ اور یہ کچھ اس باعث نہیں ہوتا کہ ہر شخص مغرور ہوتا ہے، بلکہ زیادہ تر اس واسطے ہوتا ہے کہ عموماً لوگوں کی قوت متخیلہ اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آتا کہ دوسرں کے لیے اُن سے اس قدر مختلف المذاق و مختلف الخصائل ہو کر بھی ان کے برابر نیک کردار ہونا ممکن ہے۔ ایک نیک شخص، اپنے ہی مزاج و عادات کے شخص کے ساتھ تو خواہ وہ بہ لحاظ مدارج اس سے کتنا ہی پست ہو، ہمدردی آسانی سے کرسکتا ہے، لیکن اُس شخص سے اُسے ہمدردی رکھنا دشوار ہوتا ہے جس کی طرز سیرت اُس سے مختلف ہوتی ہے، خواہ وہ اپنے رنگ میں کتنا ہی پختہ و کامل ہو۔ یہ بھی ایک بڑا سبب منجملہ اُن چند اسباب کے ہے جن کی بنا پر مختلف اقوام کے درمیان لطف و یگانگت کا رشتہ قائم ہونا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ قومیت کے اختلاف کے ساتھ اُن میں نسل کا بھی اختلاف موجود ہو۔ ہر قوم ایک خاص معیار اخلاق رکھتی ہے، اپنی ہی سیرت کے اجزاء کو کامل و مکمل سمجھتی ہے، اور دوسری قومیں، خواہ بجائے خود کیسے ہی فضائل اخلاق سے آراستہ ہوں، مگر وہ اُنھیں ہمیشہ ذلیل و پست ہی سمجھتی رہتی ہے۔ اسی سے ہر قوم کے افراد میں غیر قوم کے افراد کی طرف سے نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے کوئی حکیم وقت تو اپنے تئیں آزاد کرسکتا ہے، لیکن عام افراد پر یہی جذبات محیط رہتے ہیں۔

افراد کی تشکیل سیرت دو مختلف عناصر سے ہوتی ہے، ایک خود اُن کا طبعی رجحان، دوسرے موثرات خارجی۔ یہ دونوں عناصر کبھی باہم معین و موید ہوتے ہیں، اور کبھی ان کے درمیان خود ہی تناقض پایا جانے لگتا ہے۔ سوسائٹی کی بنیاد اگر لطافت و نفاست پر ہے، تو افراد کی سیرت وہ اپنے مطابق پیدا کرنا چاہے گی، اگر عسکریت پر ہے، تو اپنے موافق، اور اگر کاروباری پھیلاؤ پر ہے، تو اپنے موافق۔ غرض جماعت اپنے اختلاف نوعیت کے لحاظ سے افراد کی طرز سیرت بھی

مختلف جا رہے گی۔ اب اگر کوئی فرد ایسا پیدا ہوا جسکی افتاد طبیعت مقتضیات ماحول کے مخالف ہے، تو لامحالہ اُس مین اور اِن مین تصادم پیدا ہوگا۔ فرض کیجیے، کہ کسی ایسی جماعت مین جسکا خمیر عسکریت سے ہے، ایک نہایت حلیم الطبع و منکسر مزاج شخص پیدا ہوتا ہے تو لازمی طور پر اس کے اور اس کے ماحول کے درمیان عدم تطابق رہے گا، جسکا نتیجہ صرف یہی نہین ہوگا کہ اسے اپنے اوصاف مخصوص کے نشو و نما کا پورا موقع نہین ملے گا، بلکہ اس کی ساری زندگی کشمکش مین گزریگی۔ تعلیم و تربیت اس کی طبیعت کے مخالف، سوسائٹی کے آداب و رسم و رواج اُس کے مذاق کی ضد، لوگون کی رائین اُس کے مزاج کے برعکس، اور سب سے بڑھکر یہ کہ خود اس کا احساس فرض اُس کے مذاق فطری کے مخالف واقع ہوگا، وہ اپنے گرد و پیش فضائل اخلاق کے جتنے بہترین نمونے دیکھتا ہے، وہ سب ایک بالکل مختلف طرز و نوعیت کے ہوتے ہین، اور وہ جون جون ان کی تقلید کرنے لگے گا، اس کے معنے یہ ہون گے، کہ وہ اپنے طبعی جوہر کو کُند کرتا جائے گا۔ اب اس کے برعکس فرض کیجیے، کہ ایک شخص جو قدرت سے ایثار و خود فروشی کا مادہ لیکر اپنے ساتھ آیا ہے، ایسی جماعت کے درمیان پیدا ہوتا ہے جس مین ایثار ہی کو مدار اخلاق تسلیم کیا جاتا ہے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف اُسی کی ذاتی طور پر زیادہ قدردانی ہوگی، بلکہ ماحول کے تائیدی اثرات سے متاثر ہوکر وہ اپنے ان اوصاف کو اُن کے منتہائے کمال تک پہونچا سکتا ہے، یہ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے، کہ حالات کے تغیر کے ساتھ، اخلاقی سانچے بھی متغیر ہوتے رہتے ہین، اور یہی بنیاد ہے تاریخ اخلاق کے وجود، اور تاریخ عامہ کے ساتھ اُسے منسلک کرنے کی ضرورت کی۔ مذاہب کا اثر بہ حیثیت معلم اخلاق کے، صرف اسی صورت مین ہو سکتا ہے جب ان کی تعلیمات مقتضیات حالیہ کے مطابق ہون۔ اور اگر اُن کا کوئی حصہ اُن کے مخالف ہے، تو یا تو اس ٹکڑے کے وجوب سے انکار ہی کر دیا جائے گا، یا کچھ اس کی تاویل کر لی جائے گی، اور یا وہ عدم پابندی کی نذر ہو جائے گا۔ ایک زمانہ تھا، کہ رواقیہ و لذتیہ ہر دو مذاہب کا ایک دوسرے کے ہمدوش وجود تھا۔ اُس وقت لوگون کے پیش نظر دو بالکل مختلف اخلاقی سانچے تھے، اور اُس وقت اس کا بہت

اچھا موقع تھا کہ ہر گروہ اپنے حریفون کے فضائل اختیار کرسکے۔

ہم نے ابھی کہا ہو کہ افراد کی تشکیل سیرت کے دو عناصر ہین، ایک داخلی ایک خارجی، مگر ہماری معلومات اِن مین سے صرف جزو خارجی یعنی اُن سیاسی، عمرانی، و ذہنی عوامل تک محدود ہین جو تشکیل سیرت مین موثر ہوتے ہین، رہے موثرات داخلی یعنی افراد و اقوام کے وہ کیفیات نفسی، جو تشکیل سیرت کا جزو دوم ہین تو ان کی ماہیت و نوعیت سے ہم تقریباً یکسر نابلد ہین۔ مگر مین سمجھتا ہون کہ اکثر ناظرین میری اس راے سے اتفاق کرینگے کہ جون جون فن طبابت جدید کو ترقی ہوتی جاے گی، ویسا ہی ہمارے لیے روز بروز یہ سحر ٹوٹتا جائے گا۔ اب تک انسان نے جن علوم کو ترقی دی ہو، اُن مین فن طبابت گو ابھی تک نہایت عدم تکمیل کی حالت مین ہو لیکن اس کے مستقبل سے ہمین بہت سی توقعات قائم ہین، اور اس پر اگر اسی قدر توجہ کی جاتی جتنی گذشتہ دو صدیون[ل] مین تجارتی صنائع و مادی آلات پر صرف کی گئی، تو اس مین کوئی شک نہین کہ اسوقت تک عجیب عجیب محیر العقول، اسرار کا انکشاف ہو چکا [illegible]۔ اکثر مہلک امراض کے اسباب سے ہماری ناواقفیت کا اکثر اعتراف کیا جاچکا ہو، اور امراض نفس کی تشخیص و تعیین کی تو ابھی بالکل ابتدا ہوئی ہو، حالانکہ زیادہ تر امراض کی تولید و علاج دونون نفس ہی کے ذریعہ سے ہوتے ہین۔ اسی طرح قوت برقی (الکٹرسٹی) کے، جو حیات انسانی سے نہایت مماثلت رکھتی ہو خواص کا اب تک شمہ برابر بھی علم نہین ہو سکا ہو۔ فاقد الحس دوائین، جو ابھی حال مین چلی ہین، ان کی غیر محدود اہمیت تو مسلم ہو چکی ہو، اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہو کہ ہم اپنے احساسات و جذبات کو بعض خارجی اثرات سے بھی متاثر کر سکتے ہین۔ ان تمام چیزون کی دریافت جب اپنے منتہاے کمال تک پہونچ جائیگی تو معلوم نہین، معلومات انسانی کے خزانہ مین کس قدر گران بہا اضافہ ہوگا، لیکن فلسفیانہ حیثیت سے فن طبابت کا زرین کارنامہ وہ ہوگا جب نفس و جسم کے باہمی تعلقات سے پردہ اُٹھ جائے گا اور جو شخص نفس و ذہن کے علم الامراض کو سائنس کے مرتبہ پر پہونچا دیگا، اُس کا شمار نہ صرف

له دو صدیون کا لفظ ہمارا تصرف ہو، مصنف نے صرف گذشتہ صدی، یعنی اٹھاروین کا ذکر کیا تھا۔ مترجم

ایک ملک یا زمانہ کے، بلکہ تمام دنیا کے اعاظم رجال مین ہوگا، راہبون کا نفس کشی کے لیے روزہ رکھتے رہنا، یا فصد لیتے رہنا، قوائے شہوانی کی روک تھام یا ان کی تقویت کے لیے دوائون کا استعمال کیا جانا، امراض عصبی کا طریق علاج، جنون کا اثر اخلاق پر، علم کاسہ سر کی تحقیقات، جسمانی نشو ونما کے متوازی ذہنی تغیرات، اور ان امراض کا وجود جنھون نے پہلے سیرت اخلاقی، اور پھر اس کے واسطے سے قوائے ذہنی مین انقلابات پیدا کر دیے ہین، ان تمام چیزون پر یہ جدید سائنس توجہ کرے گی۔ درحقیقت نفس و جسم کے باہمی تعلقات کا وجود اس قدر بدیہی ہی، کہ جو لوگ مادیت کے نام سے کانون پر ہاتھ رکھتے ہین، وہ تک اس سے انکار نہین کر سکتے کسی جذبہ کے اثر سے یک بیک نبض مین سرعت آجانا، یا چہرہ پر سرخی کا نمودار ہو جانا، یا وہم سے طبیعت کا خود وبائی بیماریون کو قبول کر لینا، یہ ایسی مثالین جسم پر نفس کے اثر کی ہین، جو بادی النظر مین بھی ہر شخص کو محسوس ہو جاتی ہین۔ اور اسی طرح مزاج و طبیعت پر تغیرات جسمانی کے اثر کے واقعات بھی بشہادت نظائر روزمرہ کی تائید سے متحقق ہو چکے ہین۔ بلکہ کچھ عجب نہین، کہ یہ اصول، ہمارے سارے نظام ذہنی پر حاوی ہو، اور ہر جذبہ یا کیفیت نفسی کا ایک جسمانی سبب بھی موجود ہو، یہانتک کہ اگر ہمین ان اسباب کا علم ہو جائے تو ہم دوائون کے ذریعہ سے امراض اخلاقی کا بھی اُسی کامیابی سے علاج کر سکین، جس طرح ابتک امراض جسمانی کا کرتے ہین۔ ان کے انتہا عملی فوائد سے قطع نظر کر کے خالص فلسفیانہ حیثیت سے ایک بڑا نفع یہ ہوگا، کہ اس سے ہمارے خصائص اخلاقی کی تکوین و ترتیب پر ایک نئی روشنی پڑے گی۔ اس روشنی مین ہم یہ اندازہ کر سکین گے، کہ اخلاق پر آب و ہوا کا کہان تک اثر ہوتا ہی، نسلی خصائص کا کہان تک اثر ہوتا ہی، وغیرہ۔ اور یون ظن و قیاس کی سرحد سے نکل کر ہم تجربہ و اختبار کے حدود مین داخل ہو جائین گے۔

یہ انکشافات، جن کی جانب مین نے اشارہ کیا ہی، کچھ آج ہونے کی توقع نہین، ان کی

تکمیل ہونے کے لیے ایک عمر درکار ہی، اور ان سے متعلق زیادہ بحث کرنا تصنیف ہذا کے دائرہ مین آنا بھی نہین ہی۔ موجودہ تصنیف کا مقصد صرف یہ دکھانا ہی، کہ خارجی حالات، اخلاق پر کہان تک موثر ہوتے رہے ہین؛ ہر عہد مین کیا کیا اخلاقی سانچے قائم ہوتے رہے ہین؛ عملاً ان کی کہان تک مطابقت ہوتی رہی ہی؛ اور کن کن اسباب سے اُن مین ترمیم و تغیر ہوا کی ہی۔

باب دوم

اخلاق قبل مسیح

فصل (۱)

اخلاقی حیثیت سے مذہب مُروَّج کی ضعیف الاثری

منجملہ اُن چند چیزون کے جن پر اخلاق اقوام قدیم کے طالبعلم کی سب سے اول نظر پڑتی ہو، ایک یہ واقعہ بھی ہو کہ قدیم تمدنون مین اخلاق پر مذہب رائج الوقت کا اثر نہایت ضعیف اور ہلکا تھا اُس زمانے مین معبودون کی سیرت کے ساتھ کوئی اخلاقی تخیل وابستہ نہ تھا، اور ظہور مسیحیت سے چند صدیون پیشتر بت پرستی کے مذہب مروج کا اثر شایستہ دماغون پر بہت ہی خفیف رہ گیا تھا۔

یونان مین ابتدا ہی سے مذہب فطرت کی وجود کا پتہ چلتا ہی محض افسانہ اور کہانی کی حیثیت سے نہین بلکہ تاریخی حیثیت سے، اور یہ حقیقت اس قدر واضح ہی کہ قدیم یونانی ڈراما نویسون نے جس لب ولہجہ مین معبود اعظم زِیس[۱] اُس کی ربوبیت وخالقیت کا ذکر کیا ہی، اُس سے ہمارے اکثر پادری صاحبان اس نتیجہ پر پہونچے ہین، کہ وہ لوگ یا تو موسوی شریعت سے واقف تھے، یا خود مُلہم تھے، اور بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہی، کہ ہماری نسل ابتدا ہی سے توحید کی قایل رہی ہی۔ قدیم حکما، رائج الوقت مذہبی افسانون کو ہمیشہ نفرت یا عداوت کی نظر سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ فیثاغورس سے یہ قول منقول ہی کہ اُس نے خود ایسیڈ وہومر کو اس جرم مین کہ اُنھون نے دیوتاؤن سے متعلق مختلف قصے وضع کیے تھے دوزخ مین طرح طرح کے عذاب مین مبتلا دیکھا۔ فلاطون نے بھی ایک کامل و بے عیب ملک کی

---

[۱] یونانیون کا رب الارباب ۔ معبود اعظم ۔

جو خیالی تصویر کھینچی تھی، اُس مین اسی بنا پر شاعرون کا گزر نہین ہونے دیا تھا۔ اسٹلپو اُن قربانیون کا مضحکہ اُڑاتا تھا جو اس کے زمانے مین رائج تھین، اور بالآخر ایک دیوی کے وجود سے انکار کے جرم مین اتھینز سے جلاوطن کر دیا گیا تھا، زنافن کہا کرتا تھا، کہ ہر قوم اپنے ہی خصایص امتیازی کو اپنے معبودون کی جانب منتقل کر دیتی ہے، مثلاً جہان کے باشندے سیہ فام ہوتے ہین وہان کے دیوتا بھی سیاہ ہوتے ہین، اور جہان کے باشندے گورے ہوتے ہین، وہان کے معبود بھی گورے ہوتے ہین، ڈیاگورس و تھیوڈورس کی بابت روایت ہے، کہ وہ معبودون کے وجود ہی سے منکر تھے، اور پروٹوگورس اس باب مین متردد تھا۔ اپیکورس اور اس کے تلامذہ کا یہ قول تھا کہ ان کو دنیوی معاملات سے کوئی سروکار نہین مشککین[1] کو یہ یقین کامل تھا، کہ ہمین کوئی علم خواہ متعلق بہ معبود ہو خواہ بہ عبد، یقینی طور پر ہو ہی نہین سکتا۔ انٹستھینس کا یہ عقیدہ تھا، کہ عوام کے خدا گو متعدد ہین، لیکن فطرت کا خدا ایک ہی ہے، رواقیین، فیثاغورث و ارسطو کے ایک قول سے استناد کر کے کہتے تھے، کہ جملہ کائنات کی ایک عالمگیر روح ہے، جو شعور و قدرت رکھتی ہے۔ الغرض جس فلسفی پر نظر کیجیے، اس کے عقاید کو مذہب مروجہ کے خلاف ہی پائے گا۔

یہی عام تشکیک روما مین سلطنت و جمہوریت مین بھی حکما کے گروہ مین جاری تھی، اور اُس وقت کا سارا تعلیم یافتہ طبقہ یا تو اصولاً و اعتقاداً اور یا عملاً ملحد ہو گیا تھا۔ ایک گروہ، لکریشیس و ٹیرنٹیس کی سربراہی مین علانیہ یہ کہتا تھا، کہ معبودون کا وجود صرف انسان کے دہشت زدہ و مرعوب تخیل کا پیدا وار ہے، ربوبیت کا تخیل مہمل ہے، کائنات محض اتفاقی اجتماع ذرات کا نتیجہ ہے، حیات خود بخود پیدا ہوتی ہے، اور فلسفہ کا مقصد، مذہب کے پیدا کردہ توہمات کی پردہ دری کرنا ہے، دوسرا گروہ ایک رب کی ہستی کا ضرور قائل تھا، مگر وحدت وجود کے طریقہ پر، اور مروجہ مذہبی افسانون کی

[1] مصنف نے اس بیان مین کسی قدر بے احتیاطی سے کام لیا ہے جو اصلی مشککین تھے وہ اس یقین کامل کے مدعی نہ تھے کہ انھین کوئی علم قطعاً ہو ہی نہین سکتا۔ یہ یقین کا ادعا تو تشکیک کے عین منافی ہے۔ وہ اپنی زبان سے کسی شی کا دعویٰ نہین کرتے تھے یہانتک کہ اپنی لاعلمی کے بھی مدعی نہ تھے۔ مترجم۔

یہ طرح طرح پر تاویلات کرتا تھا، اور انھیں سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ان تاویلات کا ایک منتظم و منضبط شکل ہین، سب سے پہلا نمونہ ہمین یوہیمیرس کی تصنیفات مین ملتا ہی۔ اس کی تاویل یہ تھی، کہ جن کی آج بہ طور معبودون کے پرستش کی جاتی ہی، یہ اپنے زمانے مین بادشاہ تھے، مگر ان کی موت کے بعد لوگ انھین خدا سمجھنے لگے، چنانچہ ان کی تاریخ و نسب نامہ بتانے کا بھی یہ مدعی تھا، دوسرا نظریہ، جو رومن تشکیک کے دور اول مین زیادہ مقبول ہوا، وہ رواقیین کا یہ قول تھا، کہ مختلف معبود، دراصل فطرت کے مختلف مظاہر، یا ذات باری کے مختلف قویٰ ہین۔ مثلاً نیپچون[عہ]، پانی ہی، پلوٹو[عہ]، آگ ہی، ہرکیلس[عہ]، قدرت باری ہی، منروا[عہ] دانش الٰہی ہی، وغیرہ۔ وارو نے سلطنت روم کی بنا پڑنے سے سو برس پیشتر یہ کہا تھا، کہ کائنات کی روح ذات باری ہی، اور اس کے مختلف قویٰ، دیگر معبود ہین،" ورجل و مینلیس نے اس خیال کو نظم کیا، کہ تمام زندگی کا اصل الاصول تمام حرکت کی علت فاعلی ایک عالمگیر روح ہی، جو کائنات کے گوشہ گوشہ مین جاری و ساری ہی۔ پلینی کے الفاظ یہ تھے، "آسمان و زمین، غرض جملہ کائنات کو بجائے خود، خدا سمجھنا چاہیے جو ازلی و ابدی، لا یخرب و لا یزال ہی۔ بس اس سے زیادہ کسی بات کی جستجو کرنا انسان کے لیے مفید نہین، کیونکہ اس کے سوا ہم کچھ دریافت ہی نہین کر سکتے"۔ سسرو کا افلاطون کے اس مقولہ پر ایمان تھا، کہ خدا نام ہی روح مجرد کا۔ ایسے نفس کا جو جسم و مادہ کی کثافت سے پاک ہی۔ سنیکا نے عطارد کو عالم کا مسبب الاسباب و پروردگار قرار دیا، لوسن، مشہور رواقی شاعر نے اسی خیال کو اس سے زیادہ آب و تاب سے ظاہر کیا، کوینٹیلین، خود مختارانہ حکومت کی تائید مین یہ حجت لاتا تھا، کہ خدا بھی تو یون ہی اکیلا، تمام موجودات پر حکمرانی کر رہا ہی۔ بعض اور فلاسفہ کا یہ مسلک ہوا ہی، کہ جوپیٹر میکزمس، رب الارباب کا مرتبہ رکھتا ہی، اور دوسرے معبود، اس کے وزرا، یا ملائکہ کی حیثیت رکھتے ہین۔ رواقیین کا ایک گروہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ ایک تلاطم عظیم دنیا کا خاتمہ کر دیگا، اور بعد بعثت ثانیہ تمام ارواح، خواہ اشخاص کی ہون خواہ معبودان ثانویہ کی،

عہ یہ سب روم کے مختلف دیوتاؤن کے نام ہین۔

خالق حقیقی کی روح مین وصل ہو جائین گی۔ مذہب نے عالم اُخروی کی جو ہولناک تصویر کھینچی تھی، اس کے بعض اجزاء، عورتون اور بچون تک کو مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ سسرو نے اپنے عقیدۂ توحید مین معبودانِ ثانوی کے لیے کوئی گنجایش نہین رکھی، کہانت کی بیخکنی کی، کاہنون کی جماعت کو سیاسی مکار قرار دیا، اور معجزات و کرامات کو التباس حواس و افراطِ تخیل کا نتیجہ ٹھہرایا لیکن قسطنطین کے عہد سے پیشتر ہی، کہانت کی تردید مین بہت سی کتابین لکھی جا چکی تھین، اور عملاً بھی کہانت، اور اس کے ساتھ لوگون کی ضعیف الاعتقادی کا، بہت کچھ سدّباب ہو چکا تھا۔ رواقیئن اپنے حسب دستور براہ راست تو مذہبی معتقدات مین دست اندازی کرتے نہ تھے، البتہ کہانت کے دام مین پھنسنے سے اپنے پیرؤون کو یہ کہکر باز رکھتے تھے، کہ لوگ جسے خوش قسمتی سے تعبیر کرتے ہین، یہ ایک بے حقیقت سی شے ہے۔ البتہ آدمی کو اپنے ضمیر پر قانع رہنا چاہیے، اور اپنا مطمح نظر فرض شناسی کو، نہ کہ کامیابی کو قرار دینا چاہیے۔ رومن جنرل سرٹوریئس حالت جنگ مین اپنے موافق جعلی پیشینگوئیان گڑھ گڑھ کے اپنے سپاہیون کو فریب دیا کرتا تھا، اور رومن ظرفا نے تو علی العموم کہانت اور کاہنون کو اپنے تمسخر و استہزا کا ہدف بنا لیا تھا۔ قدماء یونان نے عوام کے اس عقیدہ کی شدید تردید کی تھی، کہ ان کے معبود، مخربِ اخلاق اعمال کے مرتکب ہو سکتے ہین، اس کی صدائے بازگشت متاخرین کی تصانیف سے بھی آنے لگی اور آوِڈ[۵۱] نے تو اپنے مطائبات کا یہی موضوع قرار دے لیا۔ اسی طرح ہورِیس[۵۲]، ایک نہایت چبھتے ہوئے طنز کے ساتھ ایک نجار کی زبان سے یہ خیال ادا کرتا ہے، کہ "یہ کندۂ ناتراشیدہ جو میرے سامنے رکھا ہے، اس کی مین تپائی بناؤن، یا اس کا کوئی دیوتا بنا ڈالون"۔ سسرو، پلوٹارک، میکزمیس وڈیان کریزوسٹوم، یہ سب لوگ یا تو بت پرستی کے یکسر مخالف ہوئے ہین، اور یا اگر اُسے جائز سمجھتے بھی تھے، تو صرف اس بنا پر کہ عوام کے ذہن مین وہ خدا کے تصور جمانے مین

۵۱و۵۲ یہ دونون روم کے مشاہیر شعرا مین ہوئے ہین،۔ آوڈ ۴۳ ق م تا ۱۸ سنہ ق م۔ ہورِیس ۶۵ سنہ تا ۸ سنہ ق م۔

تعین ہوتی ہے، سینیکا و متبعین فیثا غورس قربانیوں پر بھی معترض تھے۔

ان کثیر التعداد نظایر سے اس حقیقت پر روشنی ڈالنا مقصود تھی، کہ روم کا فلسفیانہ حلقہ مذہب مروج کے اثر سے کس قدر بُعد رکھتا تھا، اور اس لیے اس کی اخلاقی زندگی کے موثرات کا سُراغ لگاتے ہوئے سمین مذہب کو اس کا کوئی ماخذ نہ قرار دینا چاہیے، لیکن اہل علم عقاید ہمیشہ عوام الناس کے معتقدات سے مختلف رہے ہیں، اور یہ اختلاف اس زمانے میں، جبکہ نہ مسیحیت کا ظہور ہوا تھا، نہ طباعت کی دریافت ہوئی تھی، اس سے بھی زیادہ واضح و شدید تھا جتنا آج کل دونوں گروہوں میں ہے۔ اس کا ایک اہم اثر یہ پڑا، کہ حکما کی آزاد خیالیاں صرف ان کی زبان و قلم تک محدود رہیں، لکرشیس کا الحاد، اور زیلا مذہ کارنیڈس کی تشکیک، استثنائی واقعات تھے، ورنہ عام حالت یہ تھی کہ قدیم حکما، اپنی آزاد خیالیوں کو پرائیوٹ صحبتوں یا اپنی ان تصانیف تک، جو صرف ایک مخصوص مختصر حلقہ میں اشاعت پذیر ہوتی تھیں محدود رکھتے تھے، اور بہ لحاظ عمل مذاہب مروجہ کی مہمل رسوم تک کی پابندی کرتے تھے بلکہ عوام کے سامنے ان کی تائید تک کرتے تھے۔ ایک خیال اُن کا یہ بھی تھا کہ تمام قوموں کا منتہاے مقصود۔ خدا پرستی۔ ایک ہی ہے، البتہ راستے مختلف ہیں، اور اس لیے اگر کسی مذہب سے انسان کی اخلاقی زندگی صحیح ہوتی ہو، تو خواہ فی نفسہ وہ مذہب کیسا ہی لغو ہو، لیکن باایںہمہ وہ مستحق تائید و حمایت ہے۔ ڈلفی کے دار الکہانت سے یہ فتوی صادر ہوا تھا کہ ہر شخص کے لیے بہترین مذہب وہ ہے جو اس کے وطن میں رائج ہو۔ پالیبیس، ڈایونیس کا ایک طرف تو یہ مقولہ تھا، کہ جملہ مذاہب محض سیاسی آلات عمل ہیں، اور دوسری جانب یہ رومن خوش اعتقادیوں کی مدح میں حد سے زیادہ رطب اللسان ہو رہے تھے۔ وارو علانیہ کہتا تھا، کہ بہت سے مذہبی حقایق ایسے ہیں، جن سے عوام کا لاعلم رہنا ہی بہتر ہے، اور بہت سے مذہبی اکاذیب ہیں، جن پر عوام کا اعتقاد رکھنا ہی قرین مصلحت ہے، سسرو و سینزر، دونوں، اعتقاداً مذہب کے منکر تھے،

بااینہمہ مذہبی عہدہ دار بھی تھے، رواقیین کی یہ تعلیم تھی، کہ ہر شخص کو اپنے ملکی مذہب کی پابندی کرتے رہنا چاہیے۔

لیکن رومی مذہب کی نوعیت ہی ایک خاص قسم کی واقع ہوئی تھی، یہ لوگون کو پابند اخلاق رکھنے مین بے شبہ بہت کچھ معین ہوتا تھا، لیکن اس سے کوئی اخلاقی جذبہ مطلقاً نہین پیدا ہوتا تھا، یہ تمامتر سیاسیات کا پیداوار تھا، اور اس کی جو کچھ طاقت تھی، وہ سب سیاسی رنگ مین رنگی ہوئی تھی۔ رومی دیوتا، نہ تو یونانی دیوتاؤن کی طرح تخئیل غیر محدود کی پیداوار تھے، اور نہ مصری دیوتاؤن کی طرح قواے فطرت کے مظاہر تھے، بلکہ یا تو استعارۃً مختلف فضائل اخلاق کے مجسمہ تھے، اور یا دہ ارواح تھین، جو رومی صنائع کے مختلف شعبون کی حاکم ونگران تھین۔ اس مذہب نے حلف کا احترام قائم کیا تھا، بعض فضائل پر گویا سیاسی تقدس کی مہر لگادی تھی، اُن کے بعض مخصوص مواقع اظہار کی یادگار منائی جاتی تھی، وطن پرستی کو ایک مرتبۂ خاص عطا کیا تھا، اسلاف پرستی کے ذریعہ سے حیات بعد الموت کا عقیدہ قائم کیا تھا، خاندان مین والد کی حکومت اُقتدار پر زور دیا تھا، رسم نکاح کو ایک بالکل مذہبی رسم کی حیثیت سے رکھا تھا، اور افراد کی سیرت مین توکل، اطاعت کیشی، و پابندی مراسم مذہبی کے جوہر پیدا کیے تھے، مگر بااینہمہ اس مذہب کی اصل بنا، خود غرضی ہی پر تھی۔ اس کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہ تھا، کہ افراد مرفہ الحال رہین اور صعوبات ومصائب سے محفوظ رہین۔ چنانچہ یہ اسی کا اثر تھا، کہ روم مین گو، صدہا، ہیرو وجانباز پیدا ہوئے، لیکن نفس کُش زاہد ایک بھی نہ اُٹھا۔ یہان ایثار کی جو بہتر سے بہتر مثالین ملتی ہین، وہ بھی مذہب کے اثر سے آزاد، اور وطن پرستی پر مبنی تھین۔

مگر اہل روم کے جو کچھ بھی عوائد اخلاقی تھے، اور انھین مذہب سے جو کچھ بھی تقویت ملتی تھی، وہ سب جمہوریت کے اواخر اور شہنشاہی کے اوائل مین، بداخلاقی وبہیمیت کے طوفان مین غرق ہوگئے۔ اب معاشرت کی سادگی وبے تکلفی، جو مدت دراز کی سخت کوششون سے قائم ہوئی تھی، کی جگہ تکلفات وعیش پرستی نے لے لی اس کی ابتدا تو اس زمانے سے ہوتی ہے

جب مینلیس کی فوج ایشیا سے واپس ہوئی ہے پھر، اسی زمانے کے قریب قرطاجنہ و مقدونیا کی فتوحات سے اسے اور ترقی ہوئی؛ اور پھر انٹونی نے اپنے طرز عمل سے اسے تقویت مزید پہونچائی تا آنکہ شہنشاہی کے زمانے میں عیش پرستی اس حد تک پہونچ گئی، کہ مشرقی متخیلہ بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ جمہوریت کے قائم کردہ نظام اخلاقی و سیاسی کا اختلال کامل، خانہ جنگیوں کی طوائف الملوکی، غیر ملکیوں کی روز افزون درآمد، جو اپنے ہمراہ نئے نئے رسم و رواج، نئے مذاہب، اور نئے نئے فلسفہ لاتے تھے، ان چیزوں نے مل ملاکر اخلاق کے قدیم حدود کو بالکل درہم وبرہم کر دیا۔ سب سے بڑھکر یہ ہوا کہ عبادت و پرستش کے مختلف طریقے جو پہلو بہ پہلو رائج ہوگئے، انھوں نے اور مذہب مروجہ کی طرف سے لوگوں کو ڈانواڈول کر دیا۔ مذہب کا اخلاقی اثر تقریباً بالکل فنا ہوگیا۔ جذبۂ تقدس تقریباً مٹ گیا۔ اور اس کے مظاہر ہر شخص کو نظر آنے لگے۔ چنانچہ جب اغسطس کا بیڑہ غرق ہوگیا، تو اس نے غصہ میں آکر نیپچون کے بت کو مسمار کر دیا، یا جب جرمینیکس کا انتقال ہوا، تو لوگوں نے دیوتاؤں کے قربانگاہوں پر خوب پتھراؤ کیا۔ مذہبی تقدس واحترام کا نشان لوگوں کے دل سے ایسا مٹ گیا تھا کہ لوگ اپنی دعاؤں میں ایسے گندہ و فحش الفاظ استعمال کرتے تھے، جو بڑے سے بڑے بے شرم شخص کی زبان سے بھی ادا ہونا مشکل تھے۔ بعض حکماء و سلاطین نے بے شبہ اصلاح کی کوشش کی لیکن مذہب قدیم کا اخلاقی اثر واپس نہ آنا تھا نہ آیا۔ یہ اخلاقی انحطاط رفتہ رفتہ اس حد تک آگیا کہ سلاطین پرستی شروع ہوگئی۔ اب غیر ملکی دیوتاؤں کی بھی رومن دیوتاؤں کی طرح پرستش ہونے لگی اور جو گندے اور مخرب اخلاق افسانے ان کی بابت مشہور تھے، وہ اب رومن روایات کا جزو بن گئے۔ اور ان کی اشاعت تشکیک کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوا۔ سسرو بیان کرتا ہے کہ تھیٹروں میں جب اس مضمون کے اشعار پڑھے جاتے تھے، کہ دیوتاؤں کو دنیوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں، تو لوگ انھیں نہایت ذوق وشوق سے سنتے۔ اسی طرح پلوٹارک ایک تھیٹر کا واقعہ نقل کرتا ہے کہ جب تماشہ میں ڈراما کے جرائم دکھائے جا چکے تو ان کے خاتمہ پر ایک تماشائی

جوش مین بیخود ہو کر اُس ایکٹر سے جو یہ پارٹ کر رہا تھا مخاطب ہو کر کہا، کہ "خدا کرے تیری بھی ویسی ہی بیتی ہو، جیسی تو نے اپنے پارٹ مین ظاہر کی ہے" سینٹ آگسٹائین وغیرہ بھی حیرت کے ساتھ لکھتے ہین کہ یہ رومن بت پرست، مندرون مین تو دیوتاؤن کی پوجا کرتے تھے، اور تھیٹرون مین ان کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔ اس زمانے مین ایک گروہ ایسا بھی تھا، جو باوجود تشکیک و ارتیاب سخت وہم پرست و ضعیف الاعتقاد تھا، اور جس کا اثر تاریخ مذہب پر بہت گہرا رہا ہے۔ یہ گروہ ایک طرف یا تو سرے سے دیوتاؤن کے وجود ہی کا منکر تھا، یا کم از کم یہ مانتا تھا کہ معاملات دنیوی مین اُن کا کوئی دخل واثر نہین، لیکن ساتھ ہی دوسری طرف فال و نجوم، کہانت پیشینگوئی، کشف و کرامت وغیرہ مین پختہ اعتقاد رکھتا تھا ہزارہا طبیعی واقعات، مثلاً زلزلہ، دُمدار ستارہ، آندھی پانی، شہاب ثاقب، ان لوگون کے خیال مین ایک مخفی قوت واثر رکھتے تھے۔ فن نجوم کا اس زمانے مین بہت زور ہوا۔ بہ قول پلینی کے اس وقت یہ خیال، تعلیم یافتہ وغیر تعلیم یافتہ سب مین شایع تھا کہ ہر شخص کی تقدیر کا مالک ایک خاص ستارہ ہوتا ہے، جو اس کے وطن پر حاکم ہوتا ہے، اور خدا اکہ اُس نے ابتدا آفرینش ہی سے یہ انتظام کر دیا ہے، پھر کسی معاملہ مین دخل نہین دیتا۔ ایک ورمورخ جس کا شمار عہد شہنشاہی کے متاخرین مین ہے، لکھتا ہے، کہ ہزارہا آدمی، جو وجود باری تک کے منکر تھے اتنی جرأت نہ رکھتے تھے، کہ کوئی بڑا اور اہم کام کیا معنے، کھانا اور غسل کرنا تک شروع کرین، تاوقتیکہ ساعت نہ دیکھ لی ہو، یا تقویم مین مریخ کی جگہ کی تحقیق نہ کر لی ہو، یا یہ نہ دیکھ لیا ہو کہ قمر و عقرب مین کتنا فاصلہ ہے۔ غرض یہ کہ دیہات کو چھوڑ کر، باقی تمام ملک مین جمہوریت کے ایام آخری اور شہنشاہی کی پہلی صدی مین مذہب کا کہین نام ونشان نہ تھا، پس جو شخص اس زمانہ کی اخلاقی زندگی کے موثرات کا سراغ لگانا چاہتا ہے، اُسے چاہیے، کہ بجاے مذہب کے اُن نظامات فلسفہ کو پیش نظر رکھے، جو یونان سے آکر یہان پھیل گئے تھے۔

دنیا کی اخلاقی تاریخ مین، اور علی الخصوص رومن بت پرستون کی شہنشاہی کے دور آخر مین

زینو و اپیکورس کے نظریات کو جو عظیم اہمیت حاصل رہی ہے، اُس سے ممکن ہے، کہ ہمارے ذہن مین ان دونون حکیمون کی نہایت مبالغہ آمیز عظمت قائم ہو جائے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان حکماء کے نظریات کو جو مقبولیت عام حاصل ہوئی، اس مین ان کی قوت اجتہاد کو چندان دخل نہین، ان کا جو کچھ کارنامہ ہے، وہ یہ ہے کہ انھون نے اُن دو اخلاقی سانچون کی جو ہمیشہ اور ہر جگہ پائے گئے ہین، تعریف منضبط الفاظ مین کردی، دنیا مین ہمیشہ دو طرح کے آدمی پائے جاتے ہین۔ ایک وہ، جو ثبات، استقلال، وضبط نفس کے بہت بڑے حصہ دار ہوتے ہین، جو خودداری و نفس کشی کی بڑی سی بڑی آزمایشون مین پورے اُتر سکتے ہین، جن کا خمیر ایثار، دیانت داری جرأت و ہمت سے ہوتا ہے، اور جو حق و صداقت کے مقابلہ مین جان تک کی پروا نہین کرتے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہین جو ہر شے مین سہولت ڈھونڈھتے ہین، اور تحمل شدائد پر قادر نہین ہوتے، جو اپنی زندگی کو لطف و آسایش سے بسر کرنا چاہتے ہین، جو خوشخوئی، احباب پروری، ملنساری و لطف صحبت کو حاصل عمر سمجھتے ہین، اور جو شدید نفس کشی، ایثار، و جانبازی کے ناقابل ہوتے ہین۔ ان مین سے اول الذکر قسم کے لوگ طبعاً و فطرۃً رواقئین ہوتے ہین، اور ثانی الذکر لذتیین۔ اور وہ جب کوئی فلسفیانہ مسلک تلاش کرین گے، تو یہ بالکل قدرتی امر ہے کہ اپنے اپنے مذاق و مزاج کے مطابق اخلاقی سانچہ تلاش کرین گے۔ یعنی پہلے گروہ کے لوگ جذبات کو مغلوب رکھین گے ضبط نفس کو اس الفضائل قرار دین گے، اور فرض و منفعت کو ہمیشہ دو علحدہ چیزین خیال کرین گے۔ برخلاف اس کے دوسرا گروہ لطف معاشرت کو سب پر مقدم رکھے گا، اور کسی شے کے فرض ہونے کے مقابلہ مین اس کے مفید ہونے کو قابل ترجیح خیال کرے گا۔

لیکن اگرچہ ان معاملات مین انسان کی سیرت فطری اُس کے عقاید و خیالات کی تشکیل مین دخل عظیم رکھتی ہے، تاہم اس مین شبہ نہین، کہ افراد کی سیرت بجائے خود اپنی تشکیل کے لیے قومی حالات و خصوصیات پر منحصر ہے۔ مثلاً یونان و ایشیائے کوچک مین جو لطیف نفیس، و پُرتکلف تمدن

شائع تھا، اس کے لحاظ سے وہاں لذتیہ کے انداز کے بہت سے افراد آسانی سے پیدا ہو سکتے تھے، لیکن روم کے حالات اس کے بالکل برعکس تھے، روم ابتدا ہی سے رواقیت کا گہوارہ تھا، قبل اس کے کہ فلسفہ کے نام سے بھی آشنا ہوں، اہل روم اسی وقت سے رواقیت پر عمل کرنے لگے تھے، اور فلسفہ سیکھنے کے بعد اُن کا ادھر متوجہ ہونا تو بالکل مقتضائے قیاس تھا ایک ایسی بڑی قوم، جو متواتر جنگوں میں مشغول رہتی تھی، اور جنگیں بھی اس زمانے کی جنکے فتح کا فیصلہ، دولت و ثروت یا مادی سامان جنگ کی جگہ وطن پرستی کے جوش اور فوجی انتظام پر منحصر تھا، یہ لازمی تھا کہ قومی خصوصیات کی پوری قوت اپنے تئیں ایک مخصوص اخلاقی سانچہ یا انداز سیرت کی تشکیل پر صرف کرے۔ بچوں پر والد کی پوری افسری، زوجہ پر شوہر کی حکومت کامل غلام پر آقا کی مطلق الاختیاری، یہ تمام چیزیں مختلف مظاہر تھیں اُسی انتظامی قابلیت کا جس کا جلوہ اہم میدان جنگ میں نظر آتا تھا، حب وطن اور فوجی اعزاز، یہ دو تصورات رومن دل و دماغ میں ناقابل انفصال تھے، قومی زندگی، قومی عظمت، قومی ہستی، انھیں دو چیزوں سے عبارت تھی، اور فلسفہ اخلاق کے کسی نظریہ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس سے متاثر نہ ہو۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جنگ اگرچہ صدہا بداخلاقیوں کا مولد و منشا ہوتی ہے تاہم کم ازکم جانبازی کی تعلیم کے لیے تو اپنے سے بہتر کوئی مکتب نہیں رکھتی۔ آدمی کو کیسے جان دینا چاہیے؟ اس کا جنگ سے بہتر کوئی معلم ہو ہی نہیں سکتا۔ افراد کی طبیعت میں نزاکت کے بجائے رفعت و عالی حوصلگی پیدا کرنا، شرافت و عالی ظرفی کے بہتر سے بہتر کام انجام دینا، ذاتی غرضمندیوں پر آن و بان کو ترجیح دینا، جذبات کو قابو میں رکھنا، یہ سب نتائج جنگ کے ہوتے ہیں اسی طرح وطن پرستی بھی افراد میں اس استعداد کو اُبھار دیتی ہے کہ اپنے ذاتی منافع کو اجتماعی منافع کے سامنے مغلوب رکھیں، فضائے حیات کو وسیع کرنا، افراد میں ماضی کے اکابر رجال کی ہمسطحی کی اُمنگ پیدا کرنا، ان کی زندگی سے اخلاقی سبق حاصل کرنا، اور مستقبل پر اتنی نظر رکھنا کہ حال کی لذات و مسرات بھی اُس کی تابع رہیں، یہ اثرات وطن پرستی کے ہوتے ہیں، ان سب موثرات نے مل ملا کر

رومن زندگی کا نشو و نما اس حد تک پہنچا دیا جس کی نظیر اب کبھی نہین مل سکتی۔ اس زمانہ کی جنگ، فضائل ایثار کی بہترین معلم تھی، اس پر اضافہ کیجیے، قوت وطن پرستی کا۔ اب اہل شہر جو سیاسی و فوجی زندگی دونون کے خوگر تھے، وہ ان دونون موثرات سے متاثر بھی ہوئے، اور یہ تاثر اُن مین حد کمال تک پہنچ گیا۔ پھر ایک عرصۂ دراز کی زبردست حکومت سے چونکہ حکمرانی قوم کی سرشت مین داخل ہو گئی تھی، اس لیے ترفع و علو بھی قومی خصایص مین شامل ہو گئے۔

ان حالات کے اجتماع کے ساتھ یہ بالکل ناگزیر تھا، کہ رومن افراد کی سیرت کے خصایص امتیازی، رواقیت کے اجزاء ترکیبی ہون، قطع نظر اس کے کہ ہر شخص اپنے مذاق و مزاج کے موافق نظریۂ اخلاق انتخاب کرتا ہے، رومن افراد کے سرشت مین جو رواقیت سرایت کر گئی تھی، اس کا ایک سبب اور بھی تھا، اور وہ ان کا قدم قدم پر اپنے بلند پایہ اسلاف کے کارنامون سے سبق حاصل کرنا تھا۔ مسیحون کے پیش نظر جو اخلاقی نمونے تھے، وہ علی العموم یا تو فوق البشر ہستیان تھین، اور یا وہ بشر تھے جو مثل فوق البشر ہستیون کے تھے، یعنے جو دنیا سے بالکل ترک تعلقات کیے ہوئے گوشہ نشین رہتے تھے، لیکن روم و یونان مین اس کے برعکس جو اخلاقی نمونے، افراد کے سامنے تقلید و اتباع کی غرض سے پیش رہتے تھے، وہ انھین کے ابناے وطن کے تھے، یعنے ایسے لوگ جو اُسی اخلاقی فضا مین رہتے تھے، جو انھین مقاصد کے لیے جد و جہد کرتے تھے انھین دائرون مین گردش کرتے تھے، اور انھین خصائص قومی سے متصف تھے۔ اس زمانے مین اخلاقیات کے ہر مصنف کا یہ فرض تھا، کہ جن فضائل اخلاق کی وہ تعلیم دینا چاہتا تھا، اُن کی علمی نظیرین بھی وہ اپنے ہم وطنون کی زندگی سے پیش کرتا۔ میکزیمس نے، قدماء مصنفین کی تقلید مین ایک کتاب لکھی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ فضائل اخلاق کی اُس نے ایک فہرست دیدی ہے، اور ہر عنوان کے ذیل مین اپنے وطن یا دوسرے ملکون کے اکابر رجال کی زندگی سے عملی مثالین درج کر دیا گیا ہے۔ پلوٹارک کے الفاظ اس سلسلہ مین قابل دید ہین، وہ لکھتا ہے کہ

"ہم جب کسی امر اہم کو ہاتھ لگاتے ہین، یا کسی سخت ابتلا مین پھنستے ہین، تو اپنی آنکھون کے سامنے موجودہ یا گذشتہ اکابر رجال کی نظیر رکھ لیتے ہین، اور اپنے نفس سے یہ سوال کرتے ہین، کہ اگر فلاطون یا لائی سرگس یا فلان، یا فلان، نامور شخص اس موقع پر ہوتا، تو کیا کرتا؟ فلسفہ کا طالب علم جب کسی دقت مین مبتلا ہوتا ہے، یا کسی جذبہ کی حدت اُسے ستاتی ہے، تو وہ اعاظم رجال الاخلاق مین سے کسی کا عکس اپنے آئینۂ نفس مین اُتارنے لگتا ہے، اور اس سے اکثر اس کے قدم لغزش سے محفوظ رہتے ہین"

اس قسم کے فقرے قدیم اخلاقئین کی تصانیف مین کثرت سے آتے ہین جن سے اس حقیقت پر پوری روشنی پڑتی ہے، کہ لوگ اپنے فلسفۂ اخلاق کو کیسا اپنے مذاق طبیعت کے موافق ڈھال لیتے ہین، نیز اس امر پر، کہ قومی تاریخ کا جو بہترین دور ہوتا ہے اس کا اثر دور ما بعد پر باوجود اختلاف حالات بھی، کیسا گہرا رہتا ہے، اس لیے اس نتیجہ پر مطلق حیرت نہ کرنا چاہیے کہ شہنشاہی کے زمانے مین اگرچہ اکثر حالات بدل گئے تھے، تاہم رواقیت کا فلسفیانہ اثر و اخلاقی اقتدار اب بھی باقی تھا۔ اس مین شک نہین کہ لذتیت کی بھی اس دور مین اشاعت رہی، لیکن اس کو کوئی اخلاقی اہمیت کبھی نہین حاصل ہوئی، بلکہ یہ ہمیشہ بداخلاقی و تعیش کے لیے لوگون کے ہاتھ مین بطور ایک حیلہ کے رہی، یا زیادہ سے زیادہ اُسے اُن افراد نے اختیار کیا، جو پہلے ہی سے ضعیف الاخلاق تھے۔ اپیکورس، بے شبہ، بذات خود نہایت اعلیٰ سیرت اور بیداغ چال چلن رکھتا تھا، اور اُس نے جو اصول قائم کیے تھے وہ بہت بلند اور جملہ فضائل و محاسن پر حاوی تھے، بلکہ ہم تو یہانتک ماننے کو تیار ہین، کہ اس کے تلامذہ بھی بعض اخلاقی فضائل کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے، لیکن جس مسلک کی بنیاد لذت و مسرت پر ہو، وہ جنگی طوائف الملوکی کے زمانے مین شدید اخلاقی کشاکش کا کب تک مقابلہ کر سکتا ہے؟ اور رومیون کے جبلّی فضائل و رذائل دوسرے سے اس کی مقبولیت و کامیابی کے

مخالف تھے۔ ان کے تمام تخیلات ایک بالکل مختلف سانچہ مین ڈھلے ہوئے تھے اُن کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ لذتیت کے اثر مین آکر ایثار و نفس کشی کے جذبات اپنے اندر رکھ سکین، اور پھر ایپکیورس نے لذت کے جو دقیق اقسام قائم کیے تھے، اور انسان کی مسرت حقیقی کی تعریف کی تھی، یہ بھی رومیون کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اگر حصول لذت کی کوشش کرتے، تو بس عیش پرستیون کی انتہائی ہی صورتون پر جھک پڑتے۔ پس ایپکیورس کے مذہب کا رومن تاریخ پر جو اثر پڑا، اس کی حیثیت بالکل سلبی و منفیانہ رہی، یعنی صرف اس قدر کہ وطن پرستی و قومیت کے جوش خروش کو دبا کر، اور عام اخوت انسانی کے خیال کو چمکا کر اس نے مذہب مروجہ کے انحطاط و زوال مین اور عجلت کردی۔

فصل (۲)

رواقیت

جب لذتیت کی یہ حالت تھی، تو اخلاقی تعلیم کے ایجابی و تعمیری پہلو کا بار، لامحالہ رواقیت ہی کے شانہ پر آکر پڑا۔ چند حکماء، بے شبہ، ایسے تھے جو بعض حیثیات سے رواقیت کے مخالف معلوم ہوتے تھے، لیکن درصل ان کی تعلیمات کا ماحصل بھی بس اسی قدر تھا کہ رواقیت کی انتہائی صورتون سے جو نتائج صعب لازم آتے ہین، انھین ہلکا کردین۔ رواقیت کا ملخص یہ دو اصول بن سکتے ہین۔ ایک یہ کہ کردار انسانی کی غایت محض نیکی ہونا چاہیے، دوسرے یہ کہ عقل کے مقابلہ مین جذبات کو بالکل مردہ ہوجانا چاہیے۔ انھین دو اصول مین بعض رواقئین شدید مبالغہ و غلو سے کام لیتے تھے، اب مشائیہ[1] و بعض متبعین فلاطون کا کام یہ تھا کہ وہ اس غلو

[1] مشائیہ، متبعین ارسطو کو کہتے ہین، ارسطو ٹہل ٹہل کر لکچر دیا کرتا تھا، اور عربی مین "مشی" ٹہلنے کو کہتے ہین، اسی سے حکمت مشائی، مشائیہ وغیرہ الفاظ مشتق ہین۔

وافراط کی آنچ کو ذرا دھیما کرتے رہتے تھے، اس قدر ان لوگون کو بھی تسلیم تھا کہ نیکی و منفعت دو متباین چیزین ہین، اور یہ کہ اعمال انسانی کا محرک خاص نیکی کو ہونا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ اس کے بھی قایل تھے، کہ لذت و مسرت بھی نیکی ہی کی ایک صنف ہے، اور اس کا لحاظ رکھنا واجب نہین۔ جذبات پر عقل کی افضلیت کے یہ منکر نہ تھے تاہم یہ اس کے قائل نہ تھے کہ جذبات کو بالکل مردہ ہی کر دینا چاہیے۔ غرض یہ کہ دوسرے حکما اگرچہ رواقیت کے بعض جزئیات مین ترمیم و تغیر کر دیتے تھے تاہم اس کے اصل الاصول سے انھین مطلق اختلاف نہ تھا، ہم ابھی کہہ چکے ہین، کہ رواقیت کا مایۂ خمیر دو اصول سے تھا، ایک ایثار، دوسرے جذبات کشی صفحات ذیل مین ہمین یہ دکھانا ہے کہ قدیم اخلاقی زندگی مین ان دونون اصولون کا عکس کہانتک نظر آتا ہے۔

پہلے اصول کا سب سے زیادہ نمایان عکس اُس جان فروشی مین نظر آتا ہے جس کا محرک جذبۂ وطن پرستی تھا۔ اس جذبہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود ایثار و سرفروشی کے انتہائی نمونہ پیش کرنے کے فاعل کو اس مین کسی صلہ یا نفع کی مطلق توقع نہین ہوتی اور اس بنا پر کہہ سکتے ہین، کہ ایثار کی جتنی صورتین معروف ہین، اُن سب مین بڑھ چڑھ کر یہ وطن پرستی کا ایثار ہے۔ رومہ و اسپارٹا کے باشندے اپنے وطن کی خاطر اپنی جان محض اس لیے دیتے، کہ انھین اس سے محبت تھی، نہ اس لیے کہ اس سے اُنھین کسی صلہ کی توقع تھی، ممکن ہے، کہ ”ثواب شہادت“ کا خیال ہو۔ لیکن یہ لوگ درحقیقت اس خیال سے آشنا تک نہ تھے۔ رہا شہرت بعد مرگ کا خیال، تو ظاہر ہے، کہ اگر یہ محرک تھا بھی، تو صرف اُنھین لوگون کے لیے ہوسکتا تھا جو اکابر و مشاہیر مین سے تھے۔ عام افراد کا تو اس کی طرف وہم و گمان بھی نہین جاسکتا تھا، حالانکہ عام افراد نہایت کثرت سے بغیر صلہ سرفروشیان کرتے رہتے تھے اس طرح کے بیشمار نظایر کو دیکھ کر آیندہ نسلون مین یہ خیال پیدا ہونا بالکل قدرتی تھا، کہ فرض و منفعت دو بالکل متباین چیزین ہین۔ اور سچ یہ ہے کہ جس کثرت سے رواقیت نے اپنے زمانہ عروج مین، انتہائی ایثار

وفرض شناسی و بغرضانہ سرفروشی کے شواہد پیش کیے، اس کی نظیر اور کہین نہین ملتی، یہ ایک علیحدہ بات ہے، کہ خود فرائض کی جو تعریف اُن کے ذہن مین تھی، وہ کہانتک صحیح تھی۔

گزشتہ باب سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا، کہ محرکات اخلاق چار مختلف عنوانات کے تحت مین رکھے جا سکتے ہین۔ ایک صورت تو یہ ہے، کہ لوگون کو یہ یقین دلادیا جائے، کہ نیکی کا نتیجہ نیک ہوتا ہے، اور بدکاری کا بد، جیسا کہ عام طور پر دنیا مین ہوتا رہتا ہے، نیز آخرت کی جزا و سزا۔ اس طریق استدلال کا آخری ٹکڑا، یعنی جزا و سزا کا خیال صرف انھین لوگون پر موثر ہو سکتا ہے، جو مذہبی حیثیت سے اعتقاد راسخ رکھتے ہین۔ رہا جزو اول یعنے دنیوی مکافات عمل تو اس کی واقعیت بھی بہت کچھ سوسائٹی کے حالات اور اس کے مرتب و منتظم ہونے پر موقوف ہے۔ کیونکہ بعض مرتبہ جماعت کی حالت ایسی بھی ہوتی ہے، کہ اس مین نیکی کا معاوضہ نیک، اور بدی کا معاوضہ بد نہین نکلتا۔ اس کے علاوہ، افراد کے ذاتی حالات و خصوصیات مزاج کو بھی اس طرز استدلال سے متاثر ہونے مین بہت کچھ دخل ہے۔

دوسرا طریقہ، لوگون مین یہ عقیدہ ذہن نشین کر دینے کا ہے، کہ معصیت و نفس مین وہی نسبت ہے، جو مرض و جسم مین ہے، گویا نیک کرداری اور صحت نفسی مرادف ہین بعینہ جس طرح صحت جسمانی بذات خود ایک مرغوب و دلپسند شی ہے، عام اس سے کہ اس سے کوئی اور مسرت انگیز نتائج پیدا ہون یا نہ ہون، اسی طرح نفس کا تمام امراض یعنی معاصی سے پاک رہنا فی نفسہ ایک محبوب شی ہے، جو خارجی مسرات سے بالکل بے نیاز ہے۔ نیکی و بدی کی یہ تعریف افلاطون[ل] کے فلسفۂ اخلاق کا ایک رکن اہم تھا۔ رواقیین نے اسے اس قدر اہمیت تو نہین دی، تاہم

ل "جو تعلق جسم و صحت کے درمیان ہے، وہی نفس و اخلاق کے درمیان ہے، اور بداخلاقی متوازی ہے بیماری کے..... اب صحت جسمانی صرف اسی لیے پسندیدہ نہین کہ اس سے انسان دنیا کی دیگر لذات و مسرات سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ یہ شی یعنی عدم عوارض فی نفسہ ایک خوش کن حالت ہے.... اسی طرح ایک با اخلاق شخص کو دہری مسرت حاصل رہتی ہے، ایک تو خود خوش اخلاقی کی (بقیہ آیندہ)

اس کی اصلیت کو تسلیم کیا، اور اس کے بعد سے کم و بیش تمام حکما اخلاق اسے تسلیم کرتے آئے ہین۔ یہ اصول، نفس مین علو و عظمت پیدا کرنے مین خاص طور پر معین ہے کہ اس سے انسان بجاے اپنے منفرد اعمال پر علیحدہ علیحدہ نظر کرنے کے اپنے ذہن کی عمومی و عادی حالت پر نظر کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے۔

تیسرا محرک اخلاق یہ ہو سکتا ہے، کہ ہر عمل نیک سے انسان کو مسرت و لذت حاصل ہو۔ اس مین اور محرک ماقبل مین فرق یہ ہے، کہ اُس مین نفس کی ایک عام و عادی مطمئن کیفیت سے مدد لی گئی ہے، اور اس مین اُس کے برعکس یہ بتایا گیا ہے کہ فرداً فرداً ہر نیک کام سے نفس مین ایک انبساط پیدا ہوتا ہے۔ یہ انبساط ہر نیکی کا نتیجہ ہوتا ہے، گو فیاضانہ افعال مین یہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔

یہ تینون محرکات اخلاق اگرچہ مسرت کی صورتین مختلف دکھلاتے ہین، یعنے پہلا محرک خارجی مسرات کو پیش نظر رکھتا ہے، اور پچھلے دونون، داخلی و نفسی مسرت و انبساط کو، لیکن نفس حصول مسرت مین سب شترک ہین، لیکن ان کے علاوہ ایک چوتھی صورت اور بھی ممکن ہے، جو ضمیرئین اور ان کے مخالفون کے درمیان فارق اصلی ہے۔ اس محرک کا ملخص ان الفاظ مین رکھا جا سکتا ہے، کہ انسان کی فطرت اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ احساس فرض، بجاے خود اس قدر قوت رکھتا ہے کہ نفع و مسرت کی تمام قیود سے آزاد ہو کر بھی انسان کو نیک کرداری پر چلا سکتا ہے۔ اس کی قوت نہ حالات گرد و پیش کی شرمندۂ احسان ہے، نہ معتقدات مذہبی کی، اور اس سے متاثر ہونے کے لحاظ سے ہر شخص مساوی ہے، خواہ مسیحی ہو یا غیر مسیحی، خواہ معاد کا قائل ہو یا منکر۔ اس اصول کی بنا پر انسان طبعاً یہ شناخت کر لیتا ہے کہ فلان طریق عمل اس کی زندگی کا منتہاے مقصود ہے، اور اس پر وہ کاربند ہونے لگتا ہے، خواہ اُسے تکلیف ہی کیون نہ ہو، اور مختلف افعال، بلالحاظ اپنے نتائج کے،

(بقیہ از صفحہ ۱۴۵) اور دوسری اس کی کہ خوش اخلاقی دوسرے مسرت بخش نتائج کے حصول مین معین ہوتی ہے، اور اسی طرح بد اخلاقی کی زندگی اپنے صوجب کے لیے دو گنے عذاب کا باعث ہوتی ہے، ایک تو اس لیے کہ یہ شی فی نفسہ مذموم ہے، دوسرے اسلیے کہ دیگر نتائج مذموم کی جانب ہادی ہوتی ہے" (فلاطون، ملخصہ گروٹ)

بجائے خود محمود یا قبیح ہوتے ہیں۔

ان چیزوں کا ذکر تو میں گزشتہ باب میں کر چکا تھا، یہاں ان کے اعادہ سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ دورِ رواقیت میں ان میں سے اعلیٰ ترین محرکات کا نفوس انسانی پر جو عظیم الشان اثر تھا، اس کی نظیر کسی زمانے میں نہیں ملتی۔ خود غرضی و ذاتی مسرت کی تمام صورتیں رواقیت میں قطعاً حرام تھیں اس کا اصول دلیں یہ تھا کہ جو چیزیں ہمارے ارادہ و اختیار میں نہیں، ان کی طرف سے ہمیں بالکل مستغنی رہنا چاہیے۔ دنیوی کامیابیوں کی جانب اپنے ذہن کو غیر ملتفت رکھنا چاہیے۔ اور اس لیے محرکات عمل میں مصلحت اندیشی کی کوئی جگہ ہی نہیں رہتی۔ اپنے اس اصول کی تفسیر و تشریح میں وہ انسانی تمناؤں و آرزوؤں کی بے ثباتی، اور تارک الدنیا اشخاص کی جمعیت خاطر و سکون نفس پر بہت مبالغہ کے ساتھ زور دیتے تھے جس عہد میں رواقیت اپنے اوج کمال پر تھی، وہ رومن شہنشاہی کا وہ زمانہ تھا، جو بظاہر اسباب، اس طرح کی تعلیمات کی اشاعت کے لیے بالکل ہی ناموزوں تھا اس دور میں، یہ قول ٹیکیٹس کے کسی شخص کو نیکی کی راہ پر چلانا گویا اُسے سرِ طے موت دینا تھا۔ اور اس سے پیشتر تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا تھا جبکہ حیوانی قوت کی اس سے زیادہ پرستش کی جاتی ہو، جبکہ مادی لذات کی خواہش اس سے زیادہ عالمگیر ہو، یا جبکہ سیہ کاری کو لوگ اس سے زیادہ فخریہ بیان کرتے ہوں، لیکن ان حالات مخالف کے باوجود بھی، رواقیت ایسی تعلیم پر عمل درآمد کراتی رہی جس میں ایثار، نفس کشی، خود فراموشی کے سوا کسی دوسری شے کا شائبہ تک نہ تھا، اور پھر جو لوگ اس پر عامل تھے، وہ کوئی مذہبی پرجوش افراد نہ تھے، جو صلۂ اخروی کے متوقع ہوں، بلکہ وہ لوگ تھے جن کی بہت معتقدات سے عقیدۂ بقائے روح بکسر خارج تھا۔ یہ عقیدہ گھٹنے تو اسی زمانے سے لگا تھا جب روم میں فلسفہ کے دخل کے ساتھ تشکیک بھی داخل ہوئی تھی، پھر جوں جوں قدیم مذہبی افسانوں کی لغویت ظاہر ہونے لگی، اور لاادریت کی اشاعت ہونے لگی،

یہ گویا بالکل ہی مٹ گیا، حالانکہ سسرو، پلوٹارک بہت کچھ سر پٹکتے رہے سسرو ہی کی ایک تصنیف مین ایک کیریکٹر نے جو خیال ظاہر کیا ہے، اُس مین اُس نے اپنے معاصرین کے جذبات کی حرف بحرف صحیح ترجمانی کی ہے، وہ کہتا ہے، کہ جب تک افلاطون کی تصانیف میرے سامنے کھلی ہوئی رہتی ہین، مین اس کے دلائل کو مستحکم سمجھتا رہتا، اور عالم ارواح کے وجود پر یقین رکھتا رہتا ہون، لیکن جون ہی مین انھین بند کر دیتا ہون تمام استدلالات مجھے لچر اور بودے معلوم ہونے لگتے ہین، اور عالم ارواح کا وجود محض وہمی رہ جاتا ہے" اسی طرح ڈراما نویس اینیس، تھیٹر مین ایکٹرون کی زبان سے یہ اظہار خیال کر کے تماشائیون سے خراج تحسین وصول کرتا تھا، کہ دنیوی معاملات سے دیوتاؤن کو کوئی سروکار نہین، سیزر سینٹ (ملکی مجلس شوریٰ) مین بیٹھکر علانیہ یہ کہتا تھا، کہ موت کے بعد کچھ نہین ہوتا ہے" اور کوئی اس سے اختلاف نہین کرتا تھا، پلینی، جو اپنے زمانے مین غالباً سب سے بڑا عالم تھا، کہا کرتا تھا، کہ حیات بعد الموت کا اعتقاد، وہم بلکہ ایک طرح کا جنون ہے۔ خود رواقیین نے اس بارہ مین عجیب تلون کا اظہار کیا ہے۔ ابتداءً اُن کا عقیدہ یہ تھا، کہ روح انسانی موت کے بعد ایک مدت خاص تک قائم رہتی ہے اس کے بعد قیامت آنے پر تمام ارواح، روح اعظم مین اس طرح جذب ہو جائینگی، جیسے جزو کل مین مل جاتا ہے، لیکن ان کے ایک امام کری سپس نے اسے صرف ارواح نیک کردار کے ساتھ مخصوص کر دیا، اور رومہ کے رواقیین کو تو اس قدر تسلیم کرنے مین بھی تردد تھا۔ اس اصول کے تسلیم کر لینے سے، کہ نیکی اپنا صلہ آپ ہے، ان کو یہ ماننے کی بھی ضرورت باقی نہین رہی، کہ بعد موت جزا و سزا ہوگی، اور اس اصول پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ صلۂ اُخروی کا خیال اُن کے ذہن سے بالکل ہی زائل ہو گیا۔ پینٹیس جو عمری رواقیت کا بانی تھا اس کا قائل تھا، کہ جسم کے ساتھ روح پر بھی فنا طاری ہو جاتی ہے، اور اس کی رائے کی تائید ایپکٹیٹس و کارنوٹس جیسے ائمہ رواقیت نے کی ہے سینیکا نے اس باب مین بالکل تناقض خیالات کا اظہار کیا ہے مارکس آرلیس مین بیشک اس خیال کی کچھ جھلک نظر آتی ہے

مگر بہت ہی دھندلی یہ حالت ائمہ رواقیت کی تھی، عام طور پر یہ حال تھا کہ لوگوں کو حیات بعد الموت کا اگر یقین تھا بھی تو بہت ضعف و تذبذب کے ساتھ، اور اس عقیدہ کو بہ طور محرک اخلاق کے انھوں نے کبھی بھی نہیں پیش کیا۔ بلکہ بہ حیثیت مجموعی یہ کہنا، بالکل ایک واقعیت کا اعادہ کرنا ہے کہ رواقیت نے جس نے ایثار و نفس کشی کے ایسے انتہائی نمونے پیش کیے جن کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی، اور جو بہ لحاظ تعمیم اثر کسی قوت سے کمتر نہیں رکھی جا سکتی، اپنے سارے نظام اخلاق میں حیات بعد الموت کے عقیدہ سے کہیں مدد نہیں لی۔ قدیم بت پرستانہ لٹریچر میں جس کتاب میں عالی ظرفی و اخلاق فاضلہ کی سب سے بہتر و مکمل تعلیم دی گئی ہے، وہ سسرو کی کتاب De Officiis ہے، جو تمامتر مشہور رواقی حکیم پینیٹیس کی تصنیف کی تفسیر و تشریح ہے، اسی طرح عملی زندگی میں جو سب سے زیادہ پر عظمت نمونہ ہمارے علم میں ہے، وہ ایک دوسرے امام رواقیت ایپکٹیٹس کا ہے، جو ایک نہایت جابر و شقی القلب آقا کا ایک مریض و بدشکل غلام تھا۔ اپنی آخر زندگی میں اسے آزادی نصیب ہوئی، مگر بالکل عارضی، کیونکہ چند ہی روز میں اسے جلا وطن ہونا پڑا۔ یہ نامور رواقی ایک طرف تو موت کو ہستی انسانی کا قاطع سمجھتا تھا، مگر دوسری طرف اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے اپنے تئیں فضائل اخلاق کا مجسمہ بنائے ہوئے تھا، اور اپنے پیچھے ایسی تصانیف چھوڑ گیا ہے، جن کا ایک ایک حرف مکارم اخلاق و فضائل انسانی کی زندہ تصویر ہے، اور جن کی تاثیر آج، ہزارہا سال گزرنے پر بھی، بایں اختلاف حالات و طبایع بدستور قائم ہے۔

شہرت، و بقائے نام کی خواہش ایسی تھی جس سے رومن اخلاق بے حد متاثر تھا، اور اس کو دبانے کے لیے رواقیہ نے سر توڑ کوششیں کیں۔ بلکہ تا وقتیکہ رومن نفوس پر اس جذبہ کی وسعت و عالمگیری کا اندازہ نہ کر لیا جائے، رواقیین کے مواعظ و نصائح بجائے خود مبالغہ آمیز و غیر ضروری معلوم ہوں گے۔ یہ رواقیین ہی کے پند و نصائح کا اثر ہوا کہ رومن افراد کی سیرت میں خلوص کا عنصر قائم رہا، اور نمود و نمائش کا مرض عالمگیر نہ ہونے پایا۔ سسرو ایک مقام پر اصول

رواقیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جو شخص یہ نہیں جانتا کہ معصیت سے بہر صورت محترز رہنا چاہیے، خواہ وہ اس قدر مخفی ہو کہ انسان کیا معنی خدا تک کی نظر اس پر نہ پڑے وہ فلسفہ کے مفہوم صحیح سے نا آشنا ہے، اور اصلی فضائل اخلاق کے لقب کی مستحق وہ نیکیاں ہیں، جو بلا اظہار، اور نگاہ بشری سے مستور رکھ کر انجام دی جاتی ہیں" اسی طرح کے بیشمار فقرے رواقیین کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں ہم ذیل میں ہم چند، بطور نمونے کے پیش کرتے ہیں۔

"جو کچھ کرو، وہ اتباع ضمیر میں کرو۔ لوگوں کے خوش کرنے کے لیے نہ کرو" (سنیکا)

"جو شخص اپنی نیکیوں کا اعلان کرتا ہے وہ نیک کردار نہیں، بلکہ جویاے شہرت ہے" (سنیکا)

"اُس شخص سے بڑھ کر نیک کردار کوئی نہیں ہوسکتا، جو اپنی ناموری، مقبولیت، وہر دل عزیزی کو گنوانا گوارا کرتا ہے، مگر اپنے ضمیر کا خون کرنا نہیں چاہتا" (سنیکا)

"میں مدح وستایش کا مخالف نہیں، لیکن اسے نیکی کی غایت و مقصود ہرگز نہیں قرار دے سکتا" (پرسی اس)

"اگر تم لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کوئی کام کررہے ہو، تو اپنے مرتبۂ شرف انسانی سے گر گئے ہو" (ایپکٹیٹس)

"بڑے شخص کی عظمت میں اس سے ذرہ بھر بھی کمی نہیں ہوتی، کہ وہ مجہول الحال وخاکسار ہے" (سنیکا)

"یہ کبھی نہ بھولو، کہ انسان کے لیے بالکل ممکن ہے کہ متقی ہونے کے ساتھ ہی وہ غیر معروف وگمنام بھی ہو" (مارکس آریلیس)

"جو شے اچھی ہے، وہ فی نفسہ اچھی ہے، کسی کی مدح وستایش سے اس کی

اچھائی مین کچھ اضافہ نہین ہوجاتا،، (مارکس آریلیس)

اس طرح کے اقوال سے رواقیین کا سارا لٹریچر لبریز ہے،

مارکس آریلیس نے، فیثاغورث کی تقلید مین، اپنے تئین اس کا خوگر کر لیا تھا، کہ موت کے ساتھ ہی برابر اُن متمدن جماعات کا تصور کرتا رہتا تھا، جو آج پردۂ ہستی سے بالکل معدوم ہوگئی ہین، اور اس طرح شہرت و بقاے نام کی بے ثباتی کوششون کا نقشہ پوری طرح اس کے ذہن مین جم گیا تھا، پلینی نے رواقی مطمح نظر کو ملخصاً ان لفظون مین بیان کردیا ہے، کہ "مرد وہ ہے، جو نام ونمود کی مطلق پروا نہین کرتا، اپنے تمام اعمال کو اپنے ضمیر کا تابع رکھتا ہے، اور نیکی کا صلہ، بجاے دوسرون کی مدح وستایش کے خود نیکی ہی مین تلاش کرتا ہے" لذتیین، نیکی کی لذت بخشی پر زور دیتے تھے، اور کہتے تھے، کہ ہم نیکیون کی راہ اس لیے اختیار کرتے ہین، کہ اس سے مسرت افزائی ہوتی ہے، لیکن رواقیین اس کے یکسر منکر تھے، اُن کا، اس باب مین، جو خیال تھا، اُس کا اندازہ اقتباسات ذیل سے ہوسکتا ہے:-

"مسرت، ہمارے اعمال کے ہمراہ ہو تو ہو، لیکن اُن کی رہنما نہین ہوسکتی" (سنیکا)

"ہم نیکی کو اس لیے نہین دوست رکھتے، کہ اس سے لذت حاصل ہوتی ہے، بلکہ چونکہ اسے دوست رکھتے ہین اس لیے اس سے لذت بھی حاصل ہوجاتی ہے" (سنیکا)

"دانشمند آدمی ہرگز ارتکاب معصیت نہ کرے گا، خواہ وہ معصیت عبد ومعبود دونون کی نظر سے پنہان ہو، کیونکہ اس کے لیے اجتناب معاصی کا محرک خوف تعزیر نہین، بلکہ نیکی کی ذاتی واصلی خوبی ہے" (پری گرنیس)

"نیکی پر کسی صلہ کا متوقع ہونا ایسا ہی ہے، جیسے آنکھ بصارت پر اور پیر مشی پر

کسی صلہ کی متوقع ہوں،،   (مارکس آرلیس)

"نیک کردار شخص کی مثال، درخت انگور کی سی ہے، جس کا کام صرف اتنے پر ختم ہو جاتا ہے کہ انگور پیدا کرے۔"   (مارکس آرلیس)

خلاصہ یہ کہ رواقی نقطۂ خیال سے حیات انسانی کی یہ غایت نہیں، کہ دنیا یا آخرت میں مسرت حاصل ہو، بلکہ صرف یہ کہ انسان صداقت و فرض شناسی کا سر رشتہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

باب ہذا کے شروع میں ہم یہ کہہ آئے ہیں، کہ رواقیت کے اصول امتیازی دو ہیں۔ اب تک جو گفتگو ہوئی اصول اول سے متعلق تھی۔ اصول ثانی ہم نے یہ بتایا تھا، کہ عقل کے مقابلہ میں جذبات کو مردہ کر دیا جائے۔ اب چند الفاظ اس سلسلہ میں بھی کہنا ہیں۔

جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے، سیرت انسانی کے دو بالکل مختلف سانچے ہوتے ہیں، جو علی الترتیب سیرت رواقی و سیرت لذتی کے بالکل مطابق ہوتے ہیں۔ یعنی ایک وہ جس میں قوت ارادی غالب ہوتی ہے۔ اور دوسری وہ جس میں جذبات و خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ طبقۂ اول کا نیک کردار شخص وہ ہوتا ہے، جو ایک کام کو محض اس لیے کرتا ہے کہ فرض شناسی سے اس پر مجبور کر رہی ہے، حالانکہ اس کے ذاتی جذبات یا گرد و پیش کے حالات اُسے سمت مخالف میں لیے جاتے ہیں۔ طبقۂ ثانی میں نیک کردار شخص، وہ ہوگا جس کی فطرت اس قدر سلیم واقع ہوئی ہے کہ اس کے جذبات و خواہشات جبلۃً نیکی ہی کی جانب مائل ہوں۔ ان میں سے اول الذکر ہی شخص ایسا ہے، جسے ہم حقیقی معنی میں فضائل اخلاق سے آراستہ، اور ایثار و جانبازی کا اہل تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کے ثانی الذکر شخص جس بیباختگی و اضطرار کے ساتھ اعمال حسنہ انجام دیتا ہے، اُس کے لطف و حسن سے پہلا شخص قطعاً محروم ہے۔ جو شخص باوجود حرص و طمع کی کشمش کے محض احساس فرض کی بنا پر فیاضی کرتا رہتا ہے، اور ہر موقع پر سخت سے سخت ترغیبات مخالف پر غالب آکر جادۂ مستقیم پر قائم رہتا ہے، وہ بے شبہ ہماری عزت و تعظیم کا

سب سے زیادہ مستحق ہے، لیکن ہماری محبت اور دلی لگاؤ کا سب سے بڑھ کر حقدار وہ نہیں بلکہ وہ شخص ہے، جسے نیکی کرتے ہوئے کوئی جد و جہد نہیں کرنا پڑتی، بلکہ جو محض اپنے لطف کے خاطر اضطراراً و عادۃً اعمال حسنہ انجام دیتا رہتا ہے۔ ان دونوں اخلاقی سانچوں کے متوازی دو تعلیمی نظریات بھی ہیں۔ ایک کا مقصد قوت ارادی کو تقویت پہونچانا، اور دوسرے کی غرض خواہشات کی تہذیب ہے۔ پہلے نظریہ کے عملی نمونہ اسپارٹا، ورواقیین، اور کسی قدر مسیح کے ساتھ عہد وسطی کے نظامات تعلیم میں ملتے ہیں۔ ان سب کا مقصد مشترک یہ تھا کہ افراد میں تحمل شدائد، ضبط خواہشات، ترک لذائذ، اور مغلوبیت جذبات کی قابلیت پیدا ہو۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا طریق تعلیم جو آج کل رائج ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ نیکی کو ہر طرح دلفریب بنا کر پیش کیا جائے، اس میں تخیل کی مدد سے ہر طرح کی کشش پیدا کی جائے، اور اس طرح نیکی اور مسرت میں رفتہ رفتہ ایک طرح کا تلازم و ترادف پیدا کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان میں پہلا نظام تعلیم اُن جماعات کے لیے زیادہ موزوں ہے جن میں عسکریت کی روح زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور نسبۃً منتشر و غیر منتظم ہوتی ہیں۔ یہ طرز تربیت قوت ارادی کو تقویت پہونچاتا ہے اور اس سے افراد میں جذبات ایثار و خود فراموشی خوب پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دوسرا طریق تربیت زیادہ شائستہ و متمدن جماعات میں شائع ہوتا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جوں جوں تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے، ایثار کی مثالیں نادر الوقوع ہوتی جاتی ہیں، اور اخلاق کے اجزاء لطیف زیادہ نشو و نما حاصل کرتے رہتے ہیں۔ قدیم جماعات جن حالات میں تھیں اُن کا اقتضاء طبعی یہ تھا کہ اول الذکر قسم کے نظام تعلیم و اخلاق کی اشاعت ہو، چنانچہ یہی ہوا، اور ان میں رواقیین نے اسے مبالغہ کی حد تک پہونچا دیا، خاص کر ان کا یہ عقیدہ تو ایک انتہا پر تھا کہ جذبات تمام امراض متحد النوع ہیں، اور اس عقیدہ کے ثبوت میں جو دلائل استعمال کیے جاتے تھے، وہ بعینہ اس طرح کے تھے جیسے آج حکمائے الٰہیین خدا کی ہستی پر استعارۂ جذبات ٹھہر ٹھہر کے انتساب پیش کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ طبیعت میں انتشار پیدا ہونا، خواہ وہ کسی صورت سے بھی ہو، ضعف و نقصان کی علامت ہے

اور اس لیے جس ہستی مین جذبات موجود ہون، وہ کبھی کامل نہین کہی جاسکتی۔
بہ قول اُن کے، ہم مین سے ہر شخص مین جبلتہً یہ احساس موجود ہے کہ حیوان ناطق کے پاس
بہترین و اعلیٰ ترین قوت عقل کی ہے، جسے اُس کے تمام قوی پر افسری حاصل ہونا چاہیے۔ اس واسطے
جو کام جذبات کی ماتحتی مین انجام پاتا ہے، خواہ وہ بجاے خود کیسا ہی محمود و مستحسن ہو، بہر حال
عقل کی رہبری سے خارج، لہذا قابل ترک ہے۔ اس اصول کی تمثیل و تشریح مین سنیکا دو
ایسی کیفیات نفسی کو پیش کرتا ہے، جو باہم بہت مشابہ ہین، لیکن ان مین سے ایک فضیلت
ممتاز ہے، اور دوسری معصیت شدید۔ رافت، و رحم، عموماً یہ دو اوصاف متحد سمجھے جاتے ہین
لیکن سنیکا کہتا ہے کہ یہ ایک شدید غلطی ہے۔ رافت نفس کی ایک عام و عادی کیفیت ہے، جو ظلم و شقاوت
کی ضد ہے، اور جسکے باعث انسان عقوبت جرائم مین نرمی و لینت کرتا ہے۔ بہ خلاف اس کے کسی کو
مبتلاے مصیبت دیکھ کر اس پر رحم آجانا ایک جذبی کیفیت ہے، جو کمزوری قوت ارادی کی علامت
ہے، اور اس لیے واجب الترک ہے۔ رافت کا تعلق عقل سے ہے۔ رؤف شخص عمومی عاقبت بینی الشی
کے ساتھ کام کرتا ہے۔ حالانکہ رحم دل شخص ایک مغلوبات الجذبات شخص ہوتا ہے جو کسی کے
درد و دکھ کو دیکھ کر تاب نہین لاسکتا، خود بے اختیار ہوجاتا ہے اور اس کے درد مین شریک
ہوجانا چاہتا ہے۔ کسی کو ہنستے دیکھ کر ہمین بھی ہنسی آجائے، یا کسی کو انگڑائی لیتا ہوا دیکھ کر
ہم بھی انگڑائی لینے لگین، تو یہ کوئی ہماری قوت کی دلیل نہ ہوئی، بلکہ عین ہماری عصبی کمزوری
کی علامت ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو روتا دیکھ کر ہم بھی آبدیدہ ہوآئین، تو یہ صاف اس امر کا اظہار
ہے کہ ہم پر جذبات غالب ہین، اور ہم اپنے اوپر ضبط و قابو نہین رکھتے۔ رقیق القلبی و رحم دلی
عین نامردی ہے۔ اخلاقی حیثیت سے جو امر دوہ ہے جو اپنی نیکیون کو کبھی اور کسی حالت مین
کم نہونے دے۔

سسرو کا ایک مقولہ جسے درحقیقت بیان روایت کہنا چاہیے، یہ ہے کہ، ہومر نے
صفات انسانی کو خداؤن کی جانب منسوب کردیا، حالانکہ بہتر ہوتا اگر وہ صفات ربانی کا انسان

کی طرف انتساب کرتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رواقئین صفات ربانی کی تقلید مین
کس قدر غلو و مبالغہ سے کام لینے لگے تھے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر ہم مختلف اقوام کے
فضائل اخلاق کی تاریخ پر نظر رکھین، تو ہمیشہ اس نتیجہ پر پہونچین گے کہ بت پرستون کے یہان
ام الفضائل عقل و ارادہ کی تہذیب، اور عیسائیون کے یہان جذبات کی تہذیب ہی ہے۔
محبت کی جگہ دوستی، خیر و خیرات کی جگہ مہمان نوازی، ہمدردی کی جگہ رافت، یہ قدما کے
فضائل مخصوص رہے ہین۔ رواقئین نے، جو قدما مین بھی اپنی جذبات کشی مین ممتاز تھے
جب یہ دیکھا کہ ان کی تعلیمات سے انسانی فیاضی و ہمدردی کا سرچشمہ خشک ہوا جاتا ہے
تو طرح طرح کے دلائل سے اس کی کوشش کی، کہ انسان مین مستدل اور ریا آمیز جذبات
نیکی کی خواہش پیدا ہو اور پھیلے۔ چنانچہ وہ اخوت انسانی پر خاص طور سے زور دیتے تھے
اور اس سے نتیجہ یہ نکالتے تھے کہ ہر شخص پر دوسرون کی بہبود و فلاح کی کوشش کرنا واجب
بلکہ فرض عین ہے۔ اس عقیدہ کو وہ نہایت موثر مواعظ و پند کی صورت مین ظاہر کرتے تھے
اور فلاطون کے اس قول سے سند پکڑ کر کہ معاصی و جرائم، جہالت و ناواقفیت سے پیدا
ہوتے ہین، وہ اس حد تک بڑھ گئے تھے، کہ معصیت کو مرض کی ایک صنف خیال کرتے تھے
اور تعزیر کے بجاے صرف اس کے انسداد کو کافی سمجھتے تھے۔ لیکن رواقئین کی رفع
تناقض مین یہ کوششین خواہ نظری حیثیت سے کتنی ہی کامیاب رہی ہون، تاہم عملی
حیثیت سے ان کی یہ ملمع سازی ذرا بھی چلنے والی نہ تھی۔ ایک طرف تو آپ جذبات کو بالکل
فنا کیے رکھتے ہین، اور دوسری طرف اس کی بھی تمنا رکھتے ہین کہ انسان مین شریفانہ
جذبات پیدا ہوتے رہین! اس سے بڑھ کر کیا نافہمی ہو سکتی ہے! عملی زندگی مین اس تعلیم کا
جو نتیجہ ہونا تھا، وہ ان دو مختصر مثالون سے ظاہر ہو جائے گا۔ انکساغورس سے جب
لوگون نے کہا کہ آپ کے لڑکے کا انتقال ہو گیا، تو اس نے بہ کمال سکون و متانت
جواب دیا کہ "یہ تو میرا کبھی خیال نہ تھا کہ میری اولاد غیر فانی ہے" یا جب اسٹلپو کا وطن

برباد ہو چکا، اُس کے گھر مین خاک اُڑنے لگی اور اس کی لڑکیون کو دشمن گرفتار کر لے گئے تو بغیر اس کے کہ اُس کے جذبات مین کچھ بھی ہیجان پیدا ہو، یہ کہا کہ "فلاسفر اس طرح کے تمام گرد و پیش کے حالات سے غیر متاثر رہتا ہے" خود غور کرو کہ بھلا اس طبیعت کے اشخاص مین کبھی شرافت و دردمندی کا گزر ہو سکتا ہے! جو لوگ اس تعلیم کے خوگر ہون کہ والدین کو اپنی اولاد، یا شوہر کو اپنی بیوی کی خبر وفات کو بالکل بے اعتنائی کے کانون سے سننا چاہیے، یا ایک فلسفی اپنے کسی عزیز ترین دوست کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر چاہے اپنی آنکھین تر کر لے، لیکن اپنے سینے مین کوئی درد یا بے چینی ہرگز نہ پیدا ہونے دے ایسے اشخاص کو مستی انسانیت سے کیا واسطہ؟ وہ لوگ جو تکلیف و درد کا احساس ہی نہین رکھتے، ان سے یہ کیونکر توقع کی جا سکتی ہے، کہ کسی حالت مین وہ دوسرون سے ہمدردی کر سکین گے؟

رواقیین مدعی تو اس کے تھے کہ نیکی تمام ہے عمل مطابق فطرت کا، لیکن اس باب مین اُن کی تعلیمات ان کے اس دعوی کی بالکل معارض ہین۔ کیونکہ فطرت انسانی کا اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ وہ کوئی بسیط شی عقل یا ارادہ کی مرادف نہین، بلکہ متعدد قوی و جذبات کے مرکب کا نام ہے، جس مجموعہ کے مختلف اجزاء مختلف مدارج رکھتے ہین، اور کسی ایک جزو کو باقی اجزاء پر فضیلت دے لینا صریحاً فطرت بشری کی غلط تشخیص کرنا ہے جس کا نتیجہ مضر ترین نتائج کی صورت مین ظاہر ہونا یقینی ہے۔ رواقیین، بہ حیثیت فلسفی کے، یہ چاہتے تھے، کہ ان کے نظام فلسفہ مین کوئی تناقض نہ رہنے پائے، ساتھ ہی یہ بھی گوارا نہ تھا، کہ فیاضی و ہمدردی کا بالکل سد باب ہو جائے۔ اس دُہرے مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھین عجب عجب طریقے برتنا پڑے، عجب عجب اصول وضع کرنا پڑے، لیکن حاصل یہ ہوا کہ ان کی تعلیمات پر تصنع کا رنگ پوری طرح چڑھ گیا، ان کے سلسلہ استدلال کی کڑیان بے تھین کہ۔

تمام معاصی مساوی الرتبہ ہیں،
کوئی ایسی شیٔ جس سے ہماری قوت ارادی متاثر نہ ہو
معصیت نہیں کہی جا سکتی، اس لیے رنج والم،
درد وغم، معاصی نہیں،

اس یکطرفہ نقطۂ نظر کا قدرتی اقتضا یہ تھا کہ ان کی نظر بہت محدود ہو جائیں، اور ان کے خیالات میں وسعت کی جگہ تنگی آ جائے، چنانچہ یہی ہوا۔ اور اس حقیقت نے مختلف مظاہر اختیار کیے، مثلاً ایک نتیجہ یہ ہوا، کہ رواقیین کا قدم علمی ترقی میں آگے نہ بڑھ سکا جس وقت ان کے معاصر لذتیین، وہم پرستیون کو مٹانے کے لیے طبیعات وسائنس کے مطالعہ میں مشغول تھے، رواقیین اپنی ساری کوششیں، اخلاق پر محدود کرتے ہیں محدود رکھے تھے، اور اس کے سوا کسی اور چیز کو ہاتھ لگانا حرام سمجھتے تھے۔ یا پھر مثلاً جب کہ قدیم شعرا کا موضوع انسان کی روز افزون ترقی کی مدح ہوتی تھی، تو رواقیین برابر اپنے اسی محور پر گردش کرتے رہے، کہ زمانہ سلف کی سادگی ہر صورت قابل تقلید ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں متبعین زینو میں بہت سے افراد ایسے ہوئے ہیں جو بلندی اخلاق کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی ہیں، وہاں ان میں ایک غیر معمولی تعداد ان افراد کی بھی پائی جاتی ہے جن کی اخلاقی بلند آہنگیون کی ان کی عملی زندگی میں قدم قدم پر تردید ہوتی تھی مثلاً کیٹو جو فلسفیون تک کے لیے پاکیزگی اخلاق کا نمونہ ہوا ہے، اپنے غلامون کے ساتھ انتہائی ظلم وشقاوت سے پیش آتا تھا۔ بروٹس، سود خواری، اور اخذ سود کی شدت میں ضرب المثل تھا، یہانتک کہ متعدد اشخاص کو جو اسے سود کی پوری رقم نہ دے سکے تھے اس نے قید کرا دیا، اور حالت قید میں وہ بھوک سے مر گئے، سالیوسٹ کی زبان ہمیشہ کی زاہدانہ سادگی کی مدح میں خشک ہوئی جاتی تھی، بااینہمہ وہ شخص تھا جو ایسے زمانے میں جبکہ شہوت پرستی اپنے تمام ہونے کی بنا پر چندان معیوب نہیں خیال کی جاتی تھی،

شہوت پرستی مین خاص طور پر بدنام تھا۔ اور تو اور، خود حضرت سنیکا، سرآمد حکماء رواقیین باین اتقا و تفلسف، خوشامد، ضمیر فروشی، و اخلاقی کمزوری کے داغ سے اپنے دامن کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اور لوسن، (مشہور رواقی شاعر) کے بابت تو یہ کہنا بالکل امر واقع کا اظہار کرنا ہے، کہ جس شخص کو یہ دیکھنا ہو، کہ رومن نظم مین خوشامد و دنیا سازی کس ذلیل ترین سطح تک گر سکتی تھی، وہ اس کے کلام کو پڑھ لے۔

رواقیت سے ایک اصولی غلطی تو یہ ہوئی کہ اُس نے انسان کی فطرت کو نہین پہچانا اور اس کے جذبات سے قطع نظر کر کے اُسے صرف ایک ہستی ذی عقل تصور کر لیا۔ دوسری غلطی اسی درجہ کی یہ ہوئی کہ اُس نے جو معیار قائم کیا، وہ دنیا کی عام حالت کو دیکھ کر نہین بلکہ مخصوص و استثنائی سیرتون کے اندازہ سے۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ زندگی گویا ایک شعر ہے، جس مین عامل موثر صرف تخئیل قوی ہی ہو سکتی ہے، حالانکہ زندگی نام ہے معمولی و جزئی واقعات کے مجموعہ کا۔ ایسے حالات، جن مین محیر العقول شجاعت و ایثار، یا عظیم الشان خطرات کے مقابلہ کا کام پڑے، شاذ و نادر ہی کبھی پیش آئین، تو آئین۔ پس نظام اخلاق کو عام و معمولی سیرتون کے مطابق ہونا چاہیے، نہ کہ غیر معمولی و استثنائی سیرتون کے موافق مسیحیت نے اس نکتہ کو خوب سمجھا۔ اس نے جو مذہبی قواعد مقرر کیے ہین، اُن کے سمجھنے اور برتنے مین، عام افراد کو نہ کوئی خاص جد و جہد کرنا پڑتی ہے، اور نہ اپنے قوت متخیلہ پر زور دینا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اصول و قواعد ایسے ہین، جو غیر محسوس طور پر عام افراد کی روزانہ زندگی کا جزو بن گئے ہین۔ برخلاف اس کے رواقیت، جو تمام فضائل اخلاق کو مساوی المرتبہ سمجھتی ہے، جو رذائل اخلاق مین کسی طرح کا فرق مراتب نہین روا رکھتی، اور جو اُن تمام جذبات و تحریکات کو جو عام افراد کی زندگی مین حرکت پیدا کرتے رہتے ہین، یکسر فنا کر دینا چاہتی ہے، صریحاً ایک عام مذہب بننے کے لیے بالکل غیر موزون ہے۔ اُس کے اصول اگر مؤثر ہو سکتے ہین، تو صرف اعلیٰ ترین شخصیتون کے افراد پر، اور اس واسطے اگر عوام نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا،

تو اُس پر مطلق حیرت نہ کرنا چاہیے۔

غرور و فخاری دو بالکل مختلف چیزین ہین۔ فخار شخص دوسرون سے داد لینے کے لیے اُن کے سامنے اپنی فخر کی باتین بیان کرتا ہے، اور ان کی مدح و تحسین سے خوش ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے مغرور شخص دوسرون کی آفرین و ستایش سے بالکل مستغنی ہوتا ہے، اور صرف اپنے نفس کی تعریف سے خوش ہوتا ہے۔ رواقیت نے خودداری و ضبط نفس کا جو نظام قایم کیا تھا، اس کی بنیاد غرور پر تھی۔ اعتماد نفس کا مرتبہ رواقیت نے اس درجہ بڑھایا تھا، کہ توبہ و استغفار کی کوئی گنجایش ہی نہین باقی رہی تھی۔ رواقیین کے نزدیک معصیت کی حقیقت اس سے زاید کچھ نہ تھی، کہ وہ ایک طرح کا مرض ہے، جسے دور کرنا تو بے شبہ انسان کا فرض ہے، لیکن اس کے اسباب کی چھان بین کرنا یا اُس پر تاسف کرنا ضرور نہین۔ ایپکٹیٹس وغیرہ نے مختلف مواعظ مین بتایا ہے کہ انسان کو موت کے وقت کیا کیا کرنا چاہیے، لیکن ان مین توبہ و استغفار کا کہین ذکر تک نہین، اور نہ وہ اس کے قائل تھے کہ دعا و استغفار سے روح کو تازگی و فرحت حاصل ہوتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ فضائل اخلاق کا اکتساب آیا انسان کے لیے خود اختیاری ہے، یا تقدیر الٰہی کا نتیجہ ہے، تو اس بارہ مین خود قدما مین باہم سخت اختلاف ہے۔ اہل یونان ایک طرف گئے ہین، اور اہل روما دوسری طرف۔ اہل یونان انھین تقدیر الٰہی کا نتیجہ خیال کرتے ہین۔ ہومر بار بار یہ کہتا ہے کہ شجاعت، غضب، وغیرہ خصایص اخلاق براہ راست، خدا کے پیدا کردہ ہین، اسی طرح وہان کا مشہور شاعر عسقلیوس ہر جذبہ کو سلسلہ تقدیر ربانی کی ایک کڑی قرار دیتا ہے، بلکہ اپنی اس لاجواب نظم مین، جس مین اُس نے ملکہ کلیٹمنسٹرا کا قصہ بیان کیا ہے، اس مین اگرچہ انتہائی خوفناک جرائم، اور دردناک مناظر دکھائے ہین، لیکن یہ خیال اس داستان خونین مین سب سے بالا رکھا ہے، کہ جو کچھ ہوا، سب حکم خداوندی سے ہوا؛ چنانچہ جب مظلوم و مقتول تاجدار کی لاش منظر عام پر لائی گئی، اور یہی اس افسانہ کا سب سے زیادہ پر درد باب ہے، تو اس نے حاضرین کی زبان سے ان الفاظ کو ادا کیا ہے کہ

"خدا کی مرضی یہی تھی۔ خداے رب الاعلیٰ، احکم الحاکمین کی مرضی یہی تھی، کہ
بلا اس کی مرضی کے پتا تک نہیں ہل سکتا"

لیکن اہل روما کا خیال اس کے بالکل مخالف تھا۔ یہ لوگ اس حد تک تو یونانیوں کے ہم خیال تھے کہ دولت و ثروت، عزت و وجاہت، وغیرہ بالکل خداداد ہوتی ہیں، لیکن اس کے قائل نہ تھے کہ انسان اپنے خصائص اخلاقی کے لحاظ سے بھی بندۂ تقدیر ہے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جذبات و احساسات بالکل انسان کے اختیار میں ہوتے ہیں اور ان میں انسان اپنی ذاتی کوشش سے اتنی ترقی کر سکتا ہے کہ دیوتاؤں کے ہم پلہ ہو جائے۔ اس کا اندازہ مختلف حکما کے اقوال ذیل سے ہو سکتا ہے:-

"ہمیں اپنے فضائل اخلاق پر ناز کرنا بالکل بجا ہے۔ ہاں اگر یہ ہمارے خود اختیاری نہ ہوتے، بلکہ منجانب اللہ ہوتے تو البتہ بیجا تھا" (سسرو)

"نوع انسانی کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ دولت و وجاہت خدا کی طرف سے اور حکمت و اخلاق بندہ کی طرف سے ہے" (سسرو)

"سمجھدار آدمی کو خدا سے صرف ان چیزوں کی دعا کرنی چاہیے، جو خدا کی طرف سے ملتی ہیں مثلاً زندگی، یا دولت۔ رہا سکون خاطر و اطمینان نفس تو وہ بندہ کے اختیار میں ہے" (ہوریس)

"اخلاقی خود اعتمادی بنیاد ہے سکون قلب کی" (اپکیورس)

"اپیکورس گو انسان تھا، مگر دیوتاؤں سے قوت میں بڑھ کر تھا، کیونکہ ان کے امکان میں صرف کھانے پینے کا سامان پیدا کرنا ہے، بہ خلاف اس کے اپیکورس نے فضائل اخلاقی کا راستہ بتا دیا" (لکریشیس)

"اپنی دعاؤں کا موضوع یہ رکھو، کہ بیمار کو صحت ہو جائے، کمزوری قوی ہو جائے وغیرہ لیکن ان کے علاوہ کچھ چیزیں ایسی ہیں، جو صرف تمہاری ذاتی

کوشش پر منحصر ہین“ (جوینل)

”اسی طرح پر فلاسفر کا مرتبہ خدا سے بڑھ کر ہوتا ہے، خدا کی ماہیت ہی مین یہ داخل ہے کہ وہ کسی سے خوف نہ کرے، لیکن فلاسفر جرأت و بیخوفی اپنی کوشش سے کسب کرتا ہے“ (سنیکا)

”بجز اس کے کہ وہ فانی ہے، اور تو کسی حیثیت سے فلاسفر کا مرتبہ خدا سے کم نہین ہوتا“ (سنیکا)

”دانشمند کی علامت یہ ہے کہ وہ نیکی و بدی خود اپنے ہی سے پیدا کرتا ہے“ (ایکٹیٹس)

”جہان تک عقلی و اخلاقی زندگی کا تعلق ہے، دانشمند شخص خدا سے کم نہین ہوتا“ (آرین)

لیکن رواقیت نے عبد و معبود کے نوعیت تعلق کی یہ جو تعلیم دی تھی، اس کی تردید خود ہی اپنے بعض دوسرے مسائل کے ذریعہ سے کر دی تھی۔ مثلاً وجود باری کا جو تصور اُن کے ذہن مین تھا، وہ یہ تھا کہ ذات باری وحدت وجود رکھتی ہے، جو اپنے تئین ربوبیت و فضیلت اخلاق کی دو شکلون مین ظاہر کرتی ہے، اور ہر انسان مین روح ربانی حلول کیے ہوئے ہے، بلکہ یون کہنا چاہیے کہ انسان اُس بحر بے پایان کا ایک جزو ہے۔ سسرو کا قول تھا، کہ کوئی بڑا شخص ایسا نہین ہوا، جس مین اس کی عظمت القا ہوئی ہو“، سنیکا کہتا تھا کہ ”خدا سے کوئی شی پوشیدہ نہین۔ وہ ہمارے خیالات و افکار کے اندر ہے۔ وہ ہمارے ضمیر مین حلول کیے ہوئے ہے“ یہی فلاسفر ایک اور موقع پر کہتا ہے کہ ”ہم مین سے ہر شخص کے اندر ایک روح مقدس رہتی ہے جو ہمارے اعمال کی حاکم و نگران ہے۔ خدا سے علیحدہ ہو کر کوئی شخص نیک نہین ہو سکتا، اور نہ بغیر اس کی مدد کے کوئی شخص بدنصیبیوں پر غالب آسکتا ہے۔ وہی ہم مین جذبات عالیہ و خیالات رفیعہ پیدا کرتا ہے۔ ہم مین سے ہر نیک شخص کے اندر خدا موجود ہے، پارکس آرلیس کی

ہدایت ہے کہ ”اس خدا کے آگے جو تیرے اندر موجود ہے، تو اپنی فرض شناسی کا ہدیہ پیش کر“
... اعتقاد کے لیے یہ کافی ہے کہ تو اس روح ایزدی پر جو تیرے اندر ہے، یقین رکھے، اور
اس کی پرستش کرتا رہے“

اس طرح کی عبارتیں رواقی مصنفین کے یہاں بہ کثرت ملتی ہیں لیکن اس سے
بھی زیادہ ان کے اس دعوی کی تکرار ملتی ہے، کہ نیکی نام ہے ذات باری کو اسوۂ حسنہ قرار دیکر
اس کی تقلید کا۔ افلاطون نے کہا تھا، کہ ”خدا کی مشابہت کرو“، رواقیین نے اس کی تفسیر
وتائید میں دفتر کے دفتر رنگ ڈالے، اور شیوۂ تسلیم ورضا کو انسان کے لیے اعلیٰ ترین فرض
قرار دیدیا۔ جذبات کشی تو ان کا اصول اولین تھا، اس کے ڈانڈے بھی اس عقیدہ سے
مل گئے۔ اور قدم قدم پر اس طرح کے مواعظ ارشاد ہونے لگے:۔

”رونا، آہ وزاری کرنا، شکوہ وشکایت زبان پر لانا صاف بغاوت کرنا ہے“
(سنیکا)

”خوف زدہ رہنا، مغموم وافسردہ رہنا، غضبناک رہنا، سرکجا باغی
ہونا ہے“ (مارکس آریلیس)

”اے بنی آدم، تیری حیثیت اس دنیا میں ایک ایکٹر سے زائد کچھ نہیں۔ تیرا
کام صرف اتنا ہے کہ جو پارٹ تجھے دیا گیا ہے، اسے خوبی کے ساتھ ادا
کردے۔ ایکٹر کو اس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ اسے حاکم کا پارٹ دیا گیا
ہے، یا کسی مفلس کا یا کسی لوُلے لنگڑے کا، اس کا کام اسی قدر ہے، کہ جو پارٹ
ہو، اسے اچھی طرح ادا کرے“ (ایپکٹیٹس)

”کسی شی کی بابت نہ کہو کہ وہ ضائع یا فنا ہوگئی، بلکہ یہ کہو کہ تم نے وہ واپس
کردی۔ تمہاری بیوی بچوں کا اگر انتقال ہوگیا، تو تم نے ان کی جانیں اسی کو
واپس کردیں، جس نے وہ دی تھیں۔ زمین اگر تمہارے قبضہ سے نکل گئی

تو وہ بھی تم نے واپس ہی کر دی۔ تمھین اس سے کیا بحث کہ معطی اپنے
عطایا کو کس کے ذریعہ سے واپس لیتا ہے" (ایپکٹیٹس)

"خدا نیک بندون کو ہمیشہ خوش نہین رکھتا۔ وہ انھین آزماتا ہے، اور
اپنی طرف بلانے کے لیے تیار کرتا ہے" (سنیکا)

"جو خدا کے محبوب و منظور نظر بندے ہوتے ہین، اُن کی وہ آزمایش کرتا
ہے، اور طرح طرح کی سختیون مین مبتلا کرتا ہے۔ اور جو یہان، بے غم و بے فکر
رہتے ہین، وہ آیندہ غم والم، عذاب، عقوبت مین مبتلا ہون گے" (سینکا)

ان اقتباسات سے، جنھین ہم نے یہان صرف مشتے نمونہ از خروارے نقل کیا ہے، یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ غرور خودی کی جو تحریک، رواقیت سے پیدا ہو چلی تھی، اُسے خود رواقیت نے ذات باری کے تحت مین لا کر کیسا دبا دیا۔ مگر اس سے ایک اور خرابی کا اندیشہ پیدا ہو چلا۔ ایسے مذہب کا، جو انسان کو تمام تر شیوۂ تسلیم و رضا کا خوگر بناتا ہے، جو جذبات کو بالکل فنا کر دینا چاہتا ہے، اور جس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو حالات سے قطعاً غیر متاثر رہنا چاہیے، حشر سوا اس کے اور کیا ہو سکتا تھا، کہ اس کے متبعین مین ایک جمود کامل پیدا ہو جائے، اور نیک کرداری کی کوئی اُمنگ نہ باقی رہے؟ یہ نتیجہ پیدا ہونا یقینی تھا، لیکن ایک اور سبب ایسا پیش آگیا جس نے اس اندیشہ کو باطل کر دیا اور وہ اخلاق مین سیاسیات کا اشتراک تھا۔ درحقیقت قدما کے دماغ مین سیاسیات کو جو اہمیت حاصل تھی، اس کا آج کل تصور کرنا بھی دشوار ہے، اخلاق، علم، معاشرت، غرض زندگی کے ہر شعبہ مین حب الوطنی کا خیال اور سب خیالات کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ بڑے سے بڑے حکما، بڑے سے بڑے شعرا، بڑے سے بڑے ارباب فکر و تصنیف بلحاظ اپنے پیشے کے سپاہی یا اہل سیاست ہی ہوتے تھے۔ اس حالت کا قدرتی اقتضا یہ تھا، کہ فضائل اخلاق کی عمارت فضائل سیاسی ہی کی بنیاد پر قائم ہو گئی تھی، اور حکما جتنے نظریات قائم کرتے، اُن سب کی تہ مین سیاسی مصلحت اندیشیان

ہی کام کرتی نظر آتین۔ فلاطون نے تعدد ازدواج کی محض اس بنا پر حمایت کی، کہ ملک مین وطن پرستون کی تعداد مین اضافہ ہوگا۔ ارسطو کا سارا نظام اخلاق، یونانی وغیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے۔ اور اجماع حکماء سے فضائل اخلاق کی جو فہرست تیار کی گئی تھی، اس کا عنوان اولین حب الوطنی تھا۔ ہم اس سے ناواقف نہین، کہ انکساغورس کا یہ قول تھا کہ اُس کا اصلی وطن آسمان ہے، اور اس لیے زمین کے کسی حصہ مین جلا وطنی اُس کے نزدیک کچھ بھی مضائقہ کی بات نہین، لیکن یہ استثنائی واقعات ہین۔ عام اتفاق اس پر تھا، کہ حب الوطنی ایک اخلاقی فرض ہے، اور فرض بھی ایسا کہ تمام دوسرے فرائض کا سرتاج۔ سسرو کا یہ قول، اُس کے ذاتی خیال کا نہین، بلکہ اُس کے معاصرین کے عام احساس وعقیدہ کا ترجمان ہے، کہ "وطن کی محبت کو تمام اعزہ کی محبت پر غالب وفائق ہونا چاہیے، اور جو شخص حب وطن مین اپنی جان دینے کو آمادہ نہین اُسے کوئی حق نہین کہ وہ دنیا کے سامنے اپنی فضیلت اخلاق کو پیش کر سکے"۔

وطنیت پر اس قدر زور دینے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا، کہ قدیم اخلاق نے ایک بالکل عملی شکل اختیار کر لی تھی۔ بے شبہ حکماء اخلاق کی یہ تاکید تھی کہ افراد کو اپنی حوصلہ مندیان محدود کرنا چاہیے، اور بعض حالات مین پبلک معاملات سے بالکل کنارہ کش ہو جانا چاہیے، تاہم علی العموم سیاسی زندگی مین نمایان حصہ لینے پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا، اور رہبانیت وترک دنیا کو نہ صرف معیوب بلکہ قطعاً ناجائز قرار دے دیا گیا تھا۔ سسرو کا قول تھا، کہ "نیکی نام ہے عمل کا"۔ پلینی روایت کرتا ہے، کہ اُس نے ایک بار ایک رواقی حکیم سے تاسف کے لہجہ مین کہا، کہ سرکاری کام سے اُسے اب فلسفیانہ مشاغل کی بہت کم مہلت ملتی ہے۔ لیکن حکیم مذکور نے جواب دیا، کہ "نہین اس مین افسوس کی کوئی بات نہین سیاسی معاملات مین مصروف رہنا تو خود ہی ایک فلسفیانہ مشغلہ ہے، اگر یہ سرکاری کاروبار نہ پیش رہے، تو اصول فلسفہ پر عمل درآمد کا کہان موقع ملے"۔ رواقیین کے یہان مقولہ

خاص شہرت رکھتا تھا، کہ نوع انسانی گویا ایک جسم ہے، جس کے ہر عضو (فرد) کا یہ فرض ہے کہ وہ سارے جسم کے نفع و بہبود کے لیے کام کرتا رہے۔" مارکس آریلیس، جس سے بڑھکر رواقیین میں پاکیزگی اخلاق کا کوئی عملی نمونہ نہیں مل سکتا، دنیوی معاملات میں ایسا منہمک تھا، کہ پورے انیس سال تک دنیاے متمدن پر فرمان روائی کرتا رہا۔ تھریسیا ہلویڈیس، کارنوٹس، وصدہا دیگر راسخ الاعتقاد رواقیین نے محض دفع استبداد کے پیچھے اپنی جان دے دی۔

جن لوگوں نے جذبات کو اس قدر مغلوب کر لیا تھا، جو خودداری و ضبط نفس کے پتلے بن گئے تھے، اور جن میں فرض شناسی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی، اُن پر قدرۃً اُن چیزوں کا خوف غالب نہیں آسکتا تھا جن سے عام نفوس کو دہشت ہوا کرتی ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے فلسفہ کا ایک خاص مقصد یہ بنا رکھا تھا کہ انسان کو موت کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ زندگی کی بے ثباتی کے یقین، اور جو شے ایک روز سب کو پیش آنی ہے اُس کے اعتقاد نے ان کے دلوں کو ایسا پختہ کر دیا تھا، کہ نہ وہ انقلابات دہر سے ڈرتے تھے، اور نہ موت سے دہشت کھاتے تھے۔ لیکن ہر وقت موت کا تصور بھی اچھا نہیں ہوتا، اس سے ایک دوسری خرابی پیدا ہو گئی، یعنی بقول بیکن کے رواقیین موت کو خیر مقدم کہنے کے لیے اس قدر اہتمام کرتے تھے، کہ اُن کا یہ اہتمام بجاے خود موت کو اور زیادہ وحشتناک بنائے ہوئے تھا۔ اسپنوزا نے کیا خوب کہا ہے، کہ "دانشمند کبھی اس چیز پر نہیں سوچتا، کہ مرنا کیونکر چاہیے، بلکہ اس فکر میں رہتا ہے کہ زندہ کیونکر رہنا چاہیے اور ایک حکیم جس موضوع پر سب سے کم غور کرتا ہے، وہ موت ہے" استقبال موت کی بہترین صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے تئیں کسی نہ کسی دھندے میں ہر وقت لگائے رکھے، خوف کی اصل شے خود موت نہیں، بلکہ موت کا تصور ہے، اور اس کا سب سے اچھا توڑ یہ ہے کہ انسان کو مشغولیت کے سبب موت کا تصور کرنے کی مہلت ہی نہ ملے

ورنہ اگر موت کی تصویر ہر وقت نظر کے سامنے پھرتی رہیگی، تو ایک نہ ایک طرح کی پست ہمتی وافسردہ خاطری ضرور آجائے گی، اور یہ ترقی تمدن کے حق مین سخت مضر ہے۔

قرون وسطیٰ مین جو بہت سے نیم بت پرستانہ افسانہ مشہور تھے، اُن مین سے ایک یہ ہے کہ آیرلینڈ مین بہ مقام منسٹر ایک جھیل مین دو جزیرہ تھے۔ ان مین سے ایک کا نام جزیرۂ حیات تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے حدود کے اندر موت کا کبھی گزر نہین ہوسکتا تھا۔ لوگ پیدا ہوتے، بڑے ہوتے ضعیف ہوتے، بیمار پڑتے ضعیف ہوتے چلے جاتے تا آنکہ اُن کی تمام قوتین جواب دیدیتین، مگر موت کبھی نہ آتی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان لوگون کو اپنی زندگی وبال معلوم ہونے لگی، اور مرگ کی تمنا مین رہنے لگے۔ آخر کار ایک مرتبہ یہ رخت سفر باندھ کر کشتیون مین بیٹھ دوسرے جزیرہ کی طرف روانہ ہوئے اور جب وہان پہونچ گئے، تو ان کی دلی آرزو و تمنا پوری ہوئی، یعنے اجل نے انھین میٹھی نیند سلادی۔

یہ افسانہ جس مین بجائے مسیحیت کے بت پرستی کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے، آئینہ ہے اُس خیال کا، جو رواقیین کا موت سے متعلق تھا۔ قدما اس بابت تو بے شبہ سخت مختلف الرائے تھے، کہ پس مرگ، روح کا کیا حشر ہوگا، لیکن اتنے جزو پر سب متفق تھے کہ موت کوئی خوفناک شئے نہین، بلکہ زندگی کا ایک بالکل قدرتی انجام ہے، جس سے ڈرنا صرف وہمی لوگون کا کام ہے۔ بہ قول اُن کے موت ہی ایک ایسی شئے ہے، جس سے ہمین تکلیف پہونچنا ممکن ہی نہین، کیونکہ جب تک ہم ہین (یعنی ہم مین احساس باقی ہے)، موت نہین، اور جب موت آگئی، تو ہم کہان باقی رہے (یعنی احساس تکلیف تو خود ہی فنا ہوچکے گا) موت نام ہے اُس طبعی و قدرتی حالت کا، جو ہستی کی ضد ہے۔ وہ جس طرح ہستی کے بعد طاری ہوگی اُسی طرح ہستی سے پیشتر بھی طاری ہوچکی ہے، جس طرح مرنے کے بعد ہم معدوم ہوجائین گے اُسی طرح پیدایش کے قبل بھی معدوم تھے، شمع جس طرح بجھنے کے بعد خاموش ہے،

ویسے ہی جلنے کے قبل بھی تھی۔ یہی حالت انسان کی بھی ہے۔ پس مرگ و قبل تولد، دونون حالتین اُس کے لیے یکسان ہین۔ موت کو ہادم اللذات نہ سمجھو، بلکہ ہادم الآلام خیال کرو۔ موت وہ شے ہے، جو بندہ کو ظالم آقا سے چھڑاتی ہے، اسیر کو زندان سے نکالتی ہے، دردمند کو شفا بخشتی ہے، اور مفلس کو افلاس کے عذاب سے نجات دیتی ہے۔ یہ فطرت کی طرف سے انسان کو بہترین نعمت عطا ہوئی ہے، کہ اسی پر اُس کی تمام پریشانیون کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس سے گریز کرو یا نہ کرو، یہ بہرحال یاد رکھو، کہ یہ سلسلۂ حیات کی آخری کڑی ہے، جس کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ ترکیب پانے سے پیشتر ہمارے عناصر جس انتشار کی حالت مین تھے، دوبارہ پھر اسی حالت مین لوٹ جائین۔

یہ ماحصل تھا اُن مہمات مسائل کا جن سے ادب قدما کی وہ خاص صنف لبریز ہے، جسے "تسلیات" سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا بانی کرنیٹر خیال کیا جاتا ہے، اور جس کے نمونہ سسرو، پلوٹارک، وجامر، داقیین کی تصانیف مین کثرت سے ملتے ہین۔ سسرو نے افلاطون کی تبعیت مین، محرکات بالا پر عدم فنا روح کا بھی اضافہ کردیا ہے۔ پلوٹارک بھی ان سب عقائد کا قائل تھا، گو وہ ان نتائج پر کہانت وغیرہ کے راستہ سے پہونچا ہے۔ رواقیین اگرچہ بقاے روح کے قطعی منکر کبھی نہین ہوئے، تاہم اس عقیدہ نے اُن پر کبھی محرک اعمال کی قوت نہین حاصل کی۔ اس سلسلہ مین سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بُت پرستانہ فلسفہ مین موت کے ساتھ عقوبت و تعزیر کا تصور کہین بھی وابستہ نہین ملتا، بلکہ ہر جگہ اس کو اس سے بے واسطہ رکھا گیا ہے۔ سقراط کہتا ہے کہ موت یا تو زندگی کو ختم کردیتی ہے، اور یا اسے جسم کی قید سے آزاد کردیتی ہے۔ شق دوم مین تو وہ ایک کھلی ہوئی نعمت ہے اور شق اول مین بھی اُس کے پسندیدہ ہونے سے انکار نہین ہوسکتا۔ سسرو کے الفاظ بھی اسی کے قریب قریب ہین "روحین موت کے بعد یا تو قائم رہتی ہین، یا فنا ہوجاتی ہین، اگر شق اول صحیح ہے، تو انھین مسرت ابدی حاصل

رہتی ہی، اور اگر شق دوم صحیح ہو، تو وہ آلام و تکالیف سے ایمن ہو جاتی ہین" ابیکورس اپنے خیال کو یون ادا کرتا ہی کہ "یہ خوب سمجھ لو، کہ موت کوئی تکلیف دہ شی نہین ہو سکتی کیونکہ لذت والم تابع ہین حس کے، اور موت عین فقدان حس ہی" سنیکا کے ایک دوست پولیبیس کے بھائی کا جب انتقال ہوا، تو اُس نے اُسے تعزیت نامہ مین لکھا کہ

"اگر مردون کو کچھ بھی احساس باقی رہتا ہی، تو تمھین اپنے متوفی بھائی کی حالت پر خوش ہونا چاہیے، کہ اُسے زندگی کی قید سے رہائی حاصل ہو گئی اور اب وہ ایک بلند چوٹی سے اہل دنیا کے کاروبار و عجائبات قدرت کو سکون و اطمینان سے دیکھ رہا ہی، اور اُن اسرار ربانی کو حل کر رہا ہی جنھین حل کرنے کی عمر بھر ناکام کوشش کرتا رہا۔ بہر حال ایسے شخص کی حالت پر جو یا تو معدوم محض ہی، اور یا مسرور ہی تاسف کرنا محض بیمعنی ہی"

لیکن اگرچہ اس مسئلہ پر روم و یونان دونون کے حکما کا اجماع عام تھا تاہم عوام کے ذہن مین جو تخیل قائم تھا، وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ عوام موت کے نام سے لرزتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد انھین غیر محدود عقوبتون کو برداشت کرنا ہوگا، بلکہ یونانی زبان مین وہم پرستی کے لیے جو لفظ ہی، اُس کے لغوی معنی ہی "دیوتاؤن کی دہشت" کے ہین، اور یونانی علم الاساطیر کا عالم جانتا ہی، کہ موت کی دہشت سے متعلق وہان صدہا افسانے مشہور تھے۔ ایسے تماشے کثرت سے تھے، جن مین شدائد جہنم کے سخت سے سخت دہشتناک مناظر دکھائے گئے تھے۔ خود لذتیت کا جو دلون سے ان دہشتون کو نکال دینے کے لیے آئی تھی، جس گرمجوشی سے استقبال کیا گیا، اُس سے پتہ چلتا ہی، کہ لوگ ان وہم پرستیون سے کتنا تنگ آگئے تھے۔ لکرشیس کی نظم مین، سسرو و دیگر لاطینی مصنفین کی تصانیف مین، اور سب سے بڑھ کر پلوٹارک کے رسالہ "توہمات" مین نہایت کثیر التعداد شواہد اس امر کے ملتے ہین کہ موت کی ہیبت و دہشت سے رومن خلقت ہر وقت لرزہ براندام

رہتی تھی۔اب حکما نے اپنا خاص نصب العین یہ قرار دیا، کہ اس وہم پرستانہ خوف کو مٹا دیا جائے۔پلوٹارک نے کہا، کہ خدا کی طرف پس مرگ عذاب وہی کا انتساب کرنا، اُس پر سخت ترین افترا کرنا ہے۔ایسا مفتریانہ عصیان، جس کے مقابلہ مین معصیت الحاد بھی براے نام رہ جاتی ہے۔اور دماغون مین اس کا تخیل جاگزین ہونا نتیجہ ہے، رائج الوقت افسانون کا، چنانچہ اُس نے ایسے افسانون کی اشاعت شروع کی، جن کا مقصد ان کے بالکل مخالف سبق کی تعلیم تھی، اب اس طرح کے افسانون کی اشاعت شروع ہوئی، جن مین ہر پہلو سے موت کی طرف سے بیخوفی کی تعلیم دی گئی تھی، مثلاً یہ کہ ایک مرتبہ کسی مذہبی جشن کے موقع پر جب دیوی جونو کے بُت کو جو گھوڑے گھسیٹ کر لیجانے والے تھے، اُن کے آنے مین دیر ہوئی، تو وہان کی راہبہ کے لڑکے خود، اس گاڑی کو کھینچ لائے۔اس پر ان کی مان نے فرط مسرت و نازش سے دعا کی، کہ اِن لڑکون کو وہ سب سے بڑا انعام ملے، جو انسان کو مل سکتا ہے۔اس کی یہ دعا مقبول ہوئی، اس طرح پر کہ وہ لڑکے فوراً سو گئے، اور سوتے سوتے وفات پا گئے۔یا مثلاً جن معمارون نے اپالو کے مندر کی تعمیر کی تھی، انھون نے بعد تعمیر کے دعا کی، کہ ہمین اس کا وہ صلہ ملے، جو بہترین ہو سکتا ہے، اس پر ان کو یہ بشارت ہوئی، کہ وہ سات روز خوب لطف دنیوی اُٹھائین، اُس کے بعد رات کو انھین صلہ ملے گا۔انھون نے اس کی تعمیل کی، اور اس کے بعد جب سوئے، تو پھر ان کی آنکھین دوبارہ نہ کھل سکین۔اس طرح کے بیسیون فسانے مشہور کیے گئے، جن سب کا مدعا یہ تھا، کہ لوگ موت کو بجاے دہشت کے مسرت کی نظرون سے دیکھین، اور اسے بجاے عذاب کے انعام الٰہی تصور کرین۔یہ اسی تخیل کا نتیجہ تھا، کہ بڑے بڑے حکماء نہایت سکون وغایت اطمینان سے جان دیتے تھے، اور نزع کے وقت ذرا بھی اضطراب نہین ظاہر ہونے دیتے تھے۔سقراط نے جس اطمینان خاطر سے جان دی اس کا حال سب کو

معلوم ہو، لیکن اس باب مین سقراط کی مثال کوئی انوکھی نہین- اس طرح کے متعدد نظایر ملتے ہین- یونان قدیم کے جو سات حکما مشہور ہین، اُن مین سے ایک، یعنی چیلون کے بابت یہ روایت سنی جاتی ہو، کہ موت کے وقت اُس نے اپنے تلانذہ کو اپنے گرد جمع کیا، اور بہ مسرت تمام کہا، کہ مجھے اس وقت اپنی ساری زندگی مین صرف ایک گناہ یاد آتا ہو، اور وہ یہ کہ مین نے ایک موقع پر ایک مسئلہ کے فیصلہ مین اپنے ایک دوست کی مروت کو دخل دینے دیا تھا، بس اس کے سوا، میری زندگی بالکل پاک و بے لوث رہی ہو اور مین بہ مسرت تمام جان دیتا ہون- سسرو کی آخر زمانے کی تحریرین اُٹھا کر پڑھیے کہین اپنے معاصی پر تاسف و حسرت یا قربت موت پر اضطراب کا نام نہین، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہو، کہ عالم آخرت کی طرف سے دعوت آنے کی دیر ہے، یہ اسے لبیک کہنے کے لیے تیار بیٹھا ہو- سینکا کے پاس سکرات کے وقت انتشار و اضطراب پھٹکنے بھی نہین پایا- اسی طرح ٹائٹس نے حالت نزع مین خندہ جبینی کے ساتھ اعتراف کیا ہو کہ عمر بھر مین صرف ایک گناہ کا مرتکب ہوا ہون، انٹونینس پی اس، جولین، وغیرہ نے جس سکون و بے خوفی سے زندگی کو خیرباد کہا، وہ سب اس کے مزید نظایر ہین-

بعض مصنفین کی یہ عادت ہو کہ وہ مسیحیانہ و بت پرستانہ نظام اخلاق مین بہت سے مسائل کے اشتراک و مماثلت کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہونچ جاتے ہین، کہ مسیحیت بت پرستی ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہو، اور یہ کہ اگر حکما قدیم آج موجود ہوتے تو بہت خوشی سے مسیحیت کی دعوت کو لبیک کہتے- اس قیاس کا دائرہ اگر صرف پروٹسٹنٹ کے عقاید تک محدود رکھا جائے، تو تو خیر صحیح ہو لیکن جب رومن کیتھولک عقاید بھی اسی شمول مین لائے جاتے ہین، تو اس کی غلطی بالکل عیان ہو جاتی ہو- رومن کیتھولکون اور رومن بت پرستون مین مشابہت و مماثلت تو درکنار، دونون کے اصول و بنیاد مین نہایت کھلا ہوا تناقض ہو، یعنی ایک دوسرے سے صرف مختلف نہین، بلکہ قطعاً منافی ہین- ذیل مین ہم

بالمقابل دونوں گروہوں کے چند معتقدات کو مثالاً پیش کرتے ہیں۔

حکمائے قدیم کے معتقدات	رومن کیتھولک کے عقاید
(۱) موت ایک بالکل طبعی و فطری واقعہ ہے، جسے سزا و تعذیب سے کوئی سروکار نہیں۔	(۱) موت ایک سزا ہے جو بہ سبب معصیت آدم کی پاداش میں بنی آدم پر نازل کی، بالکل اسی طرح کہ جیسے زہریلے درخت، آفات ارضی، و کسوف شمس بطور سزاؤں کے بنی آدم پر نازل کیے گئے ہیں۔
(۲) موت خاتم الآلام ہے، اس کے بعد کوئی تکلیف و عذاب نہیں جس جسم کے ذرات ہوا میں منتشر ہوئی مل چکے اس کی بابت یہ خیال کرنا ہی مہمل ہے کہ وہ کسی عقوبت سے متاثر ہوگا۔	(۲) موت، نسل انسانی کی تعداد اغلب کے لیے مقدمہ ہے شدید ترین آلام و تکالیف کا۔ ایسے عذاب کا جس کے سامنے دنیا کی سخت سے سخت تکلیف ادنیٰ سا ہیچ اور ہیچ ہے اور جنھیں کوئی بشر برداشت کر ہی نہیں سکتا۔
(۳) انسان فطرۃً معصوم ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ اپنے قصد سے گناہ نہ کرے، وہ آلائش معصیت سے پاک رہتا ہے۔ پلوٹارک کے الفاظ ہیں، "بچوں کے جنازہ پر وہ مراسم نہیں بجا لائے جاتے جو بالغوں کے جنازہ پر بجا لائے جاتے ہیں اس لیے کہ انھیں دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔۔ اسی طرح ان پر گریہ و بکا کرنا بھی اس واسطے ممنوع ہے کہ اب وہ زیادہ پر عافیت مقام میں پہنچ گئے	(۳) انسان پیدائشاً لعنت زدہ ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہی آلودۂ معصیت ہو جاتا ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے الفاظ ہیں، "جو شخص یہ کہتا ہے کہ بچے بغیر بپتسمہ لیے ہوئے بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ مسیح کے قول کی تردید کرتا ہے۔۔۔ یہ نص صریح موجود ہے کہ ایک انسان کے گناہ سے تمام انسان لعنت میں گرفتار ہیں اس عموم میں بچوں کا کہیں استثنا نہیں ہے اور ایسا

ہین"	مسئلہ ہی جس پر تمام فقہا کا عام اجماع ہی"
(۴) ہر فرد اپنی ذاتی کوشش۔ پاکیزگی اخلاق اتقا، و تزکیہ نفس سے نجات حاصل کر سکتا ہی جس کے لیے کسی مذہبی رسم پرستی کی حاجت نہین۔	(۴) بڑی سے بڑی متقیانہ زندگی بھی انسان کو لعنت ابدی سے آزاد نہین کر سکتی حصول نجات کے لیے لازمی ہی، کہ مسیح پر ایمان، اور اس کی تعلیمات پر عمل بھی ہو۔
(۵) خدا کی جانب قہر و غضب و انتقام کا انتساب صحیح نہین۔ اس کی ذات ان چیزون سے ارفع ہی۔	(۵) خدا مین قہر، غضب و انتقام کے جذبات موجود ہین۔ اور وہ آخرت مین گنہگارون کو خود سزا دیگا۔

(یہ اختلافات معتقدات اساسی مین تھے، نتائج عمل مین ان اختلافات کا یہ اثر پڑا، کہ)

(۶) بت پرست حکما کی ہمت اس مین مصروف رہی، کہ انسان کے دل سے موت کی وحشت زائل ہو، اور نفس بشری اپنے تئین پوری حد تک آزاد سمجھے۔	(۶) برخلاف اس کے ائمہ رومن کیتھولک کی تمام کوششین اس مین صرف ہوا کین، کہ موت کو جس قدر مہیب و وحشتناک بنایا جا سکے، بنایا جائے اور انسان کے ذہن مین اُس کی بیچارگی بیکسی و محتاجی کے تخیل کو حد کمال تک پہونچایا جائے۔ اور چونکہ رومن کیتھولک تعلیمات کی علوم و فنون، رسم و رواج، وغیرہ مختلف ذرایع سے مدتون اشاعت ہوتی رہی، اس لیے ان کا اثر صدیون تک لوگون کے دلون پر قائم رہا، اور اب بھی بالکل نہین مٹ چکا ہی

موت کے بارہ مین قدما اور کیتھولکون مین جو عظیم الشان اختلافات تھے، ان کے نتیجہ
کا سب سے زیادہ اہم مظہر وہ تخیل تھا، جو خودکشی سے متعلق دونون نے قائم کیا تھا، بلکہ
کہہ سکتے ہین، کہ رواقی اور موجودہ اخلاق کا اصل فارق یہی ہے، یہ سچ ہے کہ قدما بھی سب کے
سب اس مسئلہ پر بالکل متفق نہ تھے، مثلاً فیثاغورث کہتا ہے، کہ انسان کو زندگی مین جو مقام
سپرد کر دیا گیا ہے، اُس سے بغیر افسر یعنی خدا کی اجازت کے نہ ہٹنا چاہیے۔ اسی کے
قریب قریب فلاطون کے الفاظ ہین، گو وہ کہتا ہے، کہ جن استثنائی صورتون مین قانون اُسے
واجب کر دے، یا شدت افلاس و مصایب سے زندگی ناقابل برداشت ہو جائے تو خودکشی
جائز ہے۔ ارسطو نے یہ کہکر اس سے حکومت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے، خودکشی کو معاشری
وسیاسی مصالح کی بنا پر ممنوع قرار دیا تھا۔ یونان مین جن لوگون نے خودکشی کی اُن مین
گو زینو و کلینتھس جیسے مشاہیر کے نام بھی آجاتے ہین، تاہم یہ فہرست مختصر ہی ہے۔ خود روم
مین بھی جہان یہ کثیر الوقوع تھی، اس کا جواز بالکل مسلم نہ تھا، بلکہ اگر ریگولس کی داستان تاریخی
حیثیت سے صحیح تسلیم کر لی جائے تو معلوم ہو گا کہ شدائد جان فرسا پر تحمل کرنا ہی سب سے
بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ ورجل، آیندہ زندگی مین اُن لوگون کی نہایت تاریک تصویر
کھینچتا ہے، جنھون نے یہان خودکشی کر لی ہے، سسرو نے فیثاغورث کے خیال کی پُرزور
تائید کی ہے، گو وہ کیٹو کی خودکشی کو مستثنیٰ کر کے اس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ ایپولیس بھی
افلاطون کی تقلید مین کہتا ہے، کہ دانشمند شخص کبھی اپنی زندگی کو خیرباد نہین کہتا تاوقتیکہ خدا
اُسے طلب نہ کرے۔ سیزر، آوڈ وغیرہ نے بہ تصریح لکھا ہے، کہ اصلی جوانمردی جان دیدینا
نہین، بلکہ سختیون کا مقابلہ کرنا ہے۔ خود رواقیین بھی جہان ایک طرف خودکشی کو جایز سمجھتے
تھے، وہان اس کے بھی قایل تھے، کہ ہر شخص کو ہر حالت مین اپنے فرائض انجام دیتا رہنا چاہیے
اور دقتون سے ڈر کر ان سے نہ منھ موڑنا چاہیے، سنیکا، جو خودکشی کا نہایت پُرجوش وکیل
ہوا ہے، اپنے تلامذہ مین اس کی زیادہ اشاعت کو اچھی نظر سے نہین دیکھتا، بلکہ اسے دباتا ہے،

مارکس آریلیس اس باب مین متردد ہے۔ کہین تو وہ یہ لکھنے لگتا ہے کہ ہر شخص کو اپنی جان کے اوپر پورا اختیار ہے، اور کہین فلاطون کی تقلید مین یہ کہنے لگتا ہے کہ ہر انسان، گویا لشکر ربانی کا، ایک سپاہی ہے، جس کا ایک خاص مقام کارزار حیات مین مقرر کر دیا گیا ہے، اور جسے بغیر حاکم کے اشارہ کے چھوڑ دینا سخت جرم ہے۔ پلوٹینس و پارفری خودکشی کے قطعًا مخالف تھے۔

لیکن با این ہمہ اس حقیقت سے انکار نہین ہو سکتا، کہ اس بارہ مین قدما کا تخیل ہمارے تخیل سے بالکل مختلف تھا۔ اُن مین سے اکثرون کے نزدیک تو یہ جائز ہی تھی، اور جن چند کے نزدیک ناجائز تھی، تو وہ بھی اس کو اس درجہ کی معصیت نہین خیال کرتے تھے، جتنی موجودہ زمانہ کے لوگ خیال کرتے ہین۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ تھا، کہ موت ہی کے بارہ مین ان کا تخیل ہمارے تخیل سے بالکل مختلف تھا، اور دوسرا سبب یہ تھا، کہ جب کسی جماعت مین خودکشی جائز سمجھی جانے لگتی ہے، تو اس کی معصیت کا جو تصور افراد کے نفوس مین ہوتا ہے، وہ بھی زائل ہو جاتا ہے، اور یہ ایک معمولی واقعہ خیال کیا جانے لگتا ہے۔ ایپکورس کی تاکید تھی، کہ "خوب غور کر لو۔ موت کا تمھارے پاس آنا بہتر ہے، یا تمھارا موت کے پاس جانا"، اور اس کے تلامذہ مین لکریشیس، کیسیس، اٹیکس (حامی سینیکا) و دیوڈرس وغیرہ متعدد اشخاص نے اپنے ہاتھ اپنی جان دی، پلینی فخر لکھتا ہے کہ اس باب مین عبد کو معبود پر فضیلت ہے کہ وہ جب چاہے، زندگی کو خیرباد کہہ سکتا ہے، اور یہ فطرت کی فیاضی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ دنیا مین ایسی جڑی بوٹیان پیدا کر دی گئی ہین، جن کی وجہ سے انسان اپنے مصائب کا، بہ آسانی خاتمہ کر سکتا ہے۔ سسرو کی تصانیف کے ذریعہ سے ہمارا تعارف ایک عجیب و غریب شخص ہجیسی اس سے ہوتا ہے، جسے اُس کے معاصرین نے "خطیب مرگ" کا لقب دیا تھا، یہ شخص ایک طرف تو مسلک قیروانیہ کا متبع تھا۔ یعنی اُس مسلک کا، جو غایت حیات، حصول لذت کو قرار دیتا ہے، مگر دوسری طرف اس کی تعلیم دیتا تھا، کہ انسانی

زندگی پریشانیون و ترددات سے اس قدر لبریز، اور لذات و مسرات سے اس قدر تہی ہی کہ انسان کے لیے بہترین نعمت موت ہی ہی۔ یہ شخص اس قوت کا مقرر و سحربیان تھا، کہ صدہا آدمیون نے اس کی سحربیانی سے متاثر ہو کر جان دینا شروع کر دی، یہانتک کہ حکام وقت کو یہ اندیشہ پیدا ہوا، کہ اگر خودکشی کی یہی رفتار رہی، تو کچھ روز مین شہر خالی ہو جائے گا، اور ٹیلیمی اُس کو اسکندریہ سے جلاوطن کر دیا۔

خودکشی کو ایک امر خفیف سمجھنے کا خیال یون تو کم و بیش، قدما مین بالعموم پایا جاتا ہی، لیکن رومن شہنشاہی کے زمانے مین اور رومن رواقیین مین یہ خیال حد کمال کو پہونچ چکا تھا۔ یہ تو معلوم ہی ہی، کہ دور توحش مین زندہ انسان کو بھینٹ چڑھا دینا ایک کار ثواب سمجھا جاتا ہی، اس عقیدہ کا اثر عہد توحش کے بعد بھی، عصر تمدن تک مین مدتون رہا کیا، کہ حیات انسانی کی عظمت کو کافی اہمیت نہین حاصل ہوئی، اور پھر بت پرستانہ فلسفہ کی آخر عمر مین متعدد حالات و اسباب ایسے پیش آگئے، جن سے اس خیال کو اور تقویت ہوتی رہی۔ مثلاً کیٹو نے اپنی خودکشی سے جس مستحکم اخلاق و ایثار نفس کا نمونہ پیش کیا تھا، اُس نے رومن تخیلہ پر بہت گہرا اثر کیا، اور اس کی تقلید مدتون رومن تقریرون کا موضوع بنی رہی۔ یا سیّافی کے مناظر اس کثرت سے لوگون کی آنکھون کے سامنے رہتے تھے کہ قتل و ہلاکت ایک معمولی واقعہ بن گیا تھا، یا پھر جو وحشی بڑی تعداد ون مین گرفتار ہو کر آتے تھے، وہ بجائے اس کے کہ اپنے رفیقون کے ساتھ غداری کرین یا اپنے فاتحون کی غلامی کرین، بے تکلف اپنی جان دیدیتے تھے، اور یا آخر مین سب سے بڑھ کر قیاصرہ کی شقاوت و جبّاری، اور سیاسی مجرمون کو خود اپنی جان لینے پر مجبور کرنے کا دستور، ان سب حالات نے مل ملا کر خودکشی کو ایک کھلونا بنا دیا تھا۔ نیرو کی ظالمانہ فرمان روائی مین سینیکا نے جس طرز پر خودکشی کی حمایت کی ہی، اُس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہی، کہ لوگ زندگی کی مشکلات سے تنگ آکر اس کو تمام خرابیون کا کیسا آسان علاج سمجھنے لگے تھے۔

اقتباسات ذیل قابل ملاحظہ ہین:-

"اگر موت نہ ہوتی، تو یہ زندگی کیسا ناقابل برداشت عذاب ہوتی، اس کی وجہ سے دنیا کی تمام تکالیف و آلام کے مقابلہ مین میرے پاس کم از کم ایک مرافعہ کی عدالت ہے...... مین اپنے سامنے سُولی، تازیانہ، اور طرح طرح کے ہولناک آلات تعذیب دیکھتا ہون۔ ایسے ایسے آلات جو میری رگ رگ کو انتہائی عذاب پہونچا سکتے ہین۔ لیکن مین ایک اور شے کو بھی دیکھ رہا ہون جس پر میرے بڑے سے بڑے موذی دشمن کا بھی دست رس نہین، اور وہ موت ہے۔ جب مین فوراً اپنے تئین آزادی بخش سکتا ہون، تو مجھے اس کی کیا پروا ہے کہ کوئی مجھے غلامی مین لے رہا ہے۔ درحقیقت موت ہی ایسی شے ہے، جو تمام مصائب کے لیے سپر ہے"

"تم تکالیف سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو، تو اس کے لیے جس طرف نظر اُٹھاؤ، تمھین وسائل و ذرائع با فراط ملین گے۔ پہاڑ و چٹان کی چوٹی، دریا، کنوئین و سمندر کی تہ، جہان چاہو، ذریعہ نجات موجود ہے" (یعنی جس طریقہ پر چاہو خودکشی کرسکتے ہو)

"جب مجھے طریقۂ موت مین انتخاب کرنا ہے، تو کیون نہ مین آسان موت کو تکلیف دہ موت پر ترجیح دیکر اختیار کرلون؟ جس طرح مجھے اپنی سکونت کے لیے مکان کے انتخاب کا، اور سفر کے لیے جہاز کے انتخاب کا حق حاصل ہے اسی طرح طریقۂ موت کے بھی انتخاب کا حق حاصل ہے..... بلکہ زیادہ صحیح طور پر یون کہنا چاہیے، کہ طریقۂ موت سے زیادہ اور کسی شے مین ہمین اپنی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کا موقع نہین۔ پس جس طریقہ پر تمھین اچھا معلوم ہو، زندگی کو خیر باد کہو، خواہ تلوار کی کاٹ سے، خواہ رسّی کے پھندے سے، اور

خواہ زہر کے گھونٹ سے، بہر حال اپنی مشکل آسان کرو، اور اسیری کی جگہ رہائی حاصل کرو۔ طریق زندگی مین تم دوسرون کی خوشی و مرضی کی پروا کرتے ہو، لیکن طریق موت بالکل تمھاری ذاتی خوشی پر منحصر ہے۔۔۔۔۔ یہ قانون الٰہی نہایت حکیمانہ ہے، کہ زندگی کو ایک ایسا مکان رکھا ہے جس مین داخل ہونے کا ایک ہی راستہ ہے، مگر جس سے باہر نکلنے کے متعدد دروازہ ہین۔ پس کیا وجہ ہے، کہ مین ہر طرح کی تکالیف و مصائب کا ہدف بنا رہون، اور ایڑیان رگڑ رگڑ کر جان دون، در ان حالیکہ مین ایک ہی جست مین آزادی حاصل کر سکتا ہون؟ یہی یعنی مدت حیات کا خود اختیاری ہونا ہی اصل سبب ہے، کہ مین زندگی کو عذاب و بدنصیبی سے تعبیر نہین کرتا۔ جب تک تمھاری خوشی ہو، زندہ رہو، اور جب دیکھو کہ زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے، تو پھر بھی اسے جھیلتے رہنا خود تمھارا قصور ہے۔ جہان سے تم آئے ہو، وہان واپس چلا جانا بالکل تمھارے قدرت و اختیار مین ہے، اور اس حق سے فائدہ اٹھانے سے تمھین کون روک سکتا ہے؟"

ان اقتباسات سے، اور ان کے مثل صدہا فقرہ اور نقل کیے جا سکتے ہین، ظاہر ہو گیا ہوگا، کہ رومی رواقیت کا معلم کس جوش و سرگرمی سے خودکشی کی وکالت کرتا ہے۔ فلسفیانہ حیثیت سے قطع نظر کرکے، روم کے قانون نے بھی خودکشی کو جائز رکھا تھا، البتہ کچھ عرصہ کے بعد دو قیود کا اضافہ کر دیا تھا۔ پیشتر یہ قاعدہ تھا، کہ جو لوگ سیاسی مجرم ہوتے تھے، اُن کا لاشہ بے گور و کفن پڑا رہتا تھا، اور ان کی جایداد سرکار مین ضبط ہو جاتی تھی۔ اس سے بچنے کے لیے اکثر سیاسی مجرمین یہ کرتے تھے، کہ قبل اس کے کہ اُن کا مقدمہ شروع ہو، خودکشی کر لیتے تھے۔ اب ڈومیشین نے اپنے عہد حکومت مین یہ قانون بنا دیا،

کہ ایسے مجرمون کو خودکشی کچھ بھی مفید نہ ہوگی، بلکہ اُن کی لاش وجائداد کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائےگا، جو جرم ثابت ہونے کے بعد کیا جاتا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک قانون یہ بھی پاس ہوا، کہ جو رومی سپاہی خودکشی کرے گا، اس کا حشر وہی سمجھا جائےگا جو کسی باغی وغدار سپاہی کا ہوتا ہے۔ بس ان دو قیود کے سوا، اور کسی طرح کی روک تھام براہ راست یا بالواسطہ خودکشی کے لیے نہ تھی، اور لوگ علانیہ مختلف اسباب کی بنا پر خودکشی کیا کرتے۔ اٹھونے، جوکیٹو ہی کی طرح راہ حق کا شہید خیال کیا جاتا ہے اس خیال سے اپنی جان دیدی تھی، کہ کہین اس کی وجہ سے روم مین دوبارہ خانہ جنگی نہ شروع ہوجائے۔ ایک اور جنگ مین غنیم نے مشہور رومی جنرل لانگینس کو گرفتار کرکے یہ چاہا، کہ اُس کے دباؤ سے رومی تاجدار کو سخت سے سخت شرائط پر صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑے تو اس جنرل نے زہر کھا کر بادشاہ کو ایک بڑے تردد سے نجات دیدی۔ اوکھو کی وفات پر متعدد سپاہیون نے فرط عقیدت وغم مین جان دیدی۔ ایک مرتبہ، جمہوریت کے آخر زمانے مین یہ واقعہ پیش آیا، کہ ایک مشہور کوچوان کی لاش جلائی جارہی تھی، کہ ادھر سے ایک پرجوش، گاڑیون کی دوڑ کے شوقین کا گزر ہوا، اور اس نے کوچوان کی لاش کو جلتا دیکھ کر اس مین کود کے خود بھی اپنی جان دیدی۔ ایک منھ لگے مصاحب نے ٹائبریس کے عہد فرمانروائی مین محض اس بنا پر اپنی جان لے لی، کہ وہ حکومت کے مظالم کو نہین دیکھ سکتا تھا۔ ایک بار ایک کلبی پری گری نس نے بہت سے لوگون کو اس غرض سے مدعو کیا، کہ وہ زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرنے والا ہے، وہ آکر یہ تماشا دیکھین چنانچہ بہت بڑا مجمع ہوا، اور اُس نے اون کے سامنے اپنے تئین زندہ آگ مین جلادیا۔ موت اکثر حالات مین آخری طبیب امراض سمجھی جاتی تھی، اور خودکشی تمام مصائب کی قاطع خیال کی جاتی تھی۔ ایپکٹیٹس کہتا ہے، "یہ خوب یاد رکھو کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بچون سے زیادہ تو بزدل نہ بنو جس طرح جب بچہ کھیل سے اُکتا جاتے ہین، تو صاف کہدیتے ہین کہ اب نہ

کھالیں گے، اسی طرح جب زندگی سے عاجز آؤ، تو فوراً زندگی ترک کردو۔ یا اگر زندہ رہنے ہی کی ہوس ہے تو پھر زندگی کی شکایت نہ کرو۔" سنیکا کا قول تھا، کہ "جو شخص اپنے تہارے شیخوخت کا راستہ دیکھتا رہتا ہے، اُس سے بڑھ کر بزدل اور کون ہو سکتا ہے۔ جس طرح جو شخص تلچھٹ تک صاف کر جاتا ہے، وہ بلانوش کہلاتا ہے، اسی طرح جو زندگی پر اتنا حریص ہے وہ بھی بوالہوس کہلائے گا۔ میرے اگر ہوش و حواس صحیح ہیں، تو میں بھی ضعیف العمری تک زندہ رہنا چاہوں گا، لیکن اگر میری قوتیں جواب دے رہی ہیں، یا میرے حواس میں اختلال آگیا ہے، اور بجائے روح کے مجھ میں صرف سانس کی آمد و رفت باقی رہ گئی ہے، تو ایسی زندگی پر میں موت کو ہزار درجہ ترجیح دوں گا، اسی طرح جب تک میں اپنے مرض کو قابل علاج سمجھوں گا، علاج کیے جاؤں گا، خواہ کیسی ہی تکلیف ہو، کیونکہ تکلیف کے ڈر سے خودکشی کرنا بھی بزدلی ہے۔ لیکن جب میں اپنی صحت کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاؤں گا، اور مجھے یہ معلوم ہو جائے گا، کہ اب زندگی میرے لیے بالکل عبث ہے، تو فوراً زندگی کا خاتمہ کر لوں گا۔" اسی طرح موسونی اس نے لکھا ہے، کہ "جس طرح زمیندار کو جب لگان نہیں وصول ہوتا، تو وہ کاشتکار کے مکان کے دروازہ توڑ ڈالتا ہے، اُس کی چھت اُکھڑ ڈالتا ہے، اُس کی آبپاشی بند کر دیتا ہے، وغیرہ، اسی طرح میرے جسم سے ایک ایک کر کے بصارت، سماعت، و نقل و حرکت کی قوتیں سلب کی جا رہی ہیں، پس میں اپنے زمیندار کو زیادہ تنگ نہ کروں گا، اور خود ہی اپنی زندگی بخوشی اس کے حوالہ کر دوں گا۔"

خودکشی کا یہ تخیل، کہ وہ مصیبت زدوں کے لیے ایک ملجا و مامن ہے، صرف فلسفیانہ تصانیف تک محدود نہ تھا، بلکہ اس عقیدہ پر کثرت سے عملدرآمد بھی ہوتا تھا، چند مثالیں نذر ناظرین ہیں۔ سیلیس اٹالیکس نے، جو متاخرین شعراء روم میں ہوا ہے، خودکشی کر کے جان دی، پلینی نہایت مدحیہ الفاظ میں اپنے ایک دوست کی بابت روایت کرتا ہے، کہ

جب وہ ایک سخت مرض مین گرفتار ہوا، تو اُسے یہ دریافت کرنے کی فکر ہوئی کہ اس کا مرض قابل علاج ہے یا ناقابل علاج، اگر قابل علاج ہے تو وہ اپنے اعزہ و احباب کی خواہش کے مطابق مقاومت مرض کرتا رہے گا، اور اگر ناممکن العلاج ہے، تو اپنے ہاتھون اپنی جان دے لیگا۔ اس تحقیق کے لیے اُس نے مشاہیر اطبا کا اپنے یہان جلسۂ شوریٰ منعقد کیا، اور بغایت سکون واطمینان قلب کے ساتھ اُن کے فیصلہ کا انتظار کرتا رہا۔ اسی مصنف سے ایک اور شخص کا قصہ مروی ہے، جو کسی ایسی موذی بیماری مین مبتلا تھا، کہ اس کے سارے جسم پر گھاؤ ہو گئے تھے اُس کی بیوی نے یہ حالت دیکھ کر کہ اب اُسے شفا نہین ہو سکتی، اُسے ترغیب دیکر اس پر آمادہ کیا کہ وہ خود کشی کر لے، اور وہ بھی اس کا ساتھ دیگی۔ چنانچہ میان بیوی دونون نے اپنے تئین ایک رسی مین جکڑ ڈالا، اور ساتھ ہی اپنے تئین دریا مین گرا دیا۔ اسی طرح سنیکا نے اپنے ایک خط مین ایک رومی خود کشی کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے، کہ ٹولیس مارکیلینس ایک نہایت قابل و صاحب اخلاق شخص، جو کسی زمانے مین فلسفہ کی تعلیمات کا منکر تھا، مگر اب اُن پر پورا عامل ہو گیا تھا، ایک بار کسی لاعلاج مرض مین گرفتار ہوا، اور خود کشی کی ٹھان لی۔ یہ ارادہ کرکے اُس نے اپنے احباب کو جمع کیا، مگر اُن مین سے اکثرون نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ ابھی کچھ دنون اور زندہ رہے۔ تاہم اسی جماعت مین ایک رواقی حکیم بھی تھا جس نے (بقول سنیکا کے) ایک نہایت اعلیٰ قسم کی تقریر شروع کی۔ اس کا منشا یہ تھا، کہ زندگی کوئی ایسی اہم شے نہین، جس کے بقا و فنا کے تصفیہ کے لیے وہ کوئی مہتم بالشان مجلس شوریٰ مرتب کرے۔ یہان جس طرح انسان کی ہوتی ہے، حیوان کی بھی ہوتی ہے، اور اس بنا پر انسان کو حیوانات پر کوئی امتیاز نہین حاصل، البتہ معزز موت ایسی شے ہے، جو صرف انسان کے بس کی ہے۔ اس واسطے اُسے چاہیے، کہ اس امتیاز کو قائم رکھے، اور معزز موت مرے۔ مارکیلینس تو پہلے ہی سے یہ چاہتا تھا، اُس نے اس مشورہ کو بہ مسرت تمام قبول کیا، اپنی جائداد

اپنے وفادار غلامون کو تقسیم کردی، انھین تشفی دی، اور اس کے بعد موت کے لیے یون تیار ہوگیا، کہ تین روز تک بالکل بے آب ُ دانہ رہا، اور جب دیکھا کہ فرط ناتوانی سے روح جسم سے مفارقت کیا چاہتی ہے، تو گرم پانی مین غسل کیا، اور اُسی حالت مین جان نکل گئی لیکن جس وقت تک آخری سانس آتی رہی، وہ یہ کہتا رہا، کہ نہایت آسانی ولطف کے ساتھ میری جان نکل رہی ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا، کہ رواقیت نے خودکشی کا یہ جو تخیل قایم کیا، اس کے لیے ازبس ضروری تھا، کیونکہ بغیر اس کے افراد مین وہ فلسفیانہ خود اعتمادی و خودداری پیدا ہی نہین ہوسکتی تھی جو رواقیت کا مقصود تھی۔

صفحات بالا مین اس کثرت سے اقتباسات و تفصیلات دیے گئے ہین، کہ مجھے اندیشہ ہے، کہ کہین اس ہجوم مین ناظرین کے ذہن سے اصل مبحث کا سر رشتہ نہ چھوٹ گیا ہو اس لیے اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اُس کو سُلجھا کر پھر ایک خلاصہ کی صورت مین لکھے دیتے ہین۔ اس سے یہ مسائل حل ہوجائین گے، کہ رواقیت سوسائٹی کے کن حالات ماقبل سے بہ طور نتیجہ کے پیدا ہوئی، اُس نے خود کیا کیا اثرات پیدا کیے، اس کا اثر مسیحیت کے نشوونما مین کہان تک معین ہوا، اور کہان تک اس کے مخالف پڑا؟

(۱) پہلی بات ہمکو یہ معلوم ہوئی، کہ دوسری قومون کی طرح روم مین بھی قبل اس کے کہ اخلاق سے متعلق کوئی فلسفیانہ نظریہ قائم ہو، عملی زندگی کا ایک مخصوص و متعین اخلاقی سانچہ قائم ہوچکا تھا۔ قومین جن مشاغل مین مصروف رہتی ہین، انھین کے سانچہ مین ان کی سیرت بھی ڈھل جاتی ہے، بس اسی اصول کے مطابق، چونکہ رومی جمہوریت کی بنیاد عسکریت پر تھی، اس لیے اہل روم کی اخلاقی زندگی کے رگ وریشہ مین تمام تر وہی خصایص سرایت کرگئے تھے، جو عسکری زندگی کے نمایان خط وخال ہوتے ہین۔

(۲) دوسرے ہمین یہ دریافت ہوا، کہ عسکریت ہمیشہ اُن فضائل اخلاق کی دشمن رہی ہے،

جن کا تعلق مروت، لطف و محبت سے ہے، اور ان کی معین رہی ہے، جن کا مدار ایثار، شجاعت و مردانگی پر ہے، یہ خصوصیت فوجی زندگی میں کم و بیش ہمیشہ موجود رہی ہے لیکن قدیم طرز جنگ نے اسے اور ترقی دیدی تھی، چنانچہ اہل رومہ میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ہر وقت جنگ و مقابلہ میں مصروف رہنے سے، انسانی زندگی کی کوئی اہمیت افراد کے نظر میں نہیں رہ گئی تھی۔ انکسار، فروتنی، و رواداری کا جنگی سوسائٹی میں کہاں پتہ لگ سکتا ہے؟ ایک خاص انداز کا غرور و بیدردی و خودداری سب پر غالب آگئی تھی نفاست، تکلفات و تصنع کے نام سے بھی یہ سپاہیانہ زندگی بسر کرنے والے افراد واقف نہ تھے۔ عقلی نازک خیالیاں، اور اخلاقی موشگافیاں ایسے الفاظ تھے جو بے معنے تھے اس کے مقابلہ میں خود اعتمادی، ہمت، اخلاقی جرأت، موت سے بیخوفی، بات کی پختگی، معاشرت کی سادگی، عدم تصنع، ضبط نفس، تحمل شدائد، استقلال و استقامت، اور فرض شناسی وہ اوصاف تھے، جو ان میں پوری طرح موجود تھے، جو گویا ان کی سرشت قومی کے عناصر ترکیبی تھے اور جن کی خاص طور پر قدر کی جاتی تھی۔

(۳۳) رومی زندگی، اخلاق کے اس خاص سانچے میں ڈھل چکی تھی، کہ اتنے میں روم میں علمی بیداری پھیلنا شروع ہوئی۔ یونان کے حکماء و فضلاء، کچھ تو سیاسی انقلابات کے سبب سے، اور کچھ رومی تاجدار اسپیو ایمی لیانس کی قدردانی کا شہرہ سنکر، روم میں آنا شروع ہوئے، اور اپنے ساتھ علمی تحریکات کو بھی لائے۔ اب یہاں بھی لوگوں کے دماغ میں حرکت ہوئی، اور علمی و فلسفیانہ چرچے پھیلنے لگے۔ یونانی حکما، اپنے ہمراہ دو اخلاقی نظریات یعنے مذہب زینو (رواقیہ) اور مذہب ایپیکورس (لذتیہ) لائے تھے لیکن لذتیت کے اصول چونکہ روم کی قومی سیرت کے بالکل منافی تھے، اس لیے اسے یہاں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے رواقیت کی تعلیمات چونکہ اس کے بالکل مطابق تھیں، اس لیے یہ مذہب یہاں بہت جلد مقبول ہوگیا، بلکہ کچھ عرصہ میں اس کا اثر روم کے ہر شعبۂ زندگی پر پوری

طرح چھا گیا۔

(۴) رواقیت، بداہتہ ایک بالکل بیغرضانہ نظام اخلاق تھی، اُس کی تعلیم کا لب لباب یہ تھا، کہ ہمین عقل کی وساطت سے ایک خاص ناموس فطرت کا علم ہوتا ہی، اور اس کی ہدایات پر بے چون وچرا بلا توقع صلہ وخوف تعزیر، اور بغیر خیال منفعت وزیان، عمل کرتے رہنا ہی عین نیکی وسعادت ہی۔ جذبات وخواہشات کو دبانا، نفس انسانی کے شرف وعظمت کو بڑھانا، قوت ارادی کو تقویت دینا، معصیت کو نفس کی ایک مریضانہ حالت قرار دینا، اور موت کی جانب سے بیخوفی پیدا کرنا، یہ فلسفۂ رواقیت کے عنوانات جلی تھے۔

(۵) ظاہر ہی کہ ایسا نظام اخلاق، رومی سیرت قومی کے عین مطابق تھا، اسی واسطے یہ اس سرزمین مین خوب پھلا پھولا۔ یہ بھی علی ہذا ظاہر ہی کہ اس نظام اخلاق نے جو زبردست قوت ارادی پیدا کر دی تھی اُسکے لحاظ سے افراد مین انقلاب حالات وتغیرات سوسائٹی کے مقاومت کی قابلیت بہت بڑھ گئی تھی، چنانچہ رومی رواقیت کی ساری تاریخ اُن کی اس خصوصیت کے اظہار کی شاہد عادل ہی۔ زمانہ مابعد مین اور دوسرے ممالک مین جب جب کسی قوم مین بداخلاقی کا سیلاب آیا ہی، تو علماء وفضلا، کبھی اس کی روک تھام نہ کر سکے، بلکہ ہمیشہ خود ہی اس دھارے کے رَو کے ساتھ بہتے چلے گئے۔ لیو دہم (شاہ اٹلی)، ولوئیس پانزدہم (شاہ فرانس)، کے عہد مین، جب تعیش واخلاق شکنی کا دور دورہ شروع ہوا، تو واعظین کے دہن پر مُہر سکوت لگ گئی۔ جو حکماء، بیشتر فضائل اخلاق پر دفتر کے دفتر تیار کر دیتے تھے اب چند الفاظ پر بھی قادر نہ ہو سکے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرانس واٹلی کے مراکز تمدن مین ایک آواز بھی ایسی نہین، جو لوگون کو شاہراہ اخلاق پر چلنے کی دعوت دے۔ یہ اصول ہر جگہ اور ہمیشہ قائم رہا ہی، لیکن رومی رواقیین، اس عام قاعدہ سے مستثنےٰ ہوئے ہین جس زمانے مین رومی شہنشاہی کی عیش پرستیون، سفاکیون، اور عام اخلاق شکنیون کا شباب تھا، اور مشاہیر رواقیین اکثر ارکان دربار مین سے تھے، مگر با این ہمہ انھون نے کبھی

اعلیٰ اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، ہمیشہ بلند سے بلند اخلاقی نصب العین کو اپنے سامنے رکھا، خود اس پر عمل کرتے رہے، اور دوسرون کو اس کی تلقین کرتے رہے۔ بڑے سے بڑے فتن اخلاقی کے دور مین بھی اُن کی کوشش یہی رہی، کہ اخلاق کے بزرگترین معیار پر استقامت کے ساتھ قائم رہین، اور دوسرون کو قائم رکھین۔ ان کے بہتر سے بہتر خطبات کو اُٹھا کر دیکھیے، اسی موضوع پر تقریرین ہون گی۔ لیوی نے اپنا زور خطابت کس شی پر صرف کیا؟ فضائل اخلاق کی منقبت سرائی پر۔ ٹیکٹس نے اپنی قوت تقریر کا استعمال کس چیز پر کیا؟ رذایل اخلاق کی پستی و زبونی پر۔

فصل (۳)

رومہ کے اخلاق مین لینت و لطافت کی آمیزش

کسی نظام اخلاق کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہین، کہ اس کے اندر معاصی سے باز رکھنے کی قوت موجود ہو، بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ تمدن کی روز افزون ترقیون سے جو نئے نئے راستے پیدا ہوتے جاتے ہین، اُن کے مطابق وہ اپنے اصول و احکام کو بھی وسعت دیتا رہے۔ چنانچہ رواقیت کو بھی ایک بار یہ سخت آزمایش پیش آئی یعنی مسیح سے قبل رومہ مین جب سیاسی تغیرات کی مطابقت مین نئے نئے اخلاقی تخیلات پیدا ہونے لگے تو اس مسئلہ کو نہایت اہمیت حاصل ہو گئی، کہ رواقیت ان جدید حالات کا کہان تک ساتھ دے سکے گی؟ یہ جدید انقلاب حالات دو صورتون مین ظاہر ہوا۔ ایک یہ کہ رومی سیرت مین سختی و تشدد کی جگہ نرمی و لینت آگئی۔ جذبات ایثار و جانبازی کے بجاے جذبات ہمدردی و مروت زیادہ پیدا ہونے لگے۔ اور دوسرے یہ کہ فرقیانہ تعصبات و گروہ بندی کا زور کم ہو گیا، اور لوگون مین رواداری بہت بڑھ گئی۔ اس انقلاب کے دیو بجاے خود رومہ مین اشاعت مسیحیت کا

پیش خیمہ ثابت ہوا، علل و اسباب کو تفصیل سے بیان کرنے مین تو بہت طول ہوگا تاہم اس کا اجمالی خاکہ صفحات ذیل کے مطالعہ سے ذہن نشین ہو سکتا ہے۔

اس انقلاب کی ابتدا اُس وقت سے ہوتی ہے، جبکہ یونان پر روم نے فتح پائی، فاتح و مفتوح ملے، اور اب حاکم و محکوم کے تمدنون مین کشاکش شروع ہوئی۔ اہل یونان کسیقدر مناظر سے آشنا تھے، فن ادب لطیف رکھتے تھے، اور جنگ جوئی کے ذوق شناس نہ تھے، اپنے فاتحین کے مقابلہ مین یقیناً زیادہ شایستہ و لطیف الاطوار تھے، اور اپنے عادات و خصائل مین ایک خاص نزاکت و لینت رکھتے تھے، جس کی جھلک اُن کے اکابر رجال کی سیرتون مین بھی نظر آتی ہے، مثلاً مشہور جنرل پرقلس جب حالت نزع مین تھا، تو اعزہ و احباب نے یہ سمجھکر کہ بیہوش ہے، اُس کی زندگی کے کارنامہائے عظیم کو ایک ایک کرکے بیان کرنا شروع کیا، اس پر اُس نے اپنی آنکھین کھول دین، اور رخصت ہوتی ہوئی قوت کو آخری بار مجتمع کرکے کہا، کہ "آپ لوگ میری حقیقی خدمت کو نظر انداز کر گئے، اور وہ یہ کہ میرے وطن مین آج تک کسی کو میرے سبب سے ماتمی لباس نہین پہننا پڑا" اسی طرح ارسٹیڈس اپنی جلاوطنی کے بعد یہ دعا کیا کرتا تھا، کہ جن لوگون نے اُسے جلاوطن کیا ہے، وہ کبھی کسی ایسی مصیبت مین نہ پڑین کہ اُس کی سزا کو منسوخ کرنے پر مجبور ہون۔ یا پھر اسی طرح فوشین اپنے قتل ناحق پر، آخر وقت تک اپنی اولاد کو وصیت کرتا رہا کہ کبھی اس کے انتقام کی کوشش نہ کرنا۔ ان اکابر رجال کا طرز عمل اس امر کی برہان قوی ہے کہ یونانی سیرت مین نرمی، خلق و مروت کے کس قدر اجزا شامل تھے۔ اس کی تائید مزید ہوتی ہے یوریپڈیس کے ناٹکون سے، اور نیز اس تاریخی واقعہ سے، کہ اتھینز مین جو معبد سب سے زیادہ مقدس و محترم سمجھا جاتا تھا، اور جس مین کسی دیوتا کا بت نہ تھا، وہ رحم کے نام سے معنون تھا۔

لیکن یونانیون مین رحم، مروت و انسانیت، گو شروع ہی سے موجود تھی، تاہم اُن مین اتنی وسیع رواداری نہ تھی، کہ غیر ملکیون کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کر سکین جیسا کہ اپنے

ہموطنون کے ساتھ کرتے تھے۔ اس حیثیت سے ”ادرومی دونون ایک سطح پر تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک مصنف فرینی کس نے اپنے افسانہ ”فتح مظطس“ مین یہ دکھایا تھا کہ وحشیون نے یونان پر فتح پائی، اور اس جرم مین اُسے جرمانہ کی سزا ملی۔ اس نظیر سے خایف ہوکر اس کے شاگرد عسقلبوس نے ایرانی تاجدار دارا کین درباری زبان سے خود اپنے تئین وحشیون کا لقب دلاکر اپنے ڈراما کی خوبیون پر پانی پھیر دینا گوارا کیا، لیکن اتنی جرأت نہ ہوئی، کہ یونانیون کی اہانت کا کوئی پہلو نکلنے دیتا۔ اس زمانہ مین ایک سقراط البتہ ایسا ہوا تھا جس نے علانیہ کہا تھا، کہ میرا وطن یونان نہین، بلکہ ساری دنیا ہے، لیکن اس کے بعد ہی ارسطو اس حد تک پہونچ گیا تھا، کہ ”یونانیون کے لیے غیر ملکیون کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے، جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہین“ یا اور ایک فلاسفر نے جب یہ کہا، کہ ”میری ہمدردیون کا حلقہ صرف میرے ذاتی وطن تک محدود نہین، بلکہ سارے یونان پر محیط ہے“ تو لوگ حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے تھے، یہ ملکی تعصبات سقراط کے زمانہ تک نے ور و شور سے قائم رہے، لیکن اس کے بعد یونان کی سیاسی و علمی زندگی مین جو انقلابات پیدا ہوے، انھون نے اس کوتاہ نظری کو زیادہ عرصہ تک قائم نہین رہنے دیا۔ اس کے اسباب عنوانات ذیل کے تحت مین رکھے جا سکتے ہین:۔ حکمائے یونان کا مصری علم و فلسفہ سے استفادہ، پرہنو، وانکسارکس، وغیرہ کی ہندوستانی فلسفہ کی خوشہ چینی اور اس کی مداحی، کلبیئین ولذتیت کی اشاعت جن کے نزدیک حکیمانہ زندگی کو سیاسیات سے بالکل بے تعلق رہنا چاہیے، مختص القوم و مختص الملک مذاہب کی تدریجی شکست، تمدن و علم کی روز افزون ترقی، سکندر کی عالمگیر فتوحات، اس کی تمام مفتوح رعایا کی مساوات حقوق، اور اسکندریہ کی تجارتی و علمی مرکزیت، ان تمام اسباب کی مجموعی قوت نے یونانیون کی تنگ نظری دور کردی، اور انھین دوسری قومون کے ساتھ برتاؤ مین بہت زیادہ آزاد، روشن خیال، و روادار بنا دیا تھا۔

پس اب یونان کے اثر سے رومہ کے تعصب و تنگ خیالی مین جو کمی ہوئی، وہ دگنی قوت کے ساتھ ہوئی۔ یعنی ایک تو اس حیثیت سے کہ اُس کے تمدن پر ایک دوسرا تمدن غالب آگیا، اور وہ بھی ایسا تمدن، جو آزادخیالی، بے تعصبی و رواداری کو اپنے جلو مین رکھتا تھا، اور جو مقامیت و قومیت کے قیود سے بڑی حد تک آزادی حاصل کر چکا تھا۔ دوسرے اس طرح پر بھی کہ یونانی اپنا گران قدر علم ادب صدہا سال سے رکھتے آئے تھے، دران حالے کہ رومہ، دورِ عسکریت مین تھا جو ادب کا شائبہ تک نہین رکھتا تھا بلکہ جسکی زبان تک ادائے مطلب، و خیالات عالیہ کی ترجمانی مین قاصر تھی۔ رومہ کی اس علمی پستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا، کہ یونانی تمدن سے مغلوب ہو جائے، اور ہر شعبہ علم مین اس سے مرعوب رہے۔ چنانچہ ہمین معلوم ہے کہ فےبیس پکٹر و کنکلیس اینمنٹس، قدیم ترین رومی مورخین یونانی ہی زبان مین تصنیف و تالیف کرتے تھے، اور یہ دستور باوجود انیس و مارکس کیٹو کی لاطینی نظمون کے عرصہ دراز تک قائم رہا۔ اور اکیلی تصنیف و تالیف پر کیا موقوف ہے، اطوار و خصائل، طرز معاشرت، جذبات، احساسات، غرض ہر شعبہ حیات مین، یونانی تمدن، رومی تمدن پر غالب آگیا، رومی بلا تکلف یونانیون کی تقلید کرتے تھے اور اس تقلید پر فخر کرتے تھے۔ ڈیوڈورس وپانی بی اس رومی تھے، لیکن جب دنیا کی تاریخ پر لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا، تو یونانی ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ رومی آثار قدیمہ کی جس نے سب سے پہلے چھان بین کی، وہ ڈایو نی سی اس، ایک یونانی تھا۔ رومی شہر، یونانی دستکارون، یونانی کاریگرون اور عام یونانی پیشہ ورون سے لبریز تھے۔ نقاشی، مصوری، تعمیرات، ہر صیغہ مین یونان کی تقلید رائج تھی۔ اور ناٹک و تھیٹر مین تو رومیون نے تمامتر یونانیون کی شاگردی قبول کر لی۔ ان کے شعرا اینیس، کیسیلیس، پلاوٹس، ٹرنس، وفے ڈیس، وغیرہ سب نے یونان ہی کی شاعری کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا، یہانتک کہ لکرےشیس کے زمانہ مین عاشق جب اپنی معشوقہ کی توصیف مین راگ گاتا تو وہ بھی یونانی مین۔ اور اخلاقی حیثیت سے رومی اپنے

فضائل کو رواقیت سے منسوب کرتے، اور رذائل کا لذتیت کی جانب انتساب کرتے۔ یونانی غلاموں پر بیش قدر رقمیں صرف کی جاتیں۔ ہر یونانی ہنر روم میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، اور بحیثیت مجموعی رومہ نے یونانیوں کی ایسی قدردانی کی، کہ گویا سارا یونان یہیں کھنچ کر آ لیا۔

یونانیوں کا علمی و تمدنی اثر تو رومی تنگ خیالیوں کو مٹا ہی رہا تھا، کہ خود اندرون ملک میں ایک اور سبب اس کا پیدا ہو گیا۔ رومہ میں عرصہ دراز سے امرا و عوام کے درمیان شدید مخالفت چلی آتی تھی، اور فرقہ بندی بڑھتے بڑھتے ذات پات کی سختیوں تک پہونچ گئی تھی، اس باہمی مخالفت کا نتیجہ پہلے تو یہ ہوا، کہ جولیس سیزر کی حکومت قائم ہوئی، پھر اس کے بعد جمہوریت ٹوٹ کر شہنشاہی کی بنیاد پڑی۔ ان تغیروں کے اثر سے فرقہ بندی کی سختیاں خود بخود ڈھیلی پڑ گئیں۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے، کہ خارجی جنگوں کے وقت ملک کا اندرونی شیرازہ زیادہ مجتمع ہو جاتا ہے، لیکن خانہ جنگوں کے زمانے میں تمام اندرونی شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے، پرانی فرقہ بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں، اور ہر طبقہ اُچک کر اپنے سے بلند تر طبقے میں شامل ہو جانا چاہتا ہے۔ اس کلیہ کے شواہد اس زمانے کے روم میں بھی ملتے ہیں۔ وینٹیڈیس باس جو ابتداءً ایک خچربان تھا، جولیس سیزر و انٹونی کی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر پہلے رومن فوج کا جنرل ہوا، اور پھر کانسل کے مرتبہ تک پہونچ گیا۔ اس کی دوسری مثال کارنیلیس بالبس میں ملتی ہے، یہ نسلاً اسپینی تھا، مگر یہ بھی ترقی کرتے کرتے کانسل ہو گیا۔ اغسطس اگرچہ استبداد کا پتلا تھا، مگر اپنے عہد فرمان روائی میں اس نے خچرفری کی روک تھام کے لیے یہ اجازت دیدی کہ بجز ارکان سینیٹ کے تمام اہل شہر آزاد شدہ لونڈیوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے شہنشاہی بذات خود اس کے منافی تھی، کہ فرقہ وارانہ امتیازات زیادہ عرصہ تک چل سکیں۔ اس کی بنیاد عوام کے رجحان و میلان پر تھی، اگر عوام میں ناراضی پھیل جاتی تو شہنشاہی ایک دن نہیں قائم رہ سکتی تھی، اس لیے بادشاہوں کا چار و ناچار عوام کا دباؤ ماننا پڑتا، بلکہ ان کے اشاروں پر چلنا پڑتا۔ امرا کی ایک بڑی تعداد تو شہنشاہی

حسد و غضب کا شکار ہوگئی، اور بہت سے عیاشی و اسراف میں تباہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولت و اقتدار اب دوسرے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا۔ سیاسی مخبری کرنے والے بادشاہوں کے منہ لگے ہوئے تھے، اُن کے اشاروں پر جاگیریں عطا ہوتی تھیں اور ضبط ہوکر خود انھیں کو ملتی تھیں۔ چنانچہ کیلیگولا کے عہد سے لیکر عرصہ دراز تک ان لوگوں کو اس قدر قوت حاصل رہی، کہ ان کے سامنے امرائے عظام کے نام نیچے ہو گئے، اور دولت، ثروت، قوت، اثر و اقتدار میں عوام کے ان خبر رسانوں کو وہ درجہ حاصل ہوگیا جس کی طرف چند نسلیں اُدھر امراء کا خیال بھی نہیں جاتا تھا۔

ان سب موثرات سے ہر ایک اس درجہ کی قوت رکھتا تھا کہ بجائے خود تغیر حالت کے لیے کافی تھا، لیکن بہت موثرات انھیں عنوانات میں ختم نہیں ہوئے۔ ابھی چند اور اہم موثرات کا ذکر باقی ہے، مثلاً:-

(۱) مستعمرات کا قیام۔ اس کی بنا سب سے پہلے گریکی نے ڈالی، اور اٹلی میں رومیوں کی نوآبادی قائم کی۔ اس کا اثر رفتہ رفتہ یہ ہوا، کہ وہاں کے اصلی باشندے بھی رعایا ہوتے گئے، تا آنکہ بن کر رومی سینٹ (پارلیمنٹ) میں شریک ہونے لگے۔

(۲) رومی افواج کا ممالک غیر میں قیام۔ شہنشاہی کی وسعت رقبہ نے یہ لازمی کر دیا تھا، کہ رومی سپاہ تعداد کثیر میں دور دراز مقبوضات میں قیام کرے۔ کچھ روز کے بعد اس فوج میں غیر رومی بھی بھرتی ہونے لگے۔

(۳) روم کی مرکزیت۔ ہزاروں اجنبی اشخاص مختلف ضرورتوں سے روم میں آکر بس گئے تھے، یا کم از کم یہ کہ کثرت سے آتے جاتے رہتے تھے۔ کوئی طالب علمی کرنے آیا ہے، کوئی خرید و فروخت کی غرض سے، اور کوئی سیر و تفریح کے واسطے۔ اس شے نے روم کو ایک تماشاگاہ بنا دیا تھا، جس میں ہر خیال، ہر مذاق، ہر مرتبہ علم، اور ہر معاشرت کے لوگ بہ کثرت مل سکتے تھے۔

(۴) وسائل سفر کی سہولت - رومیون نے سڑکین اس قدر وسیع، کشادہ و صاف بنوائی تھین، اور گھوڑون کی ڈاک کا اتنا اچھا انتظام کر لیا تھا، کہ سفر مین کوئی دقت ہی نہین رہی تھی - اُن کی وسیع سلطنت کے ایک حصے کا آدمی دوسرے حصے مین بلاتکلف پہونچ جاتا تھا -

(۵) بحری قوت - قرطاجنہ کے بیڑہ کو غرق کرنے کے بعد رومیون نے سمندر پر پورا تسلط جما لیا تھا - بحری قزاق جو بیشتر بہت پریشان کیا کرتے تھے، انھین معدوم کر دیا تھا - تمام بندرگاہین محفوظ تھین، اور لوگ بڑے سے بڑا بحری سفر بے تکلف کیا کرتے تھے -

(۶) ثروت و تمول - مختلف اقوام سے میل جول بڑھانے کا ایک بڑا ذریعہ تمول بھی ثابت ہوا ہے - جب انسان کے پاس سفر کے لیے روپیہ وافر ہوتا ہے، تو خواہ مخواہ کسی نہ کسی حیلہ سے اُسے سفر کی ضرورت آپڑتی ہے، اور کسی غرض سے نہ سہی تو صحت ہی درست کرنے کے لیے - یا مثلاً رومیون کو اپنے سرکس وغیرہ مختلف حیوانی تماشون کے لیے جانورون کی ضرورت رہا کرتی تھی، اور اس غرض سے بھی وہ نہایت دور از مقامات کا سفر کرتے رہتے ہین، صحرا و بیابان مین ان کا گزر کیون ہوتا، مگر یہ ضرورت انھین وہان بھی لے جاتی -

(۷) شوق علم - وسعت نظر و جستجوے علم از خود انسان کے تعصبات کو کم کر دیتی، اور اُسے اغیار سے خوشہ چینی پر مستعد کر دیتی ہے - یونان و مصر کا فلسفہ رومیون کے لیے خاص کشش رکھنے لگا، اور علمی معاملات مین اپنے پرائے کفو و غیر کفو کا امتیاز مٹ گیا - لوسن ہسپانیہ کا، مارشل، کولومیلا، وکونٹی لین، اسپین کے رہنے والے تھے، اپولیوس، قرطاجنی تھا، فلوروس غیروزیا قوم گال سے تھا، مگر ان اجنبیون نے یا وہ کس نے رومی، فلسفہ و شاعری مین شہرت حاصل کی ہے؟

ان مختلف عوامل کے پہلو بہ پہلو ایک اور انقلاب بھی جاری تھا - یہ انقلاب غلامون کی

حالت مین تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا، کہ آقا و غلام ایک جنس کے افراد معلوم ہی نہین ہوتے تھے اور یہ گمان ہوتا تھا کہ دونون کے درمیان مرتبہ و وجاہت کا فرق نہین، بلکہ بلحاظ ساخت کوئی نوعی فرق ہے۔ لیکن جب روم مین اندرونی خانہ جنگیان برپا ہوئین، تو اکثر غلامون نے اپنے آقاؤن کی رفاقت مین انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا، اور اس سے اُن کے دل مین ان کی جگہ خاص طور پر پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے مین یونان سے بہت سے علمی حیثیت کے غلام روم مین داخل ہوئے، جن کے فیض صحبت سے یہان کے غلامون مین بھی علمی ولولے پیدا ہوئے۔ اب یہان کے غلامون مین بھی تین چار اشخاص کا مصنفین اجل مین شمار ہونے لگا، متعدد نقاشون کی صف مین داخل ہوئے، اور بہتون نے طب مین خاص امتیاز حاصل کیا۔ پھر سب سے بڑھ کر وہ غیر معمولی اثر و اقتدار جو آزاد شدہ غلامون نے حاصل کیا تھا، وہ ان کے رفقاء قوم کے حق مین مفید ثابت ہوا۔ ایک طرف تو یہ سب کچھ تھا، دوسری طرف روز افزون رومی فتوحات سے لاتعداد اسیران جنگ روم مین داخل ہوتے تھے، اور قانون کے بموجب غلامی مین داخل کر لئے جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلامون کو نہایت کثرت سے آزادی ملنے لگی، بلکہ کثیر التعداد غلامون کو آزاد کرنے کی ہوا چل گئی۔ ان غلامون کو آزادی حاصل کیونکر ہوتی تھی؟ اس کی مختلف صورتین تھین۔ کچھ غلام تو اپنے جیب خرچ مین سے کچھ جمع کرتے رہتے، یہانتک کہ ایک معتدبہ رقم جمع ہو جاتی اور اُسے دیکر آزادی خرید لیتے، اور کچھ یہ کرتے کہ آزادی حاصل کرتے وقت ایک اقرار نامہ اس امر کا لکھ دیتے، کہ کچھ مدت کے بعد وہ ایک رقم معینہ اپنی محنت سے کما کر ادا کر دین گے۔ پھر مختلف آقا جس نیت سے غلامون کو آزاد کرتے، اس کی بھی مختلف صورتین تھین۔ بعض اس خوف سے انھین آزاد کر دیتے، کہ کہین پولیس کے جور و تشدد سے وہ خود اُن آقاؤن کے جرائم کا راز نہ افشا کر دین، بعض اُن کی گزشتہ خدمات و خیر خواہیون کے صلہ مین انھین آزادی دیتے، اور بعض ایسے بھی ہوتے جو محض اظہار شان کے خاطر

انھین آزاد کرتے تھے یعنی اس توقع پر کہ ان کے جنازہ کے ساتھ ان کے آزاد کردہ غلامون کی ایک غیر معمولی کثیر ساتھ ہو۔ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ آزاد شدہ غلام پوری طرح پر آزاد نہین ہو جاتے تھے بلکہ ہمیشہ وہ، اور ان کی اولاد، قدیم آقا کی سرپرستی مین رہا کرتی تھی جس کا جنگ وغیرہ کے مواقع پر ساتھ دینا اُن کا فرض تھا۔ پوری آزادی انھین تیسری پشت مین جاکر حاصل ہوتی تھی۔ پس غلامون کو آزاد کرنے مین آقاؤن کا کوئی نقصان نہ تھا، بلکہ ایک طرح کا فائدہ ہی تھا چنانچہ اپنی زندگی مین تو متفرق طور پر افراد کو آزادی دیا کرتے تھے، لیکن موت کے وقت اپنے سامنے، یا بذریعہ وصیت نامہ کے صدہا غلامون کو آزاد کر جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کا رواج اتنا بڑھا کہ حکومت کو روک تھام کرنا پڑی، چنانچہ اغسطس نے یہ قانون نافذ کر دیا کہ کوئی شخص وصیۃً سو غلامون سے زیادہ نہین آزاد کر سکتا ہے۔ اسی زمانے مین کسی نے یہ تجویز بھی کی کہ غلامون کو ایک مخصوص وضع کی وردی پہننا چاہیے، لیکن اس تجویز کو اس بنا پر رد کر دینا پڑا کہ اس سے خود غلامون کو اُن کی کثرت تعداد و قوت کا علم ہو جائے گا، جس سے ممکن ہے کہ انھین کسی بغاوت یا شورش کی تحریک ہو۔ اب روم کا یہ حال تھا، کہ اس کی آزاد آبادی کا جزو اغلب یا تو خود آزاد شدہ غلام تھے، یا غلامون کی اولاد تھے۔ مونٹسکیو نے کیا پر لطف بات کہی ہے کہ "روم مین دنیا کی آبادی غلام ہو کر داخل ہوتی تھی، اور آزاد ہو کر نکلتی تھی"

تصریحات بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ جمہوریت کے زمانے سے شہنشاہی کے زمانے تک کس قدر انقلابات ہو گئے تھے۔ کہان وہ زمانہ تھا کہ تمام اعلیٰ عہدے خاص طبقہ امرا کے لیے محدود تھے، تعیش کی خفیف سی خفیف صورت محتسب کی نظر سے دار و گیر یا زیر پرس ہوتی تھی، اہل خطابت محض اس جرم پر جلا وطن کر دیے گئے تھے کہ انھین ان کی تقریرون کے اثر سے اہل ملک مین اجنبی قومون کے اطوار و خیالات نہ سرایت کر جائین، اور اب روم سے مستقر حکومت کو تبدیل کرنے کی تجویز محض اس بنا پر

مسترد کردی جاتی تھی، کہ اس سے قومی دیوتاؤن کے بتون کو وہان سے ہٹانا لازم آئے گا، اور کہان اب یہ زمانہ آگیا۔ کہان وہ انتہائی تنگ خیالی، قدامت پرستی وجمود اور کہان یہ جدت پسندی، روشن خیالی، آزاد مشربی، اور دوسرون کے اطوار وافکار اخذ کرنے کا شوق!

یہ جو عام مشارکت ومساوات کی تحریک پھیل گئی تھی، اس کا بیشتر حصہ یقیناً طبعی حالات کا نتیجہ، اور انسانی ارادہ کے دخل وتصرف سے برتر تھا۔ لیکن اس مین شک نہین کہ اس تحریک کی رفتار کو ایک متعین پالیسی نے اور تیز کر دیا تھا۔ جمہوریت کی پالیسی فتح وتسخیر کی پالیسی تھی، لیکن شہنشاہی کی پالیسی بقا وتحفظ کی تھی۔ اُس زمانے مین ان کی توجہ تمام تر جنگ کر کے دوسری قومون کو مغلوب کرنے مین مصروف تھی، لیکن اب جبکہ ان کے حدود مملکت نہایت وسیع ہو گئے تھے، تو انھین لازمی طور پر یہ فکر پیدا ہوئی، کہ ایسی مختلف ومتعدد قومون پر، جن کی نہ زبان مشترک ہے نہ مذہب، نہ رسم ورواج، اور نہ عقاید وخیالات، کیونکر خوش اسلوبی سے حکومت کی جا سکتی ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے معاصر فاتح اقوام کے سامنے بھی پیش ہے، لیکن انھون نے تو اس کا حل، مختص المقام حکومتون کے ذریعہ سے کر لیا ہے، یعنی اس طرح پر کہ مفتوحون کو اس کی اجازت دیدی ہے، کہ وہ اپنی اپنی ضروریات وحالات کے مطابق خود قانون بنائین، اور انھین حکومت خود اختیاری مین حصہ دیدیا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر وموزون تر حل اس مسئلہ کا ہو ہی نہین سکتا۔ لیکن یہ تمام تر انگریزی دماغ وتدبر کا نتیجہ ہے۔ رومن اس سے ناواقف تھے۔ انھون نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا، کہ پہلے مفتوحون کے ساتھ پوری رواداری کا برتاؤ کیا۔ اُن کو اس امر کی آزادی کامل دیدی، کہ اپنے رسم ورواج طور وطریقہ، ومعتقدات مذہبی پر قائم رہین۔ اس کے بعد انھین امور سلطنت مین رفتہ رفتہ پوری طرح پر دخیل کرنا شروع کر دیا، یہان تک کہ کسی بڑے سے بڑے

ملکی عہدہ کا دروازہ مفتوح اقوام پر بند نہ تھا، اور انھین وہ حقوق پورے کے پورے حاصل تھے، جو خود اہل روما کو حاصل تھے۔ بے شبہہ اتنی وسعت کہین مدتون مین جا کر حاصل ہوئی، لیکن حاصل ہوئی سہی، اور اس کا سب سے بڑا اعلی ثبوت اُس وقت ملا جب ایک اسپینی نسل کا شخص ٹریجن اور اس کے بعد ایک آزاد شدہ غلام کا لڑکا پرٹینکس خود تخت شاہی پر متمکن ہوا۔ حاکم و محکوم کے درمیان مساوات و عدم تفریق کی اس سے بڑھ کر کیا نظیر ہو سکتی ہے؟ شہنشاہ کریکلا کے ایک فرمان نے خاص رومی شہریت کے حقوق مین دور دست صوبجات باشندون کو بھی برابر کا شریک کر دیا۔

ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ پینٹیس و قسطنطین کے عہد کے درمیان ایک عام میل ملاپ، رواداری، مساوات و مشارکت باہمی کی جو ہوا چلی تھی، اس کی نظیر بہ لحاظ وسعت و قوت صفحات تاریخ مین کہین نہین ملتی۔ اس کا جلوہ مذہبی، علمی، فلسفی، جنگی، سیاسی، کاروباری، خانگی غرض ہر زندگی مین نظر آتا تھا، اور کوئی شئے ایسی نہین باقی رہ گئی تھی، جو اس سے غیر متاثر ہو۔ قدیم تعینات ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے تھے، قدیم نظامات باطل ہو چکے تھے، اور رومی قومیت کا جو شیرازہ مدتون سے بندھا چلا آرہا تھا وہ اب بالکل درہم و برہم ہو گیا تھا۔ مختصر الفاظ مین یون کہنا چاہیے، کہ جس اخلاقی نتائج کو ہم نے روما کی قومی سیرت سے تعبیر کیا تھا، اب اس کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی تھی، اور عادات و خصائل، آداب و اطوار، مزاج و طبیعت، غرض اُن تمام چیزون کی جنھین رومی سیرت کے عناصر ترکیبی قرار دیا سکتا تھا، بالکل ہی قلب ماہیت تھی اس انقلاب سیرت کا اخلاقی نتیجہ، اس مین شبہ نہین، کہ متعدد حیثیات سے سخت مضر نکلا، چنانچہ لِٹیو وطیکیٹس وغیرہ نے انھین مضرتون کے خیال سے اس کی روک تھام بھی کرنا چاہی، لیکن اس سے بھی انکار نہین ہو سکتا، کہ رذایل اخلاق مین افزایش کے ساتھ فضائل اخلاق مین بھی اضافہ ہو گیا اور رومی نیکیون نے ایک دوسرے رنگ و قالب مین ظاہر ہونا شروع کیا پہلے یہ نیکیان

عسکریت و وطنیت کے رنگ مین رنگی ہوتی تھین لیکن اب خیالات وہمدردیون مین وسعت آجانے سے وہی نیکیان، عام رواداری و وسیع المشربی کے قالب مین ڈھل کر نکلنے لگین۔

اخلاقی انقلاب کے اس جزو پر رواقیت لبیک کہنے کو فوراً آمادہ ہوگئی۔ وہ تو اس کے لیے ابتدا سے تیار تھی۔ اُس نے گو ہر ملک مین وطنیت کو تقویت دی تاہم روزِ اول سے اُس نے اخوت انسانی کو اپنے اصول و تعلیمات کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس کی تعلیم یہ تھی، کہ دنیا مین قدر و احترام کے لایق شے صرف نیکی و نیک کاری ہے، اور اس کے سوا تمام اوصاف ناقابل لحاظ ہین، دولت، عزت، شرافت، حکومت، سب اتفاقی و عارضی چیزین ہین، جو شے بمنزلہ بنیاد کار و جوہر کے ہے، وہ نیک کرداری ہے۔ اُس کی تعلیم کو حرف بحرف صحت کے ساتھ سعدی نے نظم کردیا ہے کہ

بنی آدم اعضاے یک دیگراند — کہ در آفرینش زیک جوہراند

اس بنا پر کسی شخص کو ایک دوسرے پر امتیاز و تفوق کا حق حاصل نہین، بجز اس کے کہ اس کی بنا سیرت کی خوبیون پر ہو۔ بہ قول رواقیین، خدا کے نزدیک وہی بزرگ ہے جو بہ لحاظ پاکیزگی اخلاق بزرگ ہو۔ اس خیال کو انھون نے بار بار اپنی تصانیف مین ظاہر کیا ہے۔ سب سے پہلے اور پُر زور طریقے پر اس کی مثال ہمین سسرو کی تحریرون مین ملتی ہے، جسکے جستہ جستہ اقتباسات حسب ذیل ہین:۔

"تمام کائنات کو مثل ایک شہر واحد کے سمجھنا چاہیے جس مین انسان و دیوتا بستے ہین...... آدمی صرف اس غرض سے پیدا کیا گیا ہے کہ آدمی کے کام آئے۔۔۔ فطرت کا حکم یہ ہے کہ ہر انسان کو دوسرے انسان کا بہی خواہ ہونا چاہیے، خواہ وہ اُس سے کیسا ہی اجنبی ہو، اس بنا پر کہ وہ بھی انسان ہے۔۔۔ یہ کہنا کہ انسان کو صرف اپنے شہر کے فرائض ادا کرنا چاہیے،

اور دنیا کے تمام شہروں سے غافل رہنا چاہیے، نوع انسانی کی عالمگیر اخوت کی توہین کرنا ہے۔ ... فطرت نے ہمیں محبت انسانی پر مجبول کیا ہے اور اسی پر درحقیقت سارے آئین و قانون کی بنیاد ہے۔"

سسرو تو خیر، السابقون الاولون میں تھا۔ لیکن اس کے بعد متاخرین رواقیین نے بھی اس عقیدہ کا اسی بلکہ اس سے زیادہ قوت کے ساتھ اعادہ کیا ہے۔ مینانڈر کے ایک شعر کا یہ مضمون، کہ "کوئی انسانی شے میری دلچسپیوں کے دائرہ سے خارج نہیں"، ان کے حلقہ میں نہایت مقبول ہوا۔ ان کا شاعر لوسن ذوق و شوق کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ دن کب آئے گا، جب نوع انسان اسلحہ کا استعمال فراموش کرے گی اور ہر قوم دوسری قوم کے ساتھ رشتۂ الفت و مواخاۃ جوڑے گی۔ سنیکا کے خیالات ان اقتباسات سے ظاہر ہوں گے:-

"یہ تمام دنیا، مع اپنے مشمولات کے، ایک شے واحد ہے، ہم سب گویا ایک جسم کے مختلف اعضا ہیں۔ فطرت نے ہم سب کو ایک ہی مادہ سے اور ایک ہی مقصد کے لیے خلق کیا ہے۔ اس نے ہماری سرشت کو باہمی لطف واتحاد سے خمیر کیا ہے۔ ... یہ کہنا کہ فلاں رومی سردار ہے، فلاں آزاد شدہ غلام ہے، فلاں غلام ہے، کیا معنی رکھتا ہے بجز اس کے کہ ہماری حرص یا حسد نے ان امتیازات کو گڑھ لیا ہے۔ ... میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ میرا وطن تمام عالم ہے، اور میں دیوتاؤں کی سرپرستی میں ہوں۔"

اپکٹیٹس کے الفاظ یہ ہیں:-

"یہ خیال رکھو کہ تم دنیا کے باشندہ اور اس کا ایک جزو ہو۔ ... پس تمھیں کوئی حق نہیں، کہ تم اپنے "کل" سے علیحدہ ہو کر اپنی ذات وشخصیت کے بابت کچھ فکر کرو۔ بعینہ اس طرح کہ جیسے انسان کے اعضا اس کے جسم سے

علیحدہ ہوکر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے، تمہارا ابھی دنیا سے علیحدہ کوئی وجود نہیں"

مارکس آریلیس کا قول تھا، کہ "بہ حیثیت انٹونی کی نسل سے ہونے کے میرا وطن روم ہے، لیکن بہ حیثیت انسان کے ساری دنیا" الغرض جہان تک اخلاق کے اس حصہ کا تعلق ہے، رواقیت نے اپنے تئین زمانہ کے بالکل موافق ثابت کردیا، بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ حسن خوبصورتی کے ساتھ یہ عقیدۂ اخوت انسانی رواقیت کے سانچہ مین ڈھل گیا، اُس سے بہتر مثال، مقتضیات عصریہ کے مطابقت کی ہو ہی نہین سکتی۔ فلاطون نے یہ کہا تھا کہ کوئی شخص اکیلی اپنی ذات کے لیے نہین پیدا ہوا ہے، بلکہ اپنے والدین، اپنے احباب، اور اپنے وطن سب پر کم و بیش اپنا حق رکھتا ہے۔ رومی رواقیین نے اب اسے اور وسعت دے کر یہ کہا، کہ کوئی شخص اکیلی اپنی ذات کے لیے نہین پیدا ہوا ہے، بلکہ ساری دنیا پر اپنا حق رکھتا ہے، اور یہ وسیع المشربی کی تعلیم، اُن کے ابتدائی اصول کی عین مطابقت مین تھی۔

لیکن جیسا کہ چند صفحہ اُدھر کہہ آئے ہین، انقلاب جدید کا محض یہی تقاضا نہ تھا کہ اخوت انسانی کے دایرہ کو عالمگیر کیا جائے، بلکہ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا، کہ تمدن کی روز افزون ترقی کے ساتھ افراد کے مزاج مین بجائے خشکی و تقشف کے زندہ دلی و لطافت پیدا ہو، بجائے خشونت اور کھرے پن کے ملنساری و خوش خلقی آئے۔ اور عسکریت کی جگہ شہریت لیلے لیکن رواقیت اس معیار پر پوری نہ اتر سکی انقلاب تمدن کی مشق اول کا اُس نے پرجوش خیر مقدم کیا تھا، لیکن اس جدید تغیر کے مطابق وہ اپنے تئین نہ ڈھال سکی۔ مدت کی خشک مزاجی جذبات کشی اور دنیا سے بےتعلقی نے متبعین رواقیت کو اس قابل ہی نہین رکھا تھا، کہ اصول رواقیت پر قائم رہ کر وہ اپنے جذبات کو بھی زندہ رکھ سکین۔ اس کشمکش کا نتیجہ ایک نئے مذہب مصنفین کی

شکل مین ظاہر ہوا۔ یہ لوگ بھی مثل رواقیین کے بجاے راحت کے نیکی کو غایت الاعمال سمجھتے تھے، اور نیکی کو ضبط خواہشات کا مرادف قرار دیتے تھے، تاہم انھون نے انسان کے جذبات لطیف کو زیادہ مطلق العنان کر دیا تھا۔ الٰہیات کے مسائل مین یہ لوگ باہم مختلف العقاید تھے، مثلاً کوئی اپنے تئین مشائی کہتا تھا، کوئی اشراقی، اور کوئی کچھ اور، تاہم اتنا ٹکڑا ان سب مین مشترک تھا کہ ان کے نیکی کے تخیل مین بہ نسبت رواقی تخیل کے انسان کے نازک احساسات لطیف جذبات کا زیادہ لحاظ رکھا گیا تھا۔ اب لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ارادے کا استحکام اور ضبط خواہشات ہی زبدة الفضائل نہین، بلکہ لطف و محبت، درد و گداز بھی کچھ معنی رکھتے ہین۔ ان مصنفین کی تحریرون سے صاف ٹپکتا ہے کہ یہ درد مند دل رکھتے تھے، اور درد سے متاثر ہوتے تھے اس کی ایک واضح نظیر ہمین پلینی کے اس خط مین ملتی ہے جو اس نے اپنے غلامون کی وفات پر لکھا تھا، اور جو ہمہ تن سوز و گداز درد و تاثیر کے رنگ مین ڈوبا ہوا ہے۔ یا پھر پلوٹارک کا وہ تعزیت نامہ بھی قابل ملاحظہ ہے جو اس نے اپنی لڑکی کے انتقال پر اپنی بیوی کو بھیجا تھا۔ حضرت باین ہمہ عار رواقیت اپنی بیوی کو تلقین صبر کرتے کرتے اور اس واقعہ کو بالکل معمولی سمجھنے کی ہدایت کرتے کرتے دفعةً اپنی لڑکی کی اس خصوصیت کو یاد کر کے بے اختیار ہو جاتے ہین کہ "آہ وہ کیسی محبت شعار تھی۔ وہ یہ تک نہین چاہتی تھی کہ وہ خود آسودہ ہو، اور اس کی گڑیا بھوکی رہے۔ اپنی دایہ سے بار بار فرمایش کرتی تھی کہ گڑیا کو بھی دودھ پلائے"

فصل (۴)

اخلاقیین اقلیطیقی کا دور[۱]

پلوٹارک کو دنیا صرف اس حیثیت سے جانتی ہے کہ وہ بہت بڑا سوانح نویس تھا

۱ اقلیطیقی معرب ہے انگریزی لفظ Eclectic کا جو یونانی الاصل ہے، اور جس کے لفظی معنے انتخاب کرنے والے کے ہین (بقیہ بر صفحہ ۱۹۹)

حالانکہ اسی کے ساتھ وہ ایک بلند پایہ حکیم اخلاق بھی ہوا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے، کہ فلسفۂ اخلاق کا اب یہ جو جدید مسلک پیدا ہوا ہے اس کا علم بردار اول وہی تھا، بالکل اسی طرح کہ جیسے رواقیت قدیم کا پیمبر سنیکا ہوا تھا۔ اس بنا پر اخلاقیات جدید کی ماہیت تشخیص کرتے ہوئے بہتر ہوگا، اگر ہم خود پلوٹارک و سنیکا کے خیالات کا موازنہ کرتے جائیں۔ سنیکا کی تحریریں اٹھا کر دیکھیے تو ان میں صاف تصنع، تکلف و آورد کا رنگ نظر آئے گا، اور یہ علانیہ نظر آئے گا، کہ کوئی واعظ یا خطیب اپنے کلام میں قصداً تاثیر پیدا کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ پھر عبارت میں تسلسل بھی نہیں، اکثر ایک فقرہ دوسرے فقرے سے بالکل غیر مربوط معلوم ہوتا ہے۔ اینٹ پر اینٹ، بغیر چونے مٹی کی آمیزش کے رکھتے چلے جائیے، بس اس سے جو نتیجہ پیدا ہوگا، وہی کیفیت اس کی تحریر کی ہے۔ باایں ہمہ اس میں شبہ نہیں ہو سکتا، کہ جو عظمت اس کے خیالات سے ٹپکتی ہے یا جو رفعت اس کی طرز ادا سے ظاہر ہوتی ہے، اس کی نظیر کسی اور حکیم اخلاق کے یہاں نہیں مل سکتی۔ اس کے مقابلہ میں، پلوٹارک کی اوراق گردانی کیجیے، تو خیالات میں تو یہاں نسبتہً بہت پستی نظر آئے گی، لیکن ہر فقرہ دوسرے فقرے سے نظم و ربط رکھتا ہوگا، اور تسلسل عبارت بہ حیثیت مجموعی لطیف ہوگا۔ ہر بات میں آمد و بیساختگی پائی جائے گی۔ مبالغہ، غلو، و تصنع کا نام تک نہ ہوگا۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے، جنھیں تم بیش پا افتادہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہو، اہم نتائج نکالے گئے ہوں گے، اور عبرتناک بصیرتیں حاصل کی گئی ہوں گی۔ سنیکا کی تحریر میں ایک طرح کا مردانہ اکھڑپن پایا جاتا ہے، جس سے کوئی مصیبت زدہ تسلی نہیں حاصل کر سکتا، البتہ جو سیرتیں پہلے سے مضبوط و مستقل ہوتی ہیں ان میں اس سے

(بقیہ از صفحہ ۱۹۸) اصطلاحاً سے مراد وہ حکما و اخلاقیین، جو ہر مذہب اخلاق سے مفید باتیں انتخاب کر لیتے تھے۔

اور استقامت آجاتی ہے۔ مثلاً ایک شجاع سپاہی میدان جنگ مین کھڑا ہو، تو سنیکا کی تقریر اُسے اس پر بالکل آمادہ کر دے گی کہ غایت پامردی و استقامت کے ساتھ جان دیدے۔ لیکن فرض کرو کہ ایک عورت کا جوان بیٹا مر گیا ہے، تو اس دکھیاری ماں کے لیے سنیکا کا سارا دفتر بیکار ہے، اس کو اگر کچھ ڈھارس اور تسلی ہو سکتی ہے تو صرف پلوٹارک کے صفحات سے۔ اس کے یہان کھرا پن نہین ہوتا، بلکہ ایک طرح کی نسوانی لطافت ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ درد و گداز، اس اختلاف کو موسیقی کے ضلع مین لائے، تو یون کہہ سکتے ہین، کہ پلوٹارک کو پڑھتے وقت گویا شہنائی کے سننے کا لطف آتا ہے، جس کی سُریلی نغمہ سرائیان طبیعت کے ہیجان کو تسکین دیتی ہین، بخلاف اس کے سنیکا کے الفاظ گویا فوجی بگل یا قرنا کا اثر رکھتے ہین، جن سے دبے دبائے جذبات فاضلہ ہیجان مین آجاتے ہین۔

سنیکا نے اپنے مکاتیب مین رواقیت کے جن مسائل سے بحث کی ہے، مثلاً تمام معاصی کا مساوی الرتبہ ہونا، یا تمام جذبات کا قابل ترک ہونا، وہ تو مدت ہوئی متروک ہو چکے ہین، اور اب اُن مکاتیب کی حیثیت صرف ایک تبرک کی رہ گئی ہے، البتہ ان تحریرون کا عام انداز و لہجہ ضرور اہم و قابل لحاظ ہے، کیونکہ اب صرف انھین اوراق کے اندر رواقیت کے اُس اخلاقی سانچہ کا عکس محفوظ ہے، جسکا کوئی اثر زمانۂ مابعد کی تحریرون مین نہین ملتا۔ بخلاف اس کے پلوٹارک کا جو انداز تحریر ہے، اُس کا چربہ بعد کو اس کثرت سے اُتارا گیا، اور اُسے اتنی ترقی دی گئی، کہ ان ترقی یافتہ صورتون کے سامنے خود پلوٹارک کا انداز تحریر ماند پڑ گیا۔ ہان جو شے پلوٹارک کے یہان اہمیت رکھتی ہے، وہ اس کا فلسفہ اور اس کے مسائل اخلاقی ہین۔ "ربوبیت"، "ضعیف الاعتقادی" پر اُس نے جو تصانیف چھوڑی ہین، وہ درحقیقت لاجواب ہین، اور غالباً وہی پہلا شخص تھا، جس نے حیوانات کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی، نہ اس

فیثاغورسانہ خیال سے کہ وہ پہلے جنم مین انسان تھے، بلکہ اس بنا پر کہ تمام مخلوق ہماری ہمدردی کی مستحق ہی۔ اور پھر عفت و عصمت اور محبت زوجی کا جتنا قدر شناس وہ تھا، اس کے لحاظ سے بھی اُسے اپنے معاصرین مین ایک درجہ امتیاز حاصل ہی۔

رومیون کو اخلاقیات کے نظری منطقی پہلو کے بہ نسبت اُس کے عملی پہلو سے ہمیشہ زیادہ دلچسپی و توجہ رہی ہی۔ چنانچہ رواقیت کی طرف جو انھین خاص کشش تھی، تو وہ اس بنا پر نہین، کہ وہ ایک معقول و مستدل نظام عقلی تھا، بلکہ اس لیے کہ اُس نے ان کے لیے عملی زندگی کا ایک سانچہ مہیا کر دیا تھا، اور سانچہ بھی ایسا جو رومی سیرت کے لیے خاص طور پر موزون تھا۔ مگر زمانے کے اثر سے کون شے بچ سکتی ہی؟ شدت و سختی تو رواقیت کی گھٹی مین پڑی تھی، جس کی بنا پر وہ کسی اعلیٰ تمدن کے مطابق ہو ہی نہین سکتی تھی، تاہم اُس نے بھی اب اپنے تئین بہت کچھ زمانے کے مطابق ڈھال لیا تھا، اور متاخرین رواقیہ نے تو بہت کچھ غیرون کے عقاید کو اپنا کر لیا تھا، چنانچہ اور تو اور خود سنیکا تک خالص و بے آمیز رواقی نہین رہا تھا، ایپکٹیٹس مین بے شبہ اس سے زیادہ رواقیت خالص کے عناصر موجود تھے، لیکن اس کی وجہ یہ ہی کہ ذاتی طور پر اُسے ابتداء عمر مین جن شدائد و صعوبات کا خوگر ہونا پڑا تھا، اُس نے اُسے ضبط و تحمل کا زیادہ قدر شناس بنا دیا تھا۔ مارکس آریلیس کے گرد و پیش مختلف مذاہب اخلاق کے متبعین کا مجمع رہتا تھا اور اس لیے اُس کی رواقیت مین بہت کچھ اشراقیت کی آمیزش ہو گئی تھی۔ زمانہ سب سے اپنی قوت منوالیتا ہی، اور رواقیت بھی اگرچہ بجائے خود بہت قوی تھی، تاہم اُسے بھی زمانے کی قوت تسلیم کرنا پڑی۔ متاخرین مین تھریسیا کا وہی پایہ ہوا ہی، جو قدما مین کیٹو کا تھا، تاہم تھریسیا مین کہین اُس شدت و غلو کا پتہ تک نہ تھا جس سے کیٹو کا خمیر تھا۔

رواقیت کی جدید شکل وباتون مین خاص طور سے اپنے پیشروسے ممتاز تھی اولاً، اس حیثیت سے، کہ اس مین مذہبیت زیادہ سرایت کرگئی تھی، رومی سیرت مین یون تو دیگر اعلی سیرتون کی طرح ہمیشہ سے جذبۂ تقدس موجود تھا، تاہم اس لحاظ سے بھی یہ عیسائیت سے بالکل متمایز تھی۔ اس کا اصل زور عبادت پر نہین بلکہ پاکیزگی اخلاق و تزکیۂ نفس پر تھا اور تزکیۂ نفس بھی ایسا جس کا جلوہ اعاظم رجال مین نظر آتا رہا ہی۔ لوسن نے ایک مرتبہ علانیہ یہ خیال نظم کردیا، کہ "خدا فاتحون کا ساتھ دیتا ہی، اور میرا ممدوح کیٹو مفتوحون کا"۔ یا ایک جگہ سینیکا "دیوتاؤن کی معیت" ذکر کرتا ہی، مگر ان ملحدانہ خیالات پر کسی کے کان تک نہ کھڑے ہوئے۔ اور وہ اقتباسات تو ہم کسی گزشتہ فصل مین دے ہی چکے ہین، جن مین ایک حکیم اخلاق اور خدا کے مساوی الرتبہ ہونے کا بے پردہ دعوی کیا گیا ہی۔ غرض قدما کے یہان جناب باری کی شان مین اس طرح کے گستاخانہ واہانت آمیز کلمے بے تکلف استعمال ہوتے تھے، البتہ نیکی و فضیلت اخلاق کا حد درجہ احترام ہوتا تھا، اور خصوصاً کیٹو کے ہم مزاج اشخاص نے فضائل اخلاق کی خاطر، حالات مخالف کے مقابلہ مین جس قدر جد وجہد کی ہی، اُس کا جواب تو تاریخ عالم کے پردہ مین کہین نہین ملتا۔ نیکی کو یہ لوگ عین منشاء تقدیر الٰہی خیال کرتے تھے اس طرح پر کہ عقیدۂ وحدت وجود کے مطابق ہر نیکی، اسی ذات واجب الوجود کا ایک مظہر ہی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سب خیالات بدل گئے۔ وحدت وجود کی جگہ اب ایک مشخص خدا نے لے لی، اور غیر مذہبی نیکی کے بجاے مذہبیت کا کھلے کھلے لفظون مین اعتراف کیا جانے لگا۔ چنانچہ اپکٹیٹس و مارکس آریلیس کے ہر صفحہ مین اس کے شواہد ملتے ہین۔ اپکٹیٹس کے یہ مقتبس فقرے پڑھنے کے قابل ہین:-

"سب سے پہلے جاننے کی چیز یہ ہی کہ ایک رب کا وجود ہی، جس کا علم تمام کائنات کو محیط ہی، اور جو نہ صرف ہمارے اعمال سے بلکہ

ہمارے اندرونی جذبات و تصورات تک سے خبردار رہتا ہے۔۔۔ جو شخص نیکی کی راہ چلنا چاہتا ہے، اسے لازم ہے کہ خود اوصاف باری کا اتباع کرے۔ جس طرح خدا صادق ہے وہ بھی صداقت اختیار کرے، جس طرح خدا آزاد ہے، وہ بھی آزادی حاصل کرے، جس طرح خدا نیک ہے، وہ بھی نیکی کرے، اور جس طرح خدا فیاض ہے، وہ بھی فیاضی برتے۔

"خدا ہمارا خالق، مربی، و محافظ ہے کیا یہ ہمیں بند وحشت و قید غم سے آزاد رکھنے کے لیے کافی نہیں؟"

"جب تم کمرہ بند کرکے اس کی تاریکی میں تنہا ہوتے ہو، تو یہ نہ سمجھو کہ تم تنہا ہو۔ خدا اور تمھارا فرشتہ تمھارے ساتھ ہیں، انھیں اس کی حاجت نہیں ہوتی کہ کسی مادی روشنی کے ذریعہ سے تمھیں دیکھیں۔ مجھ ضعیف و ناقص العضو بندہ کا سوا اس کے اور کیا کام ہے کہ حمد باری کے راگ گاؤں؟ اگر میں کوئی پرندہ ہوتا، تو اس کے فرائض ادا کرتا، لیکن اب جبکہ حیوان ناطق ہوں، تو بجز اس کے میرا کیا فرض ہو سکتا ہے، کہ حمد باری میں رطب اللسان رہوں، یہ میرا فرض ہے، میں اس پر قائم رہوں گا، اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ بھی میرے ہمزبان ہو کر اسی کی تقدیس کا راگ گائیں۔"

مارکس اریلیس کے یہاں مذہبیت کا غلو اس سے بھی زیادہ زور و شور سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ اس میں اور اپکٹیٹس میں فرق یہ ہے، کہ وہاں نفس انسانی کی عظمت پر زور دیا گیا ہے، اور یہاں جذبات انکسار و تواضع پر۔ اپکٹیٹس بار بار یہ کہتا ہے کہ انسان ایک پرعظمت و باوقعت مخلوق ہے، جسے کسی وقت اپنے مرتبہ شرف کو نہ بھولنا چاہیے۔ بہ خلاف اس کے مارکس آریلیس ہر جگہ انسان کے ضعیف البنیان پر زور دیتا ہے

اور اس کی تحریر تمام تر انسان کو انکسار و فروتنی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ان مسیحی راہبوں کی سطح تک نہیں پہونچا تھا، جو شدید مبالغہ آمیز انکسار سے کام لیکر اپنے لیے ایسے نا ملائم الفاظ استعمال کرتے ہیں، جو شاید ایک قاتل یا زانی کی نسبت بھی باعث توہین ہوں تاہم وہ اپنے کردار پر خود نہایت بیدردی سے نکتہ چینی کرتا رہتا تھا، دوسرے معلمین اخلاق سے اپنا احتساب کراتا رہتا تھا اور جذبہ ترفع کے خفیف سے خفیف شائبہ کو بھی دبائے رکھتا تھا۔

نو رواقیت جدید کی ایک خصوصیت اس کی مذہبیت تھی، دوسری یہ تھی کہ بجائے خارجی عناصر کے اب داخلی عناصر کی زیادہ آمیزش ہو گئی، یعنی کلینیو وسسرو کے زمانے تک نیکی و بدی کا تعلق عمل سے تھا لیکن متاخرین کے یہاں اس کا دائرۂ خیال و فکر تک وسیع ہو گیا۔ بعض اہل الرائے اس طرف گئے ہیں کہ یہ تغیر نتیجہ تھا مسیحیت کے اثرات کا، لیکن میرے نزدیک یہ خیال، واقعیت کے بالکل عکس ہے کیونکہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانی اس خیال سے نا آشنا نہ تھے فلاطون و زینو کی اپنے تلامذہ پر یہ تاکید تھی، کہ اپنے خوابوں کو یاد کر کے ان پر غور و فکر کیا کرو، کہ اس سے تم کو اپنے باطن کی اصلی کیفیت آئینہ ہو گی۔ فیثاغورس کا اپنے اتباع کے لیے یہ حکم تھا، کہ سوتے وقت وہ دن بھر کے اپنے تمام افعال کا خود محاسبہ کیا کریں۔ چنانچہ روم میں زوال جمہوریت سے پیشتر ہی یہ فیثاغورسی اصول رائج ہو گیا تھا، سسرو و ہوریس اس سے واقف تھے، بلکہ سکسٹس (استاد سنیکا) اس پر عامل تھا، اور خود سنیکا کا بیان ہے کہ اس نے اس کی تعلیم سکسٹس سے حاصل کی تھی۔ ان سب پر مستزاد یہ ہوا کہ فلسفہ فیثاغورث کے جلو میں ایشیائی مذاہب تھے، چنانچہ روم میں اس کے داخلہ کے ساتھ یہ بھی داخل ہوئے، اور اب چونکہ جمہوریت کے بجائے شہنشاہی قائم ہو جانے سے لوگوں کی توجہ سیاسی مشاغل کی جانب سے از خود ہٹ گئی تھی، اس لیے اس کا

لازمی نتیجہ یہ نکلا، کہ سیرت انسانی کے ان داخلی و نفسی اجزا کی حیثیت زیادہ اجاگر ہو گئی جو
خود سنیکا کے مکاتیب کیا ہیں؟ گویا مختلف امراض اخلاقی کا علاج ہیں۔ پلوٹارک
کا رسالہ "علامات ترقی اخلاقی" جذبات کی اصلاح و تہذیب کا ایک دستور العمل ہے۔
رفتہ رفتہ یہ فقرہ موعظت عام طور پر زبانوں پر چڑھ گیا، کہ اعضا کی ظاہری پابندی
نہیں، بلکہ دل کا خضوع و خشوع مخ عبادت ہے، اور احتساب نفس انسان کے لیے
بزرگترین فرائض میں سے ہے۔ اپکٹیٹس کی یہ نصیحت تھی، کہ اپنے خیال و تصور کو بدی
سے اس قدر پاک رکھو، کہ کسی حسین عورت کو دیکھ کر تمھارے ذہن تک میں یہ تصور
نہ پیدا ہو، کہ "اس کا شوہر کیا خوش نصیب ہے" اور مارکس ارلیس کے مقالات
تو تمامتر اسی سبق کا اعادہ ہیں، کہ انسان کو اپنے سنگین محاسبۂ نفس کا خوگر ہونا چاہیے
اور بدی و بدکاری کے تصور تک سے اپنے ذہن کو آلودہ نہ ہونے دینا چاہیے۔

پلوٹارک کا قول ہے، کہ جن سیرتوں میں پہلے ہی درشتی و بے آمیزی ہوتی ہے ان میں
رواقیت کبھی کبھی نقصان پہونچا دیتی ہے، لیکن جن میں قدرۃً لینت شگفتگی و مروت ہوتی
ہے، ان پر اس کا نہایت مفید اثر پڑتا ہے۔ اسی مقولہ کی بہترین تصدیق مارکس آرلیس
کی زندگی و تصانیف سے ہوتی ہے، جو اپنی ذات سے رواقیت کا اعلیٰ ترین عملی نمونہ تھا
یہ شخص قدرۃً بہت سیدھا سادھا، بھولا، وفا سرشت، اور معصوم صفت تھا، جو گو زبردست
دماغ یا قوت ارادی کا بڑا حصہ دار نہ تھا، مگر غور و فکر، خلوت نشینی، و دوستداری کا متلاشی
تھا۔ اس دل و دماغ کے ساتھ اسے شاہانہ شان و تجمل سے طبعاً نفرت تھی، اور فلسفہ
کی جانب طبعی التفات تھا۔ اس نے زینو کے مذہب کو اختیار کیا، اور حق یہ ہے کہ عملی
زندگی میں اسے برت کر اسے حد کمال تک پہونچا دیا۔ انیس سال کی مدت فرمانروائی
بہت ہوتی ہے، اور پھر حکمرانی بھی ایسے ملک پر کرنا، جسکے اخلاق بھی بگڑ کر بگڑے ہوئے
اور جہاں شہوت پرستی کا بازار رات دن گرم رہتا تھا۔ ایسی حالت میں یہ اسی جوانمرد کا

کام تھا، کہ اس نے اپنے حسنِ عمل سے نہ صرف بڑے سے بڑے نکتہ چینیوں کی زبان بند کردی، بلکہ اس کی رعایا نے اسے انسانیت کے مرتبہ سے نکال کر الوہیت کے درجہ پر اسے ممتاز رکھا۔ ظاہری اخلاق بہتوں کے اچھے ہوئے ہیں لیکن اندرونی زندگی شاید دنیا کے چند ہی لوگوں کی اس سے زیادہ بے لوث و بے داغ گزری ہو۔ اس کی کتاب "خیالات" مذہبی لٹریچر کی بہترین کتب میں سے ہے۔ یہ خیالات اس کے متفرق افکار کا مجموعہ ہیں، جو بغیر کسی انشا پردازانہ ربط کو ملحوظ رکھے ہوئے یک جا کر دیے گئے ہیں، جو عموماً نہایت عجلت کے ساتھ فوجی دورہ کے زمانے میں قلمبند کیے گئے ہیں، اور جو صاف اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس کے اصلی خلوص کو کسی نقاب کی حاجت نہیں۔ اس زمانے کی تمام دنیائے متمدن اسی کے زیر نگین تھی۔ اتنی بڑی مملکت کا فرمان روا اور غیر مسئول ہو کر یہ اسی کی ہمت تھی کہ اس نے تھریسیا و ہلویڈیس، کیٹو و بروٹس، جیسے تماثیل اخلاق کو اپنا مطمح نظر بنائے رکھا، کسی موقع پر سر رشتۂ اخلاق کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا، اور ہر موقع پر اپنے اور اپنی رعایا کے حقوق برابر سمجھے۔ اس کی ساری زندگی مسلسل مشاغل میں گزری۔ بارہ برس تک فوج کے ساتھ یہ مملکت کے دور دست صوبوں میں پڑا رہا۔ لیکن اخلاقیات کے جزئیات تک کو کبھی فوت نہ ہونے دیا۔ زاہد خلوت نشین شاید اس معیار پر پورا اتر سکے، لیکن جہانبانی کے ساتھ اس کا نباہ، مارکس آریلیس ہی کا کام تھا۔ دو مشہور خطیبوں کو مناظرہ سے اس بنا پر روک دیتا کہ کہیں اس سے ان کے باہمی لطف و دوستی میں نہ فرق آ جائے، ہنگری کے بڑاؤ میں ہر چھوٹے سے چھوٹے حقدار کو اس کا حق دیتا، یہاں تک کہ اپنے بچپن کے ایک گمنام و غیر معروف معلم تک کو نظر انداز نہ کرتا۔ اپنے کردار میں ترفع و تفوق، تکلف و تصنع، کی خفیف سے خفیف جھلک نہ رہنے دیتا اور گندہ خیالات کو اپنے ذہن و تصور تک میں نہ آنے دیتا، یہ واقعات بجائے خود بھی

خفیف نہین لیکن جب یہ خیال کیا جاتا ہی کہ ان کا صدور اُس ہستی سے ہوتا تھا جس کے زیر نگین کرۂ ارض کا تمام متمدن ٹکڑا تھا، اور جسے قدم قدم پر بیشمار مصالح کو ملحوظ رکھنا ہوتا تھا تو ان کی اہمیت فوق الحد ہو جاتی ہی پھر لاکھ وصفون کا ایک وصف یہ کتنا بڑا موجود تھا، کہ اس کی رفاہ جوئی مین جہالت و تحکم کا کہین شائبہ تک نہ تھا۔ دنیا مین بعض اور بھی ایسے خود مختار و ذی استبداد تاجدار گزرے ہین، جو اپنی رعایا کے ساتھ انتہائی نیکی کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کا طرز عمل ہمیشہ تعصب و تحکم عدم مسالمت کی تصویر رہا ہی ان کی نیت گو خالص رہی ہی لیکن جو وسایط و وسائل انھون نے استعمال کیے، اُن سے تاریخ کے صفحات خون سے رنگ گئے ہین۔ فلپ ثانی و ملکہ ایسابلا سے بڑھکر نیک نیت و خالص ہی خواہ خلق اور کون ہوا ہی لیکن کیا نیرو وڈومٹین سے اُن کی خون آشامیون کا نمبر کچھ بھی کم رہا ہی؟ لیکن تحمل مجسم مارکس ارلییس کا طرز عمل اس کلیہ مین مستثنیٰ ہوا ہی۔ خود کہتا ہی، کہ "اس کی ابھی نہ توقع رکھو، کہ فلاطون نے جمہوریت کامل کا جو خواب دیکھا ہی اس کی تعبیر پوری طرح پر نکل سکے گی۔ بس اسی کو غنیمت سمجھو، کہ تمھاری کوششون سے نوع انسان کی حالت کچھ بہتر ہو جائے۔ لوگون کے دل و دماغ پر قابو پانا تمھارے بس کی بات نہین، اور جب تک نہ ہولے تمھاری زبردستی و جبر کا نتیجہ سوا اس کے کیا ہو سکتا ہی، کہ منافقون اور بادل ناخواستہ کام کرنے والے غلامون کی ایک جماعت پیدا ہو جائے، اور بس" اس نے اپنی عہد حکومت مین متعدد قوانین اصلاحی نافذ کیے، سیافی کے تماشون کی تعداد بہت گھٹا دی، سینٹ کی جو جمہوریت کی آخری یادگار رہ گئی تھی، ہمیشہ قدر و تعظیم کی، اشاعت علم و اخلاق کی غرض سے متعدد درسگاہون مین فلسفہ کے پروفیسر مقرر کیے، اور بجائے اس کے کہ تعزیری قوانین کو کام مین لاتا، ہمیشہ اپنے اور اپنے دربار کے طرز عمل سے لوگون مین آہستہ آہستہ یہ اثر پھیلاتا رہا، کہ اسراف مذموم

اور سادگی اعتدال و اقتصاد، قابل اختیار ہے۔ اپنی رعایا کی بدچلنی کا اُسے مدة العمر ایک بڑا ایذا احساس رہا، لیکن حلم و تحمل کو اُس نے کسی موقع پر نہ چھوڑا، بلکہ ر واقیت کے اس اصول سے فائدہ اٹھا کر وہ یونانیون کی طرح ہمیشہ اپنی طبیعت کو سمجھاتا رہا کہ ارتکاب معاصی کا اصل باعث ناواقفیت ہوتا ہے، اور یہ لوگ جو بدچلنیون مین مبتلا ہین بیچارے ان کے نتائج سے بے خبر و ناواقف ہین، پس بجاے اِن پر غضبناک ہونے یا ان سے نفرت کرنے کے ہمین ان کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہیے۔ اس بارے مین اس کے مقالات کے جستہ جستہ فقرے یہ ہین:۔

"انسان کا مقصود آفرینش یہ ہے کہ اپنے ابناے جنس کے ساتھ ہمدردی کرے، اور ان کی اصلاح کرتا رہے"۔

"اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے، تو اپنی فطرت اصلی کے خلاف اور اپنی ناواقفیت کے سبب سے کرتا ہے"۔

"ہو سکے، تو اپنے بھائیون کی اصلاح کرو، اور اگر ممکن نہ ہو، تو یاد رکھو کہ تم مین حلم کا مادہ اسی واسطے ودیعت کیا گیا ہے، کہ دوسرون کے معائب پر صبر و تحمل سے کام لو"۔

"کوئی طبیب اگر کسی مریض کی حالت پر اظہار غضب و حیرت کرتا ہے تو یہ خود اس کے لیے شرم کی بات ہے"۔

"خداے حی و قیوم کو دیکھو، کہ وہ روز ازل سے بدچلنیون اور بدافعالیون کے مناظر کو کس سکون و تحمل سے دیکھ رہا ہے، تو اے بنی آدم، جس کی مدت عمر صرف گنتی کے چند سال ہے، کیا تجھ مین اتنا بھی صبر نہین، کہ تو اتنے دن بھی اِن پر تحمل کر سکے"۔

"کوئی شخص اپنے قصد و ارادہ سے جادۂ اخلاق سے نہین ہٹتا،

اس نکتہ کو ہمیشہ یاد رکھو، اور اس سے تم مین خود بخود تحمل و مسالمت قائم رہے گی۔"

"انسان پر واجب ہی کہ جو لوگ اس کے ساتھ بُرائی کرتے ہین، وہ اُن کے ساتھ محبت کرتا رہے۔ کیونکہ تمام انسان ایک دوسرے کے عزیز ہین، اور ارتکاب معاصی کی محرک صرف ناواقفیت و لاعلمی ہوتی ہی، اور پھر غیظ و غضب اس قدر مختصر و چند روزہ زندگی مین!"

لیکن اس سے ناظرین کو یہ نہ قیاس کرنا چاہیے، کہ مارکس آرلیس کا اخلاق رومی اخلاق نہ تھا۔ بے شبہ اس کی سیرت یونان کی لینت و خوش خلقی سے بہت کچھ متاثر ہوئی تھی تاہم اس کی بنیاد رومی ہی سیرت پر تھی۔ اس کی تصانیف مین، رب علا کی تحمید و تمجید تو بہت کچھ ہی تاہم اس مین اُس گہرے مذہبی تذلل کا کہین پتہ نہین، جو عبرانی اخلاق کا جوہر مخصوص تھا، اور جس کی بنا پر یہودی مصنفین اس قدر تسخیر قلوب کی قوت رکھتے ہین۔ نیکی کا حسن طبعی، اس کی دلفریبی و دلکشی، جس پر یونانی اس قدر زور دیتے تھے، اور جسے بعد کو پلوٹینس نے روم مین بھی پھیلا دیا تھا، اس کا مارکس آرلیس کے یہان کہین وجود نہین بلکہ نیکی اُس کے نزدیک فرض شناسی کے مرادف ہی، اور نیک کرداری کا محرک اُس کے یہان یہ احساس ہی کہ ہمین اس فرض حیات کو پورا کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ اور کسی محرک کا قائل نہین، یا اگر ہی بھی تو برائے نام۔ وجود باری پر اُس کا نہایت مستحکم عقیدہ تھا، لیکن پابندی اخلاق مین اُس نے کبھی اس کی آڑ نہین پکڑی، بلکہ اس کو اُس سے برتر ہی سمجھتا رہا۔ حیات اُخروی کے بارہ مین بھی وہ متردد ہی رہا۔ اور شہرت بعد مرگ کے خیال کو تو اُس نے ہمیشہ دبائے رکھا۔ اس کے ہم مشرب مصنفین عمومًا موت کو خاتم الاحزان سے تعبیر کرتے تھے،

لیکن وہ ہمیشہ اس کی جانب اس حیثیت سے اشارہ کرتا رہا کہ اس سے دنیوی لذات و مسرات کی بے ثباتی کا سبق ہاتھ آئے، غرض یہ کہ اُس کے تخیل اخلاق مین کسی صلہ، توقع، لذت یا مسرت کی خفیف سی خفیف بھی آمیزش نہ تھی، اور وہ علانیہ کہا کرتا تھا، کہ "دنیا مین حقیقی شے صرف یہ ہے کہ انسان غایت صداقت، عدل و دیانت داری کے ساتھ عمر بسر کرے، اور بددیانتی و بد اخلاقی پر حلم و تحمل سے کام لیتا رہے"

اپنے جذبات و اندرونی قوی پر مارکس آریلیس کو جس قدر قوت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس کے بشرہ سے کبھی یاس و امید کے کوئی آثار نہین ظاہر ہونے پائے، لیکن ہمارے سامنے کہ اس کی باطنی زندگی کے اوراق کھلے ہوے ہین، ہمین اُس کے اس ضبط پر مطلق حیرت نہ کرنا چاہیے، ہمین یہ معلوم ہے کہ اُس پر ہمیشہ ایک طرح کی اُداسی چھائی رہتی تھی، اور آخر عمر مین تو اُسے طرح طرح کے صدمات اُٹھانے پڑے تھے۔ اُس کی عزیزہ و محبوب بیوی نے اُس کے سامنے جان دی، اُس کے لڑکے نے ابتدا ہی سے وہ بد اطواریان ظاہر کرنا شروع کر دی تھین، جنھون نے آگے چل کر اُس کا شمار، دنیا کے بدترین تاجدارون کی فہرست مین کرا دیا۔ وہ حکما و فلاسفہ جنھون نے بچپن سے اس کی رفاقت و اتالیقی کی تھی، ایک ایک کر کے اُس کی نظرون کے سامنے اُٹھ گئے، اور کوئی اُن کا جانشین نہین پیدا ہوا۔ ایشیائی وہم پرستیون کے مقابلہ مین رواقیت نے اس کے سامنے ہی شکست کھانا شروع کر دی تھی۔ ایک شدید وبا نے، جس کے جلو مین اور بھی متعدد آفات تھے، اُس کے زمانے مین پھیل کر سارے ملک کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ لوگون کے اخلاق اس درجہ بگڑ گئے تھے کہ کوئی سعی اصلاح کامیاب نہین ہو سکتی تھی۔ سلطنت کا روز افزون ضعف وہ

اپنی آنکھون سے تماشا کر رہا تھا، اور اسے صاف نظر آرہا تھا، کہ عنقریب سرحدی وحشیون کو اس پر غلبہ حاصل ہو جانے والا ہے۔ ان وحشتناک حالات و مصائب کے درمیان وہ خود ایک مہلک مرض مین علیل ہوا، جس کی تکالیف شدید کو اُس نے اپنے معمولی جرأت و استقلال کے ساتھ برداشت کیا، اور نزع کے وقت اپنے لڑکے، ملازمین، وغیرہ کو اپنے پاس سے ہٹا کر اپنی حسب خواہش تنِ تنہا جان دی۔

یہ تھی مختصر سرگذشت اُس ہستی کی، جو رواقیت کے دورِ آخر کی بہترین تصویر تھی، اور جس سے بڑھکر پاکیزگی اخلاق کا کوئی نمونہ عصرِ بت پرستی مین نہین ملتا۔ اس کی ذات جس طرح رواقیت کے جملہ فضائل و محاسن کی جامع تھی، اُسی طرح اُس کے معایب، مثلاً تعبس، خشک مزاجی، یا ضعیف الاعتقادی سے خالی تھی۔ فرض شناسی، اور محض فرض شناسی، اس کے لیے دلیل راہ تھی۔ اب انسان کی حیات جذبی کے جن فضائل کو رواقیت نے مدتون دبائے رکھا تھا، وہ ازسرِ نو پیدا ہو گئے تھے، اور اخلاق مین لینت، نرمی اور تری کو جگہ ملنے لگی تھی۔

لیکن جبکہ رواقیت کے فلسفہ پر نئے نئے عوامل و موثرات کام کر رہے تھے، عملی زندگی مین رومیون کے اخلاق اُس قدر بگڑ چکے تھے، کہ کوئی فلسفۂ اخلاق ان کی اصلاح نہین کر سکتا تھا۔ اس اخلاقی انحطاط کی، جس کی نظیرین تاریخ مین بہت کم ملین گی، اہمیت کو اکثر اہل قلم نے لکھا ہے، اور مبالغہ کے ساتھ لکھا ہے، لیکن اس کے اسباب سے ابتک کسی نے تعرض نہین کیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے لیے زبردست اسباب ضرور موجود ہون گے، کیونکہ یہ تو کسی کے سمجھ مین آنی والی بات نہین، کہ ایک قوم جو جمہوریت کے زمانے مین اعلیٰ اخلاق رکھتی تھی،

خود بخود وبلا سبب، شہنشاہی کے زمانے میں ...... پستی و انحطاط کے غار میں گر پڑے۔ فصل آیندہ انھیں اسباب سے بحث کریگی۔

فصل (۵)

اخلاقی انحطاط کے اسباب

یہ ہم پیشتر کہہ آئے ہیں، کہ رومیون کا اصل جوہر عسکریت و وطنیت تھا، جسے خود قومی حالات و ملکی خصوصیات نے پیدا کیا تھا، اور جس کی تشکیل میں ایک حد تک مذہب بھی معین تھا۔ خانگی، جنگی، و محتسبانہ ڈسپلن (تمرین) نے عام فلاس اور کاشتکارانہ مشاغل سے متحد ہوکر لوگون کو بالکل سادہ و غیر تکلفانہ زندگی کا خوگر کر دیا تھا۔ اُدھر سیاسی آزادی نے عزت و نام حاصل کرنے کا دائرہ بھی بہت وسیع کر رکھا تھا۔ امرا تک، کہ وہ ملک کے اعلیٰ ترین طبقے سے عبارت تھے، کشمکش حیات سے مجبور ہوکر پبلک کامون میں مشغول رہا کرتے تھے۔ گرد و نواح کی اطالوی سلطنتون (اور آخر زمانے میں قرطاجنہ) سے مدت سے رقابت چلی آتی تھی، اس نے اور بھی رومیون کو ہر وقت مستعد و خبردار رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر مدارس میں تعلیم جو دیجاتی تھی، وہ بھی اس انداز سے ہوتی تھی، کہ اس سے وطنیت کا جوش قائم رہے، اور اسلاف کے کارنامون سے اخلاف کے خون میں حرارت باقی رہے۔ سب سے آخر میں مذہب کا جو اثر پڑا وہ یہ تھا، کہ اس نے حلف کا احترام قائم کیا، مفید عوائد خانگی کی بنا ڈالی، دلون میں ایک رب اعظم کا اعتقاد راسخ کیا، غرض یہ کہ ہر طرح پر قومی سیرت کو درست و مستحکم ہی کیا۔

ان سب موثرات کی مجموعی طاقت سے روم کی قومی سیرت کی تشکیل ہوئی،

لیکن ان تمام عوامل کا اثر، ترقی تمدن کے ساتھ خود ڈھیلا پڑنے لگا۔ مذہب کی قوت کو تشکیک و ارتیاب کی اشاعت، اور غیر ملکی ضعیف الاعتقادیون کے ہجوم نے ضعیف کردیا۔ رہی معاشرت کی سادگی، جسے قوانین مروجہ و محکمۂ احتساب کے وجود کا بڑا سہارا تھا، تو اُسے ملک بابل کے تعیش و اسراف نے بیدخل کردیا۔ امراء کا طبقہ بھی رفتہ رفتہ ٹوٹ گیا، اور وطنیت کا جوش و غلو، ایک لق و دق سلطنت کے ہجوم السنہ ہجوم ملل و ادیان، اور ہجوم رسوم کے تصادم باہمی سے فنا ہوگیا۔

یہان تک تو کوئی نئی اور غیر معمولی بات نہ تھی۔ قومون کے خصائص بدلتے ہی رہتے ہین۔ لیکن عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی قوم سے ایک خاص صنف کے فضائل اخلاق رخصت ہوجاتے ہین، تو ان کی جگہ کسی دوسری صنف کے فضائل لے لیتے ہین۔ مثلاً جب تمدن کو وسعت ہونے لگتی ہے، تو افراد مین میل جول المنساری وحسن معاشرت کے اوصاف نمایان ہوجاتے ہین، علمی چرچون اور تجارتی کاروبار کے موزون و متناسب جذبات اخلاقی کو ترقی ہوجاتی ہے، سیاسی مشاغل کا حلقہ وسیع ہوجاتا ہے، اور مساوات حقوق کے پیدا کردہ جذبات زیادہ قوت حاصل کرلیتے ہین۔ مگر روم اس عام کلیہ سے مستثنےٰ تھا۔ اس مین یہ نہین ہوا، کہ اخلاق کی ایک صنف کی جگہ دوسری صنف لیلے، بلکہ سرے سے اخلاقی انحطاط شروع ہوگیا۔ اور اس کے تین خاص سبب ہوئے، اولاً شہنشاہیت کا وجود، دوسرے رسم غلامی، اور تیسرے سپاہی کا دستور۔ ان عوامل ثلثہ مین سے ہر ایک نے لوگون کے اخلاق پر نہایت گہرا، اور حد درجہ مخرب، اثر ڈالا، اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرنے کے لیے تو ایک علیحدہ مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی، البتہ اسکا ایک اجمالی خاکہ صفحات ذیل مین کھینچا جاسکتا ہے۔

(۱) پہلا مسئلہ، شہنشاہی کا اثر اخلاق پر۔ رومن شہنشاہی نے جمہوریت کے

نظام کو باضابطہ طور پر تمام تر برطرف نہین کر دیا تھا، بلکہ قالب وہی رکھ کر اُس کی روح نکال لی تھی۔ طرز حکومت اب خود مختارانہ تھا، لیکن وہی نیابت کے اصول کو آڑ بنائے ہوئے۔ عہدہ اب بھی تقریباً تمام وہی تھے، جو جمہوریت کے زمانے مین تھے، لیکن صرف ایک جسد بے جان کی حیثیت رکھتے تھے۔ سینٹ اب بھی اصولاً سب سے اعلیٰ حکمران جماعت کا نام تھا، لیکن اب اس کی موت و زندگی کا فیصلہ شہنشاہ کے ایک جنبش ابرو پر تھا، اور شہنشاہ بھی کیسا، بالکل غیر مسئول۔ مخبر و جاسوس جن کا فرض جمہوریت کے آخر زمانے مین یہ تھا کہ سلطنت کے خلاف سازش کرنے والون کی مخبری کرین۔ اب اغسطس کے زمانے سے اُن کا کام یہ گیا تھا، کہ شہنشاہ کی ذات کے خلاف سازش کرنے والون کی مخبری کرین۔ سلاطین اور خصوصاً ٹائبریس نے جو انھین مُنھ لگایا، تو ان کی تعداد مین روز افزون اضافہ ہونے لگا، یہان تک کہ رفتہ رفتہ ہر معزز و خوشحال شخص اپنی عزت و آبرو کے ڈر سے ان کا دبا ؤ ماننے لگا۔ امرا کا زور آہستہ آہستہ ٹوٹ گیا۔ اور غربا کو خوش کرنے کا طریقہ اب یہ نہین رہا، کہ انھین سیاسی حقوق عطا کیے جائین، یا اُن کی مستقل مرفہ الحالی کا کوئی انتظام کیا جائے، بلکہ یہ رہ گیا کہ انھین غلہ تقسیم کر دیا جائے، یا یہ کہ اُن کی تفریح طبع و ضیافت ذوق کے لیے کھیل تماشون کا انتظام کر دیا جائے۔ سلاطین نے زمانے کا رنگ دیکھ کر اپنا اثر جمانے اور بڑھانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی، کہ اپنے معبودانہ اوصاف کا اشتہار و اعلان کرنا شروع کر دیا۔

یہ آخر الذکر عقیدہ، اہل سیاست ہی کے دماغ کا پیداوار نہ تھا، بلکہ لوگون کا ذہن از خود اس کے ماننے کے لیے مستعد تھا، اور یہ استعداد مدت سے چلی آتی تھی۔ روم قدیم مین متعدد اشخاص، صفات الٰہانہ سے متصف سمجھے جاتے تھے، اور بانیان شہر کی پرستش تو اہل شہر علی العموم کیا کرتے تھے۔ اس لیے اکثر حکمرانون مین شان کبریائی کا

وجود لوگ از خود ماننے لگتے تھے۔ اس سے یہ تو ہوتا نہ تھا، کہ تعلیم یافتہ نفوس حکمرانون پر نکتہ چینی بند کردین، یا یہ کہ اُن کی جان کے خلاف سازشین نہ ہوتی ہون۔ البتہ یہ ضرور ہوتا تھا، کہ عوام مین حکمرانون کو نائب خدا، خلیفۃ اللہ، و ظل سبحانی ماننے کا عقیدہ از خود شائع ہو جاتا تھا، اور اس کے متعلق طرح طرح کے معجزات و خوارق عادت مشہور ہو جایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک اغسطس کو لیجیے، اس کی بابت کتنی داستانین مشہور تھین کوئی یہ کہتا کہ ایک مدت ہوئی کسی کاہن نے یہ حکم لگا دیا تھا کہ اس کے وطن سے ایک شہنشاہ عالم پیدا ہوگا۔ اور کوئی یہ بیان کرتا، کہ اس کی شیر خوارگی کے زمانے مین کوئی غیبی ہاتھ اسے گہوارہ سے اُٹھا لے گیا، اور ایک بلند مینارہ پر لے جاکر رکھ دیا، جہان لوگون نے اسے اس حالت مین پایا۔ اس کا چہرہ طلوع ہونے والے آفتاب کی طرف ہے۔ بعض حضرات یہ ارشاد فرماتے، کہ ایک مرتبہ اُس کے دادا کے مکان کے گرد مینڈک شور مچا رہے تھے، اُس نے اُنھین ڈانٹ بتائی، اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے اور بعض خوش عقیدہ اصحاب اس کے ناقل تھے کہ ایک بار ایک عقاب روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھین لے گیا، ہوا مین بلند ہوا، اور پھر اُتر کر اُس کے ہاتھ مین وہ رکھ گیا۔ ایک روایت یہ مشہور تھی، کہ اس کی وفات کے بعد جب اس کی نعش جلائی جانے لگی، تو اس کی روح آگ کے شعلون سے آسمان کی طرف بلند ہوتی نمودار ہوئی۔ ایک اور نقل یہ بھی مشہور تھی، کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے اُس بستر پر سونا چاہا، جس پر اغسطس پیدا ہوتا، مگر معاً اُس بے ادب کو یہ سزا ملی کہ ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا، اور اُس نے اُسے ڈھکیل دیا۔ خیر، یہ روایات تو مشہور تھین ہی، سب سے بڑھ کر اس طرح کے واقعات ہونے لگے کہ ایک مرتبہ ایک شخص کو جب زناکاری کے جرم مین سزا ہونے لگی، تو اس نے اپنی بریت مین یہ عذر پیش کیا کہ "مین اُس زمین کا زمیندار ہون، جس پر اغسطس کی

ولادت ہوئی تھی، یا ایشیا کے ایک شہر کے باشندون سے ٹائبریس نے سیاسی آزادی محض اس جرم مین سلب کرلی، کہ انھون نے آغسطس کی پرستش مین پہلوتہی کی تھی۔ غرض یہ کہ کچھ تو سیاسی مصلحت اندیشیون اور کچھ عوام کی خوش اعتقادیون نے مل ملاکر بادشاہ پرستی کا ایک عام دستور قائم کردیا، اور ہر صاحب تاج واورنگ کی ذات معجزات وخوارق کی مرکز سمجھی جانے لگی۔

اکثر سلاطین خود، اس بادشاہ پرستی کو ایک ڈھکوسلا اور سوانگ سمجھتے تھے، بلکہ بعض تو بہ این اظہار معبودیت اپنی زندگی کی سادگی مین عدیم المثال ہوئے ہین چنانچہ شاہ وسپیسین نے حالت سکرات مین، موت کی ناتوانائی کو محسوس کرکے کہا کہ "مین سمجھتا ہون، مین اب خدائی کے مرتبہ پر فائز ہورہا ہون" الکزنڈر سیورس جولین نے اس طرز مخاطبت کو، جس مین انھین خدائی القاب سے یاد کیا جاتا تھا، بالکل بند کردیا تھا، اور جن سلاطین نے اسے بند نہین کیا تھا، وہ بھی اپنے دل مین اس کی بےحقیقتی کو خوب سمجھے ہوئے تھے۔ اور تو اور، خود نیرو تک نے کبھی اپنی معبودیت کے کسی ٹکڑے کو سوانگ سے زیادہ وقعت نہین دی، بلکہ اگر اُسے کسی شی کا نشہ یا غرور تھا، تو اپنے اچھے گوّیے یا اعلیٰ ایکٹر ہونے کا، نہ اس کا کہ وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ مگر اس بڑی جماعت کے پہلو بہ پہلو چند افراد ایسے بھی ہوئے ہین، جو اپنے مین واقعی معبودانہ صفات سمجھتے تھے۔ مثلاً کیلاگلا کہ وہ فاتر العقل بھی تھا، ہمیشہ یہ خیال کرتا رہا، کہ وہ واقعی خدا ہے اور اس دُھن مین اکثر مجسمون سے جوپیٹر (مشتری) کی تصویر نکال کرکے اپنی تصویر لگادی۔ ایک مرتبہ کیا ہوا، کہ زور وشور کا طوفان آیا جس سے ایک سیاحی کے تماشے مین خلل پڑگیا۔ اس پر حضرت بہت جھنجھلائے، اور جھنجھلائے کیا، یہ کہنا چاہیے کہ جوپیٹر پر برس پڑے۔ فرط غیظ مین بار بار یہ ارشاد ہوتا تھا کہ "ایک ملک مین دو بادشاہون کا گزر نہین ہوسکتا، اب یا تو مین دنیا کا حاکم نہین اور یا جوپیٹر نہین"۔ دوسرے نمبر پر اس

دماغ کے شخص ہلیوگیبلیس ہوے ہین۔آپ بھی مدۃ العمر اس خبط مین گرفتار رہے، کہ آپ واقعی خدا ہین، اور مذہب کو اپنی پرستش کا مرادف سمجھتے رہے۔

عملی زندگی مین اس بادشاہ پرستی کا یہ نتیجہ ہوا، کہ سلاطین کی تصاویر اور بُت مثل دیوتاؤن کے، پوجے جانے لگے۔اب وہ ایک ایسی مقدس و مطہر شے بن گئے تھے کہ ان کے ساتھ خفیف سی بے ادبی کا ارتکاب شدید تعزیر کا مستوجب بنا دیتا تھا، اور ان کی آڑ مین پناہ لینا بڑے سے بڑے مجرم کو امان دیتا تھا۔ٹائبیریس کے زمانے مین یہ ایک عام دستور ہو گیا تھا کہ غلام و ملزمین اپنے ہاتھ مین بادشاہ کی تصویر لے لیتے تھے اور اس پر مطمئن و بےخوف ہو کر جو کچھ مُنھ مین آتا، حکام عدالت یا اپنے آقاؤن کو سُنا دیتے اسی کے عہد مین ایک مرتبہ کسی شخص نے بادشاہ کی تصویر والی انگوٹھی پہنے ہوئے کسی غلیظ برتن کو چھو لیا، اور اس جرم مین اُسے فوراً سزا ملی۔ایک اور شخص پر اسی زمانے مین اس بات پر مقدمہ چلایا گیا، کہ اُسنے اپنے باغ کے ساتھ بادشاہ کا وہ بُت بھی فروخت کر ڈالا، جو اس مین نصب تھا۔آخری زمانے مین ایک عورت کو اس جرم پر سزاے موت دیدی گئی، کہ وہ شاہ ڈومیٹین کے بُت کے سامنے برہنہ ہو گئی تھی۔اور اغسطس کے بُت کے سامنے غلام کو زدوکوب کرنا، یا برہنہ ہو جانا، انسان کو قانوناً سزاے موت کا مستوجب کر دیتا تھا۔

ظاہر ہے، کہ ایسے افراد، جن کی طاقت غیر محدود ہو، جو اپنے تئین مرتبۂ اُلوہیت پر فائز سمجھتے ہون، جن پر کسی قسم کی اخلاقی ذمہ داری نہ عاید ہو، اور جو ایسی سوسایٹی کے درمیان ہون، جہان سیہ کاری و بدچلنی پر فخر کیا جاتا ہو، وہ اخلاق کے حدود سے جس قدر بھی متجاوز ہو جائین، کم ہے۔چنانچہ یہی ہوا۔خصوصاً شہنشاہی کے دور اول مین، جب اس نشہ کا خمار تیز تھا، تب تو تاجدارون کے سر پھر گئے تھے، اور یہ معلوم ہی نہین ہوتا کہ یہ اپنے آپ مین ہین۔سیوٹونیس کے اوراق کو ملاحظہ کیجیے،

شہوت پرستی ہیبت، ظلم و شقاوت، ناخدا ترسی، غرض ذمائم اخلاق کے جتنے عنوانات ہو سکتے ہین، سب کے نشو و نما، بلکہ نشو و نمائے کامل کا نظارہ کر لیجیے جس سے اس حقیقت پر پوری روشنی پڑے گی، کہ شہنشاہیت کے اثر سے رومن اخلاق، کس قدر پست سطح پر پہونچ گیا تھا۔ یہ سچ ہو کہ اچھے بُرے سب کہین ہوتے ہین، اس ہجوم شیاطین مین بھی بعض فرشتون کی صورتین کبھی کبھی نظر آجاتی ہین، لیکن یہ ایک واقعہ ہو کہ شیطنت نے پر ملکوتیت نے کبھی مستقل غلبہ نہ حاصل کیا۔ دربار شاہی کی بدچلنی، مخبری و جاسوسی کی گرم بازاری، عیش پرستی کا اعلان، غربا کو غلہ تقسیم کر کرکے رام کر لینے کی ترکیب کھیل تماشون کی بیحد کثرت، یہ سب چیزین تو بداخلاقی کی اشاعت مین معین تھین ہی، مگر سب سے بڑھ کر شہنشاہی کا وجود بذات خود اس کا اصلی باعث تھا۔ شہنشاہی نے حریت کا خاتمہ کر دیا تھا، اور حریت سے معریٰ ہو کر کون قوم، احرار کے درجۂ اخلاق کو قائم رکھ سکی ہو؟ سیاسی آزادی، مذہب کی کیسی ہی دشمن ہو، لیکن اخلاق کی ہمیشہ رفیق رہی ہو، کیونکہ لوگون کو بدچلنی کے مشاغل سے باز رکھنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہین، کہ ان کی توجہ کو سیاسی اعزاز و ناموری کی جانب مائل کر دیا جائے۔ شہنشاہی کے زمانے مین اِن سیاسی مصروفیتون کا کہین پتہ نہ تھا، اور اس لیے افراد کو لامحالہ سیہ کاری کے اُسی سانچہ مین ڈھل جانا پڑتا تھا، جو زمانہ والے وقت کا ہوتا تھا۔

(۲) دوسرا مسئلہ۔ غلامی کا اثر اخلاق پر۔ غلامی کے مُضر اثرات اس سے بھی زیادہ وسیع ہوے۔ قطع نظر اس کے کہ غلامی آقاؤن کے مزاج کو درشتی، سخت گیری، و سیدردی کا خوگر کر دیتی ہو، اس نے مشقت و مزدوری کو لوگون کی نظر مین ایک ذلیل پیشہ کر دیا، اور غریب شرفا (یعنی اُن لوگون کا جو کسی کی غلامی مین نہ تھے) کا شمار بجائے ذی عزت طبقہ کے ذلیل لوگون مین ہونے لگا۔ آج کل طبقۂ اوسط (مڈل کلاس) کا وجود، جو کاروباری زندگی کے سنجیدہ مشاغل مین مصروف رہتا ہو، قومی اخلاق کا

بہت بڑا محافظ ہے، اس معنی مین کہ وہ طبقۂ امرا کی بداخلاقی کو زیادہ اور اس لیے سوسائٹی کے حق مین مہلک نہین ہونے دیتا چنانچہ جب کبھی کسی خاص بداخلاقی کی ہوا چل جاتی ہے، تو یہی طبقہ آڑے آتا ہے، اور اس کو محض سطح تک محدود رکھتا ہے ایسی حالت مین طبقۂ امراء، خواہ کتنی ہی داد عیش دے، لیکن ان کی نظیر کا اثر عالمگیر نہین ہوتا، اور غربا بدستور اپنے اپنے پیشہ مین مشغول رہتے ہین، بلکہ یہ کہنا چاہیے، کہ یہ مشغولیت انھین سر اُٹھانے ہی کی مہلت نہین دیتی۔ لیکن رومہ کی یہ حالت نہ تھی وہان جب بداخلاقی کی ہوا چلی، تو ہیئت اجتماعیہ ایک ایک رگ و ریشہ مین سرایت کر گئی، اور جماعت کا کوئی گوشہ باقی نہین رہا، جو اس سے غیر متاثر ہو۔ آلات و مشینون کا وجود نہ تھا، اس لیے صنعت و حرفت ناپید تھی۔ اور تجارت تو گویا شرفا کے لیے حرام مطلق تھی۔ پھر آخر لوگ جاتے تو کدھر جاتے۔ صرف دو ہی راستے کھلے تھے۔ یا تو غلامی کرین، اور یا کسی ایسے پیشے کو اختیار کرین، جس مین اخلاق کا خون کرنا ہوتا ہو مثلاً ایکٹری، نقالی، سپاہی، دلالی، مخبری و جاسوسی، نائکہ پن و غیر ذٰلک۔ چنانچہ ہر بڑے آدمی کے ساتھ مصاحبون کا ایک انبوہ رہا کرتا تھا، جن کا کام صرف یہ تھا کہ رئیس کی جھوٹی خوشامد مین وقت صرف کیا کرین، یا اُس کے جذبات پروری مین دلالی کا کام کیا کرین۔ پھر حکومت کی طرف سے باضابطہ طور پر اور نہایت اہتمام کے ساتھ غربا مین غلہ و زر کی جو تقسیم ہوتی تھی، اُس نے انھین فکر معاش کی طرف سے مطمئن اور کاہلی کا خوگر کر دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ کاہلی، اپاہج پن و مفت خوری کے نتائج سوا اس کے کیا ہو سکتے تھے، کہ طبیعت ہر وقت بدچلنی پر آمادہ رہے۔ سب سے آخر مین گورنمنٹ کی طرف سے مختلف ملاعب کا جو، بلا اخذ قیمت، انتظام تھا، اُس نے عام پبلک کی بیفکری و لعب پسندی کو اور ترقی دیدی تھی۔

ان حالات کے ساتھ آبادی گھٹنا شروع ہو گئی۔ متعدد اسباب کے اجتماع نے

لوگون مین تجرد کا ایک عام رواج پیدا کردیا۔ جس شخص کو دیکھیے، مناکحت کی قید سے گریزان نظر آتا تھا، یہ تحریک پیدا تو اغسطس ہی کے زمانے سے ہو گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اب وہ شہوت پرستی کے انتہائی مدارج تک پہونچ گئی۔ یونان سے تو حکومت کے ساتھ نیک چلنی رخصت ہی ہو چکی تھی، اور مصر و ایشیاے کوچک کے شہر بدچلنی کے مرکز عرصہ سے ہو رہے تھے، اب جبکہ ان تمام جگہون سے رومی فاتح لوگون کو اسیر کرکر کے اپنے یہان لانے لگے، تو کچھ روز مین خود رومہ کی حالت ایک عصمت فروشی کے بازار یا چکلے کی ہو گئی۔ یونانی غلام حسن و جمال مین لاجواب ہوتے تھے، اور اسکندریہ کے غلامون کا خاص کمال یہ تھا، کہ انھین دیکھ کر شیخ فانی کے دل مین بھی شہوت رانی کی اُمنگ پیدا ہو جاتی تھی، اب یہ لوگ روم مین گھر گھر کثرت سے پھیل گئے اور خود اہل روم کے بیچے اور نوجوان انھین کی صحبت مین رات دن رہنے لگے۔ مناکحت سے نفرت کی جو ہوا چل گئی تھی، اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہر کہ ایک بہت بڑی جماعت ایسے افراد کی پیدا ہو گئی، جن کا پیشہ ہی یہ تھا، کہ دولتمند کنوارون کے حاشیہ نشینون مین جا کر داخل ہو گئے، اور اپنی خوشامد و لستانی سے اُسے موم بنا کر اس کا ترکہ اپنے نام لکھوالیا۔ امرد غلام خود تو بدچلنی کی روٹی کھاتے ہی تھے، ستم یہ تھا کہ وباے ساریہ کی طرح اُن کا یہ مرض ہر طبقہ مین متعدی ہو گیا۔ اس پر شوق ملاعب و حمام، اطالوی آب و ہوا کی خوشگواری، اور سب سے بڑھ کر وہان کے مکانات کی طرز تعمیر نے یہ غضب ڈھایا، کہ لوگون کو گھر کے اندر رہنا وبال معلوم ہوتا تھا، اور اب عام حالت یہ تھی، کہ ایک تھوڑی سی وجہ کفاف پر لوگ قانع اور معاش کی طرف سے بفکر ہو کر سارا وقت کاہلی، کھیل تماشہ اور تماشبینی کی نذر کر دیتے تھے۔ مناکحت، ازدواج کا عام دستور تو یون گھٹ گیا تھا، جو کچھ رہے سہے افراد شادی کرتے بھی تھے، تو اس کا یہ حال تھا، کہ امرا اپنی بیویون سے اسقاط حمل کرا دیتے تھے، اور اگر یہ نہ کیا، تو اولاد کشی تو ہر طبقے مین کھلم کھلا رائج تھی۔

ایسی حالت مین سیلک اسپرٹ (قومی بیداری) کیونکر قائم رہ سکتی تھی، قومیت و وطنیت کا احساس رخصت ہوا، اور ایسا رخصت ہوا، کہ اپنے پیچھے اپنے آثار بھی نہ چھوڑ گیا۔ جمہوریت کے زمانے مین، ایک بار جب کچھ اطالوی باشندون کو رومی شہریت کے حقوق، عطا کیے جانے لگے، تو اس تجویز کو پیش کرتے وقت یہ الفاظ کہے گئے تھے، کہ "جو کوئی حریت پر جان دینے کو تیار ہے، وہ رومی کہلانے کا مستحق ہے" کہان وہ وقت تھا، اور کہان اب یہ زمانہ آیا، کہ دور شہنشاہی مین لوگ نہایت خوشی و کشادہ دلی سے اپنی حریت سے دست بردار ہونے کو آمادہ رہتے، بشرطیکہ اس کی قیمت، ملاعب و غلہ کے ذریعے سے ادا کی جائے، اور بڑے سے بڑا، مستبد فرمان روا یہ سودا کرکے باطمینان تمام اپنی ہواے استبداد کو پورا کرتا تھا۔ دور جمہوریت مین ایک مرتبہ ماریس نے چند مجرمون کے مکانات کے دروازون کو کھول کر یہ صلاے عام دیدی، کہ جو چاہے اُنھین لوٹ لے، لیکن رومی خون مین اس قدر غیرت و حرارت باقی تھی، کہ ایک متنفس نے بھی اس اذن عام سے فایدہ نہ اُٹھایا۔ اس کے مقابلہ مین عہد شہنشاہی مین جب وٹیلیس و دسپیسین کے لشکر صف آرا ہوئے تو اُنھین غیور اسلاف کے ہزارہا بے حمیت و آبرو باختہ اخلاف، اس ذوق و شوق و بیتابی سے، جس سے وہ سیاقی کے مناظر کا تماشہ کیا کرتے تھے، اس "ملعبہ" کو بھی دیکھنے نکل آئے، خالی مکانات کو لوٹنے لگے، پناہ گزینون کو قتل کرانے کے لیے گھسیٹ گھسیٹ کر باہر لانے لگے، اور اپنے بیشمار ابناے وطن کو خون مین رنگتے دیکھ کر اس طرح اظہار مسرت کرتے تھے، کہ گویا کوئی بڑا جشن ہو رہا ہے۔ اور یہ اخلاقی انحطاط ہنگامی و عارضی نہ تھا، بلکہ مستقل و پایدار ہو گیا تھا۔ رواقیت کی تعلیم انٹونائنس کی حکومت، اور مسیحیت کے عقاید، یہ تمام چیزین اسے مٹانے مین ناکام رہین۔ حریت سیاسی پر تو اہل روم مدت ہوئی فاتحہ پڑھ چکے تھے، اب جو آرزوے وحید ان کے دل مین

باقی رہ گئی تھی، وہ یہ تھی، کہ یہ ہوں اور تماشہ اور ملاعب قدم قدم پر غلہ کی تقسیم گاہین اور مختلف تماشون کے مفدڑے اور پنڈال بنے ہوئے تھے۔

اس موقع پر اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے، کہ اگر آج کل کسی ملک پر اس طرح کا اخلاقی انحطاط چھا جائے، تو اس سے یہ اندیشہ نہین ہو سکتا، کہ دنیا سے اخلاق رخصت ہو جائے گا۔ کیونکہ آج دنیا، متعدد اقطاع متمدن مین تقسیم ہو گئی ہی، اور اگر کوئی ایک خاص ملک اخلاقی پستی مین آجاتا ہی، تو یہ اطمینان رہتا ہی کہ دوسرے ممالک تو بدستور اخلاق کی بلند سطح پر قائم رہین گے، اور اس طرح روے زمین کے کسی نہ کسی حصہ پر ہر وقت تمدن و اخلاق کا چراغ روشن رہے گا۔ لیکن رومہ کی یہ حالت نہ تھی اُس وقت آج کل کی سی علیحدہ علیحدہ متعدد متمدن قومین نہ تھین۔ اُس وقت دنیا مین صرف ایک قوم، اخلاق و تمدن، شایستگی و تہذیب کی حامل تھی، یعنی خود رومی قوم۔ اس لیے اگر اُس مین یہ انحطاط اخلاقی آگیا تھا، تو اس کے معنے یہ ہین کہ ساری دنیا سے اخلاق و تمدن کا چراغ گُل ہو گیا تھا۔ رہے روم کے بیرونی صوبجات، سو اول تو اُن مین اتنی قوت کہان تھی، کہ اپنے مرکز کی اصلاح کر سکتے، دوسرے یہ کہ اُن کی اخلاقی حالت تو خود روم سے بھی ابتر و زبون تر تھی۔

تاریخ اخلاق کے اس ٹکڑے پر بحث کرتے ہوئے ہمین دو باتون کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ ایک کاشتکاری، اور دوسرے فوجی قواعد دانی کی اہمیت کا۔ ایک نہایت قدیم کہاوت، رومولس کے زمانے سے یہ چلی آتی تھی، کہ "شریف تو دو ہی پیشے اختیار کر سکتا ہی، یا سپہگری یا کاشتکاری" اور اس مین ذرا شک نہین کہ مشغلہ کشاورزی کا رومی سیرت کو اعتدال پر رکھنے مین ہمیشہ نہایت اہم اثر رہا کیا ہی۔ کیٹو کی آج دنیا مین ایک ہی تصنیف موجود ہی، اور اس کا موضوع یہی کاشتکاری ہی، ورجل نے اس عنوان پر نظمین کہی ہین۔ خود رومی مذہب مین کاشت و زراعت کے

مختلف مدارج وادوار کو احترام کی نظرون سے دیکھا گیا ہے۔ ورجل کہا کرتا تھا کہ
انسان نے شہر آباد کیے ہین، لیکن دیہات کی بستی خود خدا نے بسائی ہے۔ ویسپسین
کے اصلاحات جو اس قدر مشہور ہین، انھین اٹھا کر دیکھو، تو ان کا جزو غالب اسی پر مشتمل
ہوگا، کہ صوبجات کے مرزبانون کو ترقی دی جائے۔ انٹونینس، جو شاید بہترین رومی
تاجدار ہوئے ہین، مدة العمر مرزبانی سے نہایت دلچسپی لیتے رہے۔ لیکن شہنشاہی
کے زمانے مین یہ حالت تدریجاً تبدیل ہونے لگی۔ خیر بیرونی علاقون کا حال تو غنیمت
تھا۔ وہان کے صوبہ دارون کی غیظ سلطانی کے خوف سے کسی قانون شکنی کی
چندان ہمت ہی نہین پڑتی تھی، بلکہ سڑکون کے پختہ ہونے، راستون کے صاف
ہونے، اور کاروبار کے بے روک ٹوک جاری رہنے سے اُن مین فی الجملہ خوش انتظامی
اور رعایا کو مرفہ الحالی حاصل تھی۔ لیکن خود اٹلی کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ ہنر زراعت
و کشاورزی کا مشغلہ، جو عوام کے اخلاق کا قوام درست کیے ہوئے تھا، اب ناپید
ہو رہا تھا، اور کاشتکار برابر قرض سے زیر بار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ غلامون کی
کثرت کے باعث ساری زمینداری طبقۂ امرا کے ہاتھ مین چلی جا رہی تھی، اور کاشتکار
روز بروز تہی دست ہوتے جاتے تھے۔ اُن کے بسر اوقات کے لیے یہ کافی تھا،
کہ وہ دیہات چھوڑ کر شہر مین آبسین، اور یہان لنگر سے مفت کی روٹیان لیا کرین،
چنانچہ بہت بڑی جماعت اسی طریقے پر بلا تکلف عامل تھی۔ تقسیم کے لیے غلہ
زیادہ تر دور دراز ممالک مثلاً افریقہ و سسلی سے آتا تھا، اور خود اٹلی سے کاشتکاری کا
پیشہ گویا اُٹھ گیا تھا۔ جو کچھ زمین مزروعہ تھی، وہ اُمرا کے قبضے مین تھی، اور رفتہ رفتہ
"آزاد کاشتکار"، ایک ایسا لفظ رہ گیا تھا، جس کا کوئی مسمی اٹلی مین نہ تھا۔

یہ انقلاب حالت کچھ ایک دن مین یکایک تو پیدا نہین ہو گیا تھا۔ اس کی انتہا
گو دور شہنشاہی مین ہوئی، لیکن ابتدا جمہوریت ہی کے دور آخر مین ہو چکی تھی کہ کاشتکارون کی

قرصنداری، اور امرا کی زمینداری کے جو نتائج ہو سکتے تھے، ان کا ظہور اسی زمانے سے شروع ہو گیا، اور شہنشاہی کے اوائل ایام مین اکثرون کو اس کا احساس ہونے لگا۔ لیوی، ورو، کولومیلا، وپلینی اپنی تصانیف مین بار بار اس افسوسناک واقعہ کا ذکر کرتے ہین، اور ٹیسیٹس نہایت پُرحسرت لہجہ مین کہتا ہے کہ ہمارا وطن جو ایک زمانے مین غیرون کو غلہ پہونچایا کرتا تھا، اب اس قدر غیر مزروع ہو گیا ہے، کہ خود اپنے فرزندون کے سامان خورش کے لیے ہوا اور بادبانون کی موافقت کا دست نگر رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسے اتفاقات پیش آجایا کرتے تھے، کہ کسی ناگہانی سبب سے غلہ کی کشتیان وقت پر نہ پہونچ سکین، اور اس سے اہل رومہ کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صورت حال قدرۃً خود حکمران جماعت کے لیے سخت تشویش و بے اطمینانی کی باعث تھی، اور اس کی طرف سے بار بار اس کے دفعیہ کی کوششین ہوتی تھین، لیکن غلامی کا رواج اور لنگرون کا اجرا کسی تدبیر کو نہین چلنے دیتا تھا۔ اور اتنی قوت کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ مین بھی نہ تھی، کہ غلامی کے سے قدیم وسیع، و عام دستور کو مٹا سکتا، یا لنگرون کے رواج کو بند کر کے سارے ملک سے عداوت مول لیتا۔ الگزنڈر سیویرس نے بطور تقاوی، کاشتکارون کو روپیہ قرض دیا، کہ اس سے وہ زراعت کرین اور روپیہ آہستہ آہستہ ادا کرتے رہین۔ پرٹینکس نے غیر مزروعہ زمین پر بہت سے غربا کو اسی شرط پر بسایا کہ وہ اُسے مزروعہ کرین۔ ارکس ارلیس اور پھر اس کے بعد آرلین و ولینٹینی آن نے ہزارہا وحشی اسیران جنگ کو اٹلی مین آباد کیا، اور اُن سے بجبر زراعت کرائی۔ مگر ان مین سے کوئی تدبیر راس نہ آئی، بلکہ بعض تدبیرین بالکل اُلٹی پڑین۔ مثلاً یہ آخرالذکر تدبیر یعنی سرزمین اٹلی مین غیر ملکیون کی اتنی کثیر آبادی، آگے چل کر خود اٹلی کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ جو اسباب، اٹلی سے زراعت کو فنا کر رہے تھے، وہ ناقابل دفع ہو گئے تھے، اور

معاشرت کی وہ سادگی، جو زراعت پیشہ افراد کا خاصہ ہوتی ہے، اب خواب و خیال ہو گئی تھی۔

تقریباً اسی انداز پر فوجی زندگی کا انحطاط بھی ہوا۔ شروع مین یہ قاعدہ تھا، کہ رومی فوج کوئی مستقل فوج نہ تھی، بلکہ جنگ کے موقع پر سپاہی بھرتی کیے جاتے، جو اپنے ملک کے واسطے بلامعاوضہ لڑتے، اور یہ لوگ روم کے طبقۂ اعلیٰ کے خاندانون مین سے ہوتے۔ یہ جمہوریت کے زمانے کا دستور تھا، لیکن جمہوریت کے ختم ہوتے ہوتے یہ دستور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ محاصرہ وی آئی کے بعد سے سپاہیون کو باضابطہ تنخواہ ملنے لگی، اور جب روم و قرطاجنہ مین مخالفت شروع ہوئی، تو باشندگان اسپین بھی رومی سپاہ مین بھرتی کیے جانے لگے۔ ماریس نے یہ قید بھی اڑا دی، کہ رومی سپاہیون کے لیے عالی خاندان و صاحب جائداد ہونا ضروری ہے۔ ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ادھر فوج کو جو عرصہ تک اسپین و ایشیائی صوبون مین قیام کرنا پڑا، تو ایشیائی آرام طلبی و عیش پسندی سپاہیون مین سرایت کر گئی، اور یہی سپاہی اُسے اپنے ہمراہ رومہ مین لائے۔ پھر باہمی خانہ جنگیان جو شروع ہو گئیں، انھون نے دلون سے رہی سہی جنگی روایات کو اور فراموش کر دیا، گو اس کا اثر فوجی نقطۂ خیال سے اس لیے بہت زیادہ مضر نہیں پڑنے پایا، کہ جنرل ابتک قابل تھے۔ اغسطس نے اپنے زمانے مین ایک جدید اسلوب پر فوجی نظام قائم کیا، جس کا خلاصہ یہ نکلا، کہ ایک مستقل جماعت، دو پریٹوریین گارڈ، کے نام سے، خاص مراعات کے ساتھ رومہ مین رکھی گئی، اور باقی لشکر کا قیام سرحد پر رکھا گیا۔ اغسطس و ٹائبریس کے زمانے مین تو خیر، سکون رہا، لیکن جب شہنشاہ کیلوگلا کو سپاہیون نے قتل کر ڈالا، تو اس کے بعد سے بغاوت و سرکشی کی ایک عام ہوا چلنے لگی۔ کلاڈیس نے یہ غضب کیا، کہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے سپاہ کو رشوت دینا شروع کی۔ اس سے صوبون مین قیام رکھنے والی فوجون کی آنکھین کھلین،

اور انھین یہ خیال ہوا، کہ اپنی قوت سے وہ جس کو چاہین، تخت پر بٹھادین چنانچہ گالبا، اوتھو، وائی ٹلیس، وسپیسین، اسی فوجی انقلاب کے سہارے سے اورنگ نشین حکومت ہوئے۔ ابھی تک مرض بالکل لاعلاج نہین ہوا تھا، ویسپیسین وٹریجن نے اصلاح کی کوششین کین، اور فوجی پڑاون کا معاینہ کثرت سے کرنا شروع کیا۔ اس کا اچھا اثر پڑا، اور فوج کی تعداد چونکہ ابھی بہت قلیل تھی، اس لیے چند سے مفاسد کی روک تھام ہوگئی، لیکن چند ہی روز کے بعد ایشیائی آب وہوا مین طویل قیام پھر اپنا رنگ لایا۔ عیش پرستی و آرام طلبی نے سپاہیون کے دل مین گھر کرلیا، اور مدت تک وطن سے باہر رہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ قومیت ووطنیت کے احساس کو پس پشت ڈال کر سپاہی بجاے بادشاہ وقت کی اطاعت کے صرف اپنے جنرل کی اطاعت کو فرض سمجھنے لگے۔ اب انھون نے خود اپنے افسرون کو بغاوت پر آمادہ کرنا شروع کیا، چنانچہ کچھ عرصہ مین ایک عام فوجی طوائف الملوکی پیدا ہوگئی۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ خود شہنشاہی کی تقسیم ہوگئی، اور ہر فوج براہ راست اپنے شہنشاہ کے زیر نگران رہنے لگی، لیکن اس علاج سے عیش پرستی کا مطلق سدباب نہ ہوسکا۔ اسی اثنا مین مسیحیت نے پھیلنا شروع کیا، اور اس کا یہ اثر پڑا، کہ جہان ایک طرف سپاہیون سے فوجی جوش وخروش رخصت ہوگیا، وہان دوسری طرف ان کی سرکشی وتمرد بھی ہلکی پڑگئی۔ لیکن اور بھی متعدد موثرات قوی، فوجی انحطاط مین معین ہوئے، مثلاً شہنشاہی پالیسی کا ایک لازمی جزو، عام جمود وعدم حرکت تھا۔ سپاہی بیکار پڑے ہوئے تھے، اور سلاطین اپنی ہردلعزیزی کو قائم رکھنے کے لیے اس جمود کو قائم رکھنے پر مجبور تھے۔ بیکاری نے رفتہ رفتہ سپاہیون کو کاہلی وآرام طلبی کا خوگر، اور فوجی مشقت کشی کے بالکل ناقابل بنادیا۔ خود پرٹیورین گارڈ، جو ایک زمانہ مین صرف اطالویون کے لیے مخصوص تھا، اس مین بھی سپٹیمس سیویرس کے بعد سے سرحدی

فوجون کے سپاہی بھرتی ہونے لگے، اور اٹلی مین لازمی جنگی خدمات کے سد باب ہو جانے سے، ہزارہا غیر ملکی، رومی فوج مین بھرتی ہوئے۔ اس کا جو کچھ اثر ہوا، وہ ہمارے بیان کا محتاج نہین۔ ایسے زمانے مین جبکہ توپ خانے کا وجود نہ تھا، متمدن فوج کے لیے وحشیون پر غلبہ حاصل کرنے کی صرف یہی صورت تھی، کہ اس کے افراد زیادہ مستعد، زیادہ شجاع، وزیادہ آزمودہ کار ہون۔ لیکن یہ حالات جو ہم ابھی بیان کر چکے ہین، بھلا کب اطالویون مین مستعدی، جفاکشی، و دلاوری قایم رہنے دیتے۔ یہ تو سپاہیانہ خصوصیات کے عین منافی تھے۔ حالانکہ رومیون کے حریف اکثر خود مشہور رومی جنرلون سے تعلیم پائے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ کاشتکاری کی طرح روما سے فوجی قابلیت وصلاحیت بھی، رخصت ہو گئی، اور رومیون کے تحفظ وبقاے اخلاق مین اب اس کا مطلق اثر نہین باقی رہا۔

مفصلۂ بالا حالات واسباب کی بنا پر اگر رومی شہنشاہی کو اخلاقی انحطاط وزوال ہوا، تو یہ مطلق حیرت انگیز نہین، بلکہ تعجب کی اگر کوئی بات ہے، تو یہ کہ یہ زوال اتنے عرصے مین کیون ہوا، اور اس بداخلاقی کی فضاے مسموم مین وقتاً فوقتاً مصلحین کبار و بلند اخلاق اشخاص کیونکر پیدا ہوتے رہے۔ کیونکہ اب حالت یہ تھی، کہ کوئی صیغۂ عمل کوئی شعبۂ حیات، ایسا نہ تھا جس مین بدکاری کی سمیت نہ سرایت کر گئی ہو۔ اُمراء نشۂ دولت مین مست ہر وقت خوشامدی مصاحبون کے حلقہ مین محصور، اپنے بہیمانہ جذبات کی سیری مین مشغول رہتے تھے، اور غلامون کی جو کثیر تعداد وہ زیر فرمان رکھتے تھے، وہ غلام کیا تھے، افعال شنیعہ کے ارتکاب کے لیے اپنے آقاؤن کے آلات عمل تھے۔ رہے غربا، تو انھین صنعت وحرفت، مشاغل علمی وکاروبار سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ محنت ومشقت سے عاری، یہ کاہلی، مفت خوری، اور پاجی پن کو مقصود حیات سمجھے ہوئے تھے۔ لیکن تمام سیہ کاریون وشہوت پرستیون کا دفتر

گرد ہو جاتا ہے، جب ہم یہ خیال کرتے ہیں، کہ ان لوگوں کو اپنے ابنائے جنس کی تعذیب، عقوبت، ایذا دہی بلکہ قتل و ہلاکت میں خاص لطف آتا تھا۔

درحقیقت آج کل کے لوگوں کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آسکتی، کہ کوئی قوم سیاسی جیسے شقاوت مجسم شغل کو کیونکر اپنا مشغلۂ تفریح رکھ سکتی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں، کہ ایک اعلیٰ متمدن قوم کے، جسے اخلاق فاضلہ کا نہ صرف زبانی دعویٰ ہو، بلکہ جو ایک حد تک اسے عمل سے بھی مطابق رکھتی ہو، افراد و کور واتات کا انسانی خون ریزی کو اپنی دائمی تفریح، دلبستگی، و لطف اندوزی کا ذریعہ بنائے رکھنا تاریخ کا ایک عجیب ترین واقعہ ہے۔ لیکن یہ اخلاق کی عام رفتار کے موافق تھا، اور اخلاق کے ارتقاء طبعی کے ذرا بھی منافی نہیں۔ البتہ اس کی بنا پر مورخ اخلاق کو نئے اسباب وعلل کی تفتیش کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔

یہ خون ریز مناظر جن کی مقبولیت کے سامنے رومہ کے تمام ملاعب و تماشے ماند پڑ گئے، ابتداءً مذہبی مراسم تھے، جو مقابر پر ادا کیے جاتے تھے، اور ان کی بنیاد اول اول اسی حیثیت سے پڑی تھی، کہ یہ انسانی قربانیاں ارواح کو راضی و خوش رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ بعد کو ان کے قیام کی تائید میں یہ دلیل بھی لائی جانے لگی، کہ جنگ وقتل کے ان نظاروں سے انسان میں عسکریت کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہیں سے اس دستور کی بنا پڑی، کہ جب کوئی فوج معرکۂ جنگ پر بھیجی جانے لگتی، تو پہلے اُس کی ضیافت انھیں مناظر خونیں سے کی جاتی۔ علاوہ ازیں ان کا وجود ایک خاص سیاسی مصلحت کو بھی پورا کرتا تھا، اور وہ یہ تھا، کہ ایسے زمانے میں جبکہ حکومت کے کانوں تک رعایا کی آواز پہونچنے کا اور کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا تھا، صرف یہی مواقع ایسے ہوتے تھے، جبکہ حاکم و محکوم کو یکجائی نصیب ہوتی، اور سلطان کے حضور میں رعایا اپنی عرضداشتیں پیش کرتی، یا اُس کے اور اُس کے وزراء کے

افعال پر آزادانہ نکتہ چینی کر سکتی۔ روایت ہے کہ یہ کھیل اطروریوی[1] الاصل تھا۔ سب سے پہلے ۲۶۴ قبل مسیح میں بروٹس نامے ایک شخص کے دو لڑکوں نے اپنے والد متوفی کے جنازے پر سیافون کی تین جوڑوں کو لڑایا۔ اس وقت سے سرزمین روما میں یہ چسکا پڑ گیا، اور رفتہ رفتہ اسے اتنی مقبولیت حاصل ہوئی، کہ ہر بڑے پبلک جلسے اور امرا کے یہاں تقریبات میں یہ دھوم دھام سے منعقد کیا جاتا۔ سیزر و پامپی کی باہمی رقابت بھی اسے ترقی دینے کا ایک سبب ہوئی، کہ اسی کے ذریعہ سے ہر فریق اپنے تئیں عوام میں زیادہ مقبول و ہر دلعزیز بنانا چاہتا تھا۔ اور اسی خواہش مسابقت نے اس فن میں نئی نئی ایجادیں بھی کرائیں، مثلاً پامپی نے آدمیوں اور جانوروں کے درمیان جنگ کا طریقہ نکالا۔ یا سیزر نے یہ کیا، کہ اسے صرف مردوں کی نعش پر محدود نہ رکھا، بلکہ عورتوں کے جنازے پر بھی یہ تماشا رائج کر دیا، چنانچہ سب سے پہلے جس رومی خاتون کی نعش، انسانی خون کے قطروں سے ناپاک کی گئی، وہ خود حضرت سیزر کی صاحبزادی تھیں۔ اس کے علاوہ عارضی پنڈالوں کی جگہ مستقل چوبیں عمارات اسی کام کے لیے تیار کرانا، تماشائیوں کے آرام کے لیے ایک ریشمی سایبان کا انتظام کرنا، بجائے لوہے کے چاندی کے نیزے سیافون کے ہاتھ میں دینا، اور ان کی اس قدر قدر کرنا کہ ان کی بیحد کثرت سے خائف ہو کر سینٹ کو ان کی ایک خاص تعداد متعین کرنے پر مجبور ہونا پڑا، یہ سب کارنامہ سیزر کے اولیات میں داخل ہیں۔ جب شہنشاہی قائم ہوئی، تو ٹارس نے پتھر کے کام کا پختہ ایمفی تھیٹر (تماشاگاہ) تعمیر کرا دیا۔ اب یہ حالت ہو گئی کہ سلاطین مابعد کو سیافون کی غیر معمولی تعداد کی روک تھام کرنا پڑی۔ چنانچہ آگسٹس نے یہ قانون نافذ کیا کہ ایک موقع پر ایک سو بیس (۱۲۰) سے زاید سیافون کو اپنا کرتب دکھانا ناجائز ہے، نیز کوئی شخص سال میں دو مرتبہ سے زاید ان تماشوں کی دعوت نہیں کر سکتا، اور پھر

[1] اطروریا، قدیم اٹلی کے وسط میں ایک مملکت کا نام تھا،

اس کے بعد ٹائبیریس نے بھی اسی طرح کے احکام جاری کیے، لیکن یہ سیلاب اتنا پُرزور تھا، کہ کوئی بند اسے نہیں روک سکتا تھا۔ اب اس کی مقبولیت کی یہ کیفیت تھی، کہ اشخاص کی وفات، افسروں کی ترقی، فاتحین کی فتحمندی، امرا کے جشن، مختصر یہ کہ شادی و غمی کی ہر تقریب پر سیافی کا جلسہ ہونا ضروری تھا۔ سیافی کے اسکول، اٹلی کے شہر شہر میں قائم تھے، اور غلاموں و مجرموں کے علاوہ خود آزاد شہری بھی اجرت پر اس میں شریک ہوتے تھے۔ لوگوں کی سمجھ ایسی پھر گئی تھی، کہ جیتنے والے کو جو بیش بہا انعامات ملتے تھے، اُمرا و دربار شاہی میں ان کی جو قدر و منزلت ہوتی تھی، اور عام طور پر اُن کا جس جوش و سرگرمی سے استقبال کیا جاتا تھا، اس کے مقابلے میں انھیں اس پیشہ کے خطرناک پہلو نظر ہی نہیں آتے تھے۔ موت کی طرف سے بےحسی اور زندگی کی بے وقعتی اس طرح تماشاگروں اور تماشائیوں دونوں کے ذہن میں جاگزیں ہوگئی۔ اس فن کی معلمی، ملک میں ایک معزز و وقیع پیشہ کی حیثیت سے دیکھی جانے لگی اور تماشاگروں کی کمپنیاں سارے ملک میں دورہ کیا کرتی تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا، کہ سیافی کے مناظر، رومی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہوگئے، جن کا عکس ہر شعبۂ حیات میں نظر آتا تھا۔ بچے کھیل میں اسی کی نقل اتارتے، عام صحبتوں میں موضوع گفتگو یہی رہتا، فلاسفہ تشبیہات و استعارات اسی سے اخذ کرتے، ارباب فنون لطیفہ اسی کو اپنے فنوں میں مختلف طریقوں پر ظاہر کرتے "پاک کنواریوں" کے لیے تماشاگاہ میں ایک معزز جگہ مخصوص کردی گئی تھی، اور کولوسیم (تماشاگاہ اعظم) جس میں اسّی ہزار تماشائی سما سکتے تھے، شہنشاہی عہد کی تمام عمارات پر غالب تھی، اور آج بھی وہی دور کی اس سے زیادہ پُرشوکت، عظیم الشان و گراں قدر یادگار نہیں مل سکتی۔

یہ کیفیت نہ صرف خاص اٹلی بلکہ تمام صوبجات و مقبوضات کی تھی، گال سے لے کر ملک شام تک جہاں جہاں، رومی اثر و اقتدار پہونچا تھا، اپنے جلو میں اس

خونفشانی کے دل بہلاؤ کو بھی ساتھ لیتا گیا تھا جس کی شہادت آج بھی بڑے بڑے عظیم الشان تماشا گاہوں کے آثار دے رہے ہین۔ بیان کیا جاتا ہی کہ ٹابیریس کے عہد مین ایک متصل کے شہر مین ایک پنڈال کے گرنے سے بتیس ہزار آدمی اس کے نیچے دب کر مر گئے۔ نیرو کے زمانے مین باشندگان سیراقوس نے ایک خاص عرضداشت کے ذریعہ سے یہ چاہا کہ ان کے وطن مین سیافون کی تعداد محدود نہ رکھی جائے، اور جب یہ درخواست منظور ہو گئی، تو اسے وہ ایک غیر معمولی نعمت سمجھے۔ شاہ ٹائیس، ملک یہودیہ سے جو ہزارہا اسیران جنگ اپنے ہمراہ لایا تھا، ان مین سے ایک بڑی تعداد اُس نے اسی کے واسطے مخصوص رکھی، کہ بیرونجات مین جاکر اس پیشے کو اختیار کرین۔ شام مین پہلے پہل جب یہ ملاعب لائے گئے، تو لوگون کو بجاے مسرت کے ان مناظر سے وحشت ہوئی، لیکن رفتہ رفتہ ان لوگون کو بھی اس مین لطف آنے لگا، یہان تک کہ ایک مرتبہ ایک مقام پر شہنشاہ اگریپا کے حکم سے پورے ایک ہزار چار سو سیافون کو اپنا کرتب دکھانا پڑا۔ اس عام وبا سے اگر کوئی ملک کسی حد تک محفوظ تھا، تو وہ یونان تھا، یہان جب اول اول اس کی تقریب کی جانے لگی، تو ایک کلبی حکیم ڈی مونکس نے لوگون سے مخاطب ہو کر کہا، کہ اس کھیل کو اپنے یہان رائج کرنا ہی، تو پہلے رحم کے دیوتا کو شہید کر ڈالو۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ یعنی یہ دستور نہین پھیلنے پایا، البتہ ایک مدت کے بعد شاید پھر اس کا حملہ یونان پر ہوا، لیکن اس قدر یقینی ہی، کہ بجز کورنتھ کے سرزمین یونان مین اور کسی مقام پر یہ وبا زور نہین پکڑنے پائی۔

بداخلاقی کی ایک شاخ سے دوسری شاخ نکلتی ہی۔ ٹیکیٹس وسوٹونیس جس رومی شہوت پرستی کا ذکر کرتے ہین، کیا عجب ہی اگر وہ اسی سے پیدا ہوئی ہو۔ ہر وقت مناظر خونین کے خوگر رہنے کا ایک عام اثر یہ تو صریحًا پیدا ہو گیا تھا، کہ لوگون کو

سنجیدہ و متین مشاغل مین کوئی لطف نہین حاصل ہوتا تھا، اور بد مذاقی کی یہ نوبت آ گئی تھی، کہ جب تک کسی ملعبہ مین جذبات شہوانی کو خوب جی بھر کر اکسایا نہ گیا ہو، تماشائیون کو کچھ مزہ نہین آتا تھا۔ جو لوگ نہایت چٹپٹی غذاؤن کے عادی ہو جاتے ہین، اُنھین سادہ کھانا پھیکا اور بیمزہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی حال رومی آبادی کا تھا، بعد مناظر خونین کے انھین اور کسی شغلِ تفریح مین کچھ بھی لطف آتا، تو وہی ہوتا جس مین انسان کے قوائے شہوانی کی تصویر کھینچی گئی ہوتی۔ جن اشعار مین فحش و بیحیائی اور شہوت انگیز خیالات کی بھرمار ہوتی، وہ قدر کی نگاہون سے دیکھے جاتے، اور جن کلام مین سادہ مضامین، آمیزش فحش سے پاک ہوتے، اُنھین کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔

لیکن خیر، کامیڈی تو پھر بھی ملاعب سیاقی کے علی الرغم جون تون قایم تھی، مگر ٹریجڈی کا گویا بالکل خاتمہ ہی ہو گیا تھا۔ یہ سچ ہے، کہ ایکٹر، سیاف سے زیادہ ہولناک و درد انگیز سمان کی تصویر پیش کر سکتا ہے، لیکن یہ تصویر بہرحال تصویر ہوتی ہے، اصلی کیفیت زندگی تو نہین ہوتی۔ مانا کہ ایک اچھا ایکٹر اپنے لب و لہجہ، حرکات و سکنات، وضع و انداز کے لحاظ سے اپنے اندر عبرت آموزی و درد انگیزی کا بہترین مواد رکھتا ہے، لیکن جو لوگ خود اصلی واقعات قتل و ہلاکت سے کوئی درد، عبرت و بصیرت نہین حاصل کرتے، انھین محض تصویر کشی کیونکر متاثر کر سکتی ہے؟ نفس بشری کی یہ حالت سلامتی ذوق، یہ ایک جبلی خصوصیت ہے، کہ خون و قتل کے مناظر سے اسے وحشت ہوتی ہے، اور ڈراما کا اصل مقصد یہ ہے کہ اسی جذبہ کو تقویت پہونچائے، لیکن جب مذاق اس قدر بگڑ جائے، کہ نفس مناظر خونین سے بجائے وحشت کے، لطف و لذت اٹھانے لگے تو ظاہر ہے کہ ایسی جماعت مین ڈراما کو کیونکر مقبولیت نصیب ہو سکتی ہے؟ یہی سبب ہے کہ روما مین اس وقت ایک معمولی سیاف، بہتر سے بہتر ڈراما نویس و ایکٹر سے

زیادہ کامیاب رہتا تھا۔

اس حقیقت پر تاریخ و تجربہ کا اجماع ہے، کہ ضمیر انسانی کو جو اذیت اپنے ابنائے جنس کے خون کو دیکھ کر ہوتی ہے، وہ بہ لحاظ نوعیت وہی ہوتی ہے، جو قتل حیوانات سے پیدا ہوتی ہے۔ فرق جو کچھ ہے، وہ صرف مدارج کا ہے، اور وہ کچھ اس سبب سے ہے کہ ہمین بہ نسبت حیوانات کے اپنے ہمجنسون کی تکلیف کا اندازہ کرنے مین زیادہ آسانی ہوتی ہے، اور کچھ باعث اس فرق کا ہماری ابتدائی تعلیم ہے۔ ورنہ نفس الامر کے لحاظ سے دونون جذبات ایک ہین۔ چنانچہ جس شخص نے ذبح حیوانات کا منظر کبھی نہ دیکھا ہو، وہ اگر پہلی بار کسی جانور کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھے، تو اس کی تاب نہین لا سکتا ہے۔ مگر عادت ایسی شے ہے، جو کچھ عرصے کے بعد ہر تکلیف کو راحت بنا دیتی ہے۔ لوگ اول اول ذبح حیوانات کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتے ہین، لیکن کچھ عرصے کے بعد اُنھین ذرا بھی تکلیف کا احساس نہین رہ جاتا۔ یہی حال انسانی خون ریزی کے مناظر کا ہے۔ عادت کا وہ قانون جو ذبح حیوانات پر عامل تھا، قتل انسانی پر بھی حاوی ہے۔ انسان پہلے تو جھجکتا ہے، لیکن عادی ہو جانے پر بالکل بیدردی و بیحسی چھا جاتی ہے، اور انسان بلا تکلف اپنے ہمجنسون کو خون مین غسل کرتے دیکھتا رہتا ہے۔ وحشیون کی ہر زمانے مین یہ عام حالت رہی ہے۔ آج بھی بعض مردم خور قبائل جو وحشت کی پست ترین سطح پر ہین، برابر اپنے ہمجنسون کو شکار کرتے رہتے ہین، اُسی بیدردی بلکہ لطف و مسرت کے ساتھ جیسے ہم جانورون کو شکار کرتے ہین۔ پس اگر رومی اپنے ابنائے جنس کے مناظر قتل و ہلاکت سے لطف اُٹھاتے تھے، تو یہ کوئی مستبعد و حیرت انگیز واقعہ نہین۔

بے شبہ آج ہمین ان واقعات کو پڑھ کر غصہ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، لیکن ہمین بجائے خود اس پر غور کرنا چاہیے، کہ عادت کا اثر کس قدر عمیق و وسیع ہوتا ہے۔ نفس انسانی کی کوئی خصوصیت ایسی نہین، جسے انسان عادت کے ذریعہ سے کسب

نہ کر سکے، فرض کیجیے، کہ ایک شخص نیکی وحسن اخلاق کا مجسمہ ہے، لیکن وہ پیدا ایسے ملک مین ہوتا ہے، جہان ان ملاعب سیاہی کی معصومیت بالکل مسلّم سمجھی جاتی ہے، اور جہان ان کے متعلق اخلاقی حیثیت سے کسی کے ذہن مین شبہ بھی نہین پیدا ہوتا ایسے ملک اور ایسی فضا مین، فرض کیجیے کہ وہ اپنے بچپن مین اسی نظارہ کے لیے لے جایا جاتا ہے، تو فرمائیے، اس کی کیا حالت ہوگی؟ یہ ہوگی، کہ شاید پہلی مرتبہ وہ کچھ جھجکے، لیکن چند بار کے بعد یہ جھجک بالکل مٹ جائے گی، اور اس پر اس بارہ مین ایک کامل بےحسی چھا جائے گی۔ اور صرف یہی نہین، بلکہ اُسے ان مناظر مین لطف بھی آنے لگے گا۔ ہمارے بعض معاصرین کو یہ کیفیت اس قدر مستبعد معلوم ہوتی ہے، کہ وہ اس سے انکار کرنے پر مائل ہین، لیکن میرے نزدیک اس مین کوئی ایسا استبعاد نہین۔ اُس زمانے کے مخصوص حالات سے قطع نظر کرکے خود اپنے گرد وپیش نظر کیجیے۔ آپ کے تمدن وشائستگی کے گہوارہ مین نشو ونما پانے والے بچون کی کیا کیفیت ہے؟ انھین بھی تو اُن کھیلون مین زیادہ لطف آتا ہے، جن مین کسی کو ستانا اور ایذا پہونچانا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شکاریون کا کیا حال ہے؟ انھین بھی تو جانورون کی جان لینے مین خاص لذت ملتی ہے۔ یہ بیجان چیزون کا کیون نہین شکار کرتے؟ صرف جانداروں کا کیون شکار کرتے ہین؟ اس لیے کہ انھین اسی مین زیادہ لطف آتا ہے۔ جب یہ حال موجودہ دور کا ہے، جو ہمہ تن انسانیت ودردمندی کی تعلیم کا مدعی ہے، پھر اگر ایسے دور مین جبکہ شقاوت وسفاکی کا معیوب ہونا بھی مشتبہ ہو، اگر سیاہی وخونریزی اس قدر عام، اور اس قدر مقبول ہو، تو حیرت وتعجب کی کیا بات ہے؟ چنانچہ مشہور ہے، کہ شہنشاہ کلاڈیس کو مقتولون کی حالت نزع کے تماشے مین خاص لطف آتا تھا، اور وہ دم توڑنے والے شخصون کے چہرے کو خاص دلچسپی وشوق سے بغور دیکھا کرتا۔ اور یہ تو ایک عام دستور تھا کہ جب کوئی سیاہی مغلوب ہوکر گرتا، تو حاضرین اپنے

انگوٹھے کی ایک خاص علامت سے اس کا فیصلہ صادر فرماتے، کہ اُس کا حریف اُسے قتل کر ڈالے یا زندہ چھوڑ دے، اور سیّافی کا وہ میزبان زیادہ شہرت حاصل کرتا، جو مہمانون (یعنی حاضرین) کی خوشی کے مقابلہ مین کسی مالی نفع کی پروا نہ کرتا۔

علاوہ ازین انسانی طبیعت مین جدت پسندی کا جو مادہ ودیعت کیا گیا ہی، وہ اس خصوص مین بھی بہت سنئی ایجادین دیکھنا چاہتا۔ دو آدمیون یا دو جانورون مین محض معمولی طور پر مساوی جنگ دیکھتے دیکھتے لوگون کا جی اُکتا گیا، اور اب اس مین طرح طرح کے اختراعات و تنوعات ہونے لگے۔ ایک مرتبہ ایک بالو کے ٹیلے پر ایک بیل اور ایک ریچھ زنجیرین باندھ کر لڑنے کے لیے چھوڑے گئے۔ ایک مرتبہ بہت سے قیدیون کو جنگلی جانورون کی کھال پہنا کر بیلون کے آگے چھوڑ دیا گیا، جنھین گرم آہنی سلاخون سے کوچ کوچ کر خوب مشتعل و غضبناک کر دیا گیا تھا۔ کیلوگلا کے عہد مین، صرف ایک دن مین چار سو ریچھ، اور کلاڈیس کے عہد مین تین سو ریچھ ہلاک کیے گئے۔ نیرو کے زمانے مین چار سو چیتون کو ہاتھیون اور بیلون سے مقابلہ کرنا پڑا، اور چار سو ریچھ اور تین سو شیر اس کے سپاہیون کے ہاتھ سے ہلاک ہوئے۔ ٹائٹس نے ایک خاص تقریب کے موقع پر ایک دن مین پانچ ہزار جانورون کو کاٹ ڈالا۔ ٹریجن کے عہد حکومت مین ایک بار سیافی کا تماشہ لگاتار ۱۲۳ دن تک ہوتا رہا۔ شیر، چیتے، ہاتھی، گینڈے، سانڈ، زرافہ، بارہ سنگھے، گھڑیال، سانپ، غرض قسم قسم کا جانور حاضرین کے شوق جدت پسندی کو پورا کرنے کے لیے اکھاڑے مین چھوڑا جاتا۔ اور کیا انسانی خون ریزی مین اس سے کچھ کم بیدردی و شقاوت کا اظہار ہوتا تھا؟ گورڈی آن اول نے بارہ تماشے کرلیے، اور ہر تماشے مین ۱۵۰ سے لیکر پانسو جوڑون کو سیّافی کرنا پڑی۔ آریلین نے اپنی فتح کی خوشی مین ۸۰۰ جوڑین لڑائین۔ ٹریجن نے جو تماشہ عرصے تک جاری رکھا تھا، اس مین دس ہزار آدمیون کو لڑنا پڑا تھا۔ نیرو نے ایک شب کو اپنے باغ مین یون روشنی کرائی، کہ عیسائیون کے قمیصون پر

تیل چھڑک کران مین آگ لگادی۔ ڈومیٹین کے زمانے مین ملک بھر کے ضعیف الجثہ بونون کے باہمی مقابلہ کی سیر دیکھی گئی، اور ایک سے زائد بار عورتون کو سپاہی کے اکھاڑے مین اُترنا پڑا۔ ایک مرتبہ ایک قیدی کو صلیب مین جکڑ کر اُس پر ایک ریچھ چھوڑ دیا گیا۔ ایک اور قیدی کو یہ سزا دی گئی، کہ جلتے ہوئے شعلہ مین اپنا ہاتھ داخل کر دے۔ ایک اور قیدی کا یہ حشر ہوا کہ اُسے زندہ آگ مین جلا دیا گیا۔ غرض یہ کہ اہل روم مین خون آشامی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی، کہ بڑے سے بڑے مناظر خونین کے نظارے سے بھی یہ پیاس نہین بجھتی تھی، اور اس کے لیے بادشاہون کو مجبور ہو کر نئے نئے طریقے سفاکی و خون ریزی کے ایجاد کرنا پڑتے۔ یہ حالت رفتہ رفتہ اس قدر شدید ہو گئی تھی، کہ کوئی فرمان روا اگر لشکریون کی اجرا اور غلہ کی تقسیم مین بخل سے کام لیتا، تو اس سے وہ اپنی مقبولیت و ہر دلعزیزی کو اس قدر صدمہ نہ پہونچا سکتا، جتنا اس خاص پیشہ کی طرف بے اعتنائی کرنے سے۔ خود نیرو، جو تاریخ مین اپنی شقاوت کے لیے ضرب المثل ہی، غالباً اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر رومیون کے نزدیک سب سے بہتر تاجدار ہوا ہی۔ شاہ ہیلیوگیبولس و گیلیریس کے بابت منقول ہی، کہ وہ کھانا کھاتے وقت بطور تفریح کے یہ مشغلہ کرتے رہتے، کہ اپنے سامنے قیدیون کو جنگلی جانورون سے نچواتے ہوتے۔ بلکہ گیلیریس کی بابت تو یہ اُسی وقت سے مشہور تھا، کہ بغیر انسانی خون ریزی کے نظارہ کے کبھی اس کے حلق سے نوالہ نہین اُترا۔

ہمین ان واقعات کو سرسری نظر کے حوالہ نہ کر دینا چاہیے، بلکہ ان پر غور و تدبر کرنا چاہیے۔ کیونکہ مجھے یقین ہی کہ جتنی بصیرت سیرت بشری کے حضیض اخلاقی کے متعلق ان کے ذریعہ سے ہو سکتی ہی، اتنی کسی فلسفیانہ مذاکرہ سے ممکن نہین۔ انھین کی مدد سے ہمین یہ معلوم ہوتا ہی کہ ہمارے موجودہ تمدن کی سطح اخلاقی حیثیت سے

کس قدر بلند ہے، اور انھین کی وساطت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسیحیت نے اصلاح اخلاق عالم پر کیسا وسیع اثر ڈالا ہے، کیونکہ ملاعب سیافی کا خاتمہ تمامتر مسیحیت ہی کی کوششون کا نتیجہ ہے۔ فلسفہ ان پر لاکھ چین بہ جبین ہوتا رہتا، اخلاق ان پر ہزار لعن طعن کرتا، لیکن عوام کے نفوس پر ان کا اثر اتنا گہرا تھا، کہ بجز ایک مذہب جدید کے اور کوئی طاقت اس کے مٹانے مین کامیاب نہین ہو سکتی تھی۔

سیافی کی یہ مقبولیت و دلفریبی اس لحاظ سے مطلق حیرت انگیز نہین کہ دلکشی کے جتنے عناصر اس مین آکر مجتمع ہو گئے تھے، اتنے کسی دوسرے ملعبہ مین نہ تھے۔ لق و دق اکھاڑہ، امرا و اعیان دولت کی زرق برق پوشاکین، تماشائیون کا انبوہ کثیر اُن کے ذوق و شوق کا اثر متعدی، اتنے بڑے مجمع مین ایک متوقعانہ سکون و خاموشی اسّی ہزار زبانون سے اکبارگی صداے تحسین کا بلند ہونا، اس کی آواز سے شہر کیا معنی مضافات شہر تک کا گونج اُٹھنا، جنگ کا گھڑی گھڑی رنگ بدلتے رہنا، عدیم المثال جرأت و بیجگری کا اظہار، ان مین سے ہر شے تخئیل کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہے، اور ان کی مجموعی طاقت قدرتی طور پر نہایت قوی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ سیّاف عموماً قیدی و غلام ہی ہوا کرتے تھے، لیکن تماشا کے جوش و خروش اور ان کے کرتب سے بیخود ہو کر حاضرین اس وقت ان کی غلامی و خطاکاری کو بالکل فراموش کر جاتے تھے بلکہ کوئی آنکھ ایسی نہین ہوتی تھی، جو انھین عزت و تعظیم کی نظرون سے نہ دیکھتی ہو۔ اور یہ عزت کچھ محض عارضی و ہنگامی نہین ہوتی تھی، بلکہ مدتون گھر گھر انھین کے تذکرہ رہتے تھے، گلی گلی انھین کے چرچے ہوا کرتے تھے، اور جس سیاف نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی، اس کی مدح مین تو شعرا قصاید خوانی کرتے تھے، اور نقاش و بُت تراش اپنے اپنے فن کو اس کی یادگار سے زینت دیتے تھے۔ مشہور سیّاف اسپارٹیکس، تین سال تک رومہ کی شجاع ترین افواج سے غیر مغلوب رہا۔ بہترین

رومی جنرل، سیافون کو بطور اپنے باڈی گارڈ کے رکھتے تھے۔ انٹونی جب نامرادی کی گردش مین آگیا، اور تمام رفقا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، تو جو مختصر جماعت مرتے دم تک اس کے ساتھ رہی، وہ یہی سیافون کی جماعت تھی۔ حسین کنواریان حریصانہ انداز سے ان کو اکھاڑہ مین دیکھا کرتین، اور روما کی امیر سے امیر شریف زادیان یہان تک کہ خود ملکہ وقت، اس تمنا مین رہا کرتین، کہ کسی مشہور سیافت کا شمار ان کے عاشقون مین ہو۔ خود سیافون کی سیرت پر ان واقعات سے روشنی پڑے گی، کہ وہ ان ملاعب کے اس قدر کم اور بدیر منعقد ہونے پر افسوس کیا کرتے تھے، اگر اکھاڑہ مین اترنے کی انھین اجازت نہ ملتی تو اس پر سخت شکایت کرتے، بجز نہایت قوی حریف کے اور کسی سے مقابلہ کرنا اپنی توہین خیال کرتے، جس وقت ان کے زخمون پر پٹی باندھی جاتی تو وہ بہ آواز بلند قہقہہ لگایا کرتے، اور جب زخمون سے چور ہو کر زمین پر گرتے تو بلا تامل اپنا گلا اپنے حریف غالب کی تلوار کے آگے کر دیتے۔ پبلک ان کا جس جوش و شوق سے استقبال کرتی، اس کے لحاظ سے بار بار ان کی تعداد کو محدود رکھنے کے لیے قوانین نافذ کرنا پڑتے، مگر اکثر بے اثر رہتے۔ عام اہل شہر خود، ان کے گروہ مین داخل ہونے کی کوشش کرتے، اور علما، اپنی تصانیف کے لیے انھین ملاعب سے تمثیلات کا مواد اخذ کرتے۔ سیافون کے لئے جنگ سے بیشتر تجرد لازمی تھا، پس ایسے ملک مین جہان شہوت پرستی کی اس قدر گرم بازاری ہو، ان لوگون کا محتاط و مجرد رہنا، ان کی اخلاقی عظمت کی کافی دلیل ہے۔ اس سلسلہ مین سب سے زیادہ عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے، کہ اس زمانے کے اساطین مسیحیت تمام بت پرستون مین سے سیافون ہی کے کیرکٹر کو مسیحی اخلاق سے .... زیادہ اقرب پاتے تھے۔ سینٹ آگسٹاین روایت کرتے ہین کہ، میرے ایک مسیحی دوست کو جب اس منظر کے دیکھنے کا اول بار اتفاق ہوا، تو اس نے اس گناہ سے بچنے کے لیے

اپنی آنکھیں بند کرلیں، لیکن معًا ایک شور غیبی بلند ہوا، جس سے جھجک کر اُس نے آنکھیں کھول دیں، اور پھر تماشے کے خاتمے تک اپنی آنکھیں بند کرنے پر قادر نہ ہوسکا۔"

ناظرین کے ذہن میں یہ سوال یقیناً پیدا ہوا ہوگا کہ مانا، روما کے عوام الناس اس بہیمانہ خون آشامی پر عامل تھے، لیکن آخر حکماءِ اخلاق ومورخین اسے کس نقطۂ خیال سے دیکھتے تھے؟ اور ان کا ضمیر کیونکر مُردہ ہوگیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لعب ابتداءً مذہبی قربانیاں تھیں جن کے ذریعے سے ارواح کو خوش کیا جاتا تھا پھر رفتہ رفتہ اس عقیدہ نے بھی مذہبی شکل اختیار کی، کہ جانور کی طرح محض ذبح ہوجانے سے انسان کے لیے یہ طریقہ زیادہ قرینِ انسانیت وشریفانہ ہے کہ وہ لڑکر جان دے۔ اب سیاف جو ہوتے تھے، وہ انھیں چار طبقوں میں سے ہوتے تھے (۱) کچھ تو وہ لوگ ہوتے تھے، جو اپنے آزاد پیشہ رکھتے تھے، مگر اپنی خوشی وشوق سے انھوں نے اس پیشہ کو اختیار کیا تھا۔ ایسے لوگوں کا خون خود انھیں کی گردن پر تھا۔ وہ خود سرفروشی کے لیے تیار ہوئے تھے، اور انھیں اس سے کون باز رکھ سکتا؟ (۲) دوسرے اس طبقے میں غلام تھے۔ غلاموں کی بابت پہلے تو یہی بحث رہی ہے کہ ان میں روح ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ جب تک یہ مسئلہ نہیں طے ہوا، تب تک تو ظاہر ہے کہ کسی کو ان پر کیوں ترس آتا۔ البتہ جب خیالات میں اتنی وسعت آگئی، کہ یہ بھی ایک طرح کا حس رکھتے ہیں، تب ان کے حقوق جان پر توجہ ہونے لگی اور خود بادشاہ کو قانوناً ان کے حلقۂ سیافین میں داخلہ کی ممانعت کرنا پڑی۔ (۳) تیسرا گروہ اُن مجرموں پر مشتمل ہوتا تھا جن کے لیے عدالت سزائے موت تجویز کرچکی ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر یہ سیافی میں مقتول ہوتے، تو تو ان کو وہی سزا مل جاتی لیکن اگر یہ معرکے میں غالب آجاتے، تو اکثر حالتوں میں ان کی جان بخشی ہوجاتی۔

اور اس طرح ان لوگون کی شرکت سیافی کسی طرح مذموم نہین خیال کی جاتی تھی۔
(۴) چوتھے نمبر پر اس مین اسیرانِ جنگ ہوتے تھے۔ مگر ایسے زمانے مین جب کہ
ہر اسیر جنگ کا قتل کرڈالنا بالکل جائز تھا، اگر یہ غریب سیافی کر کے جان دیتے، تو
اس مین کسی کو کیا قباحت نظر آسکتی تھی؟

اسباب بالا کی بنا پر حکماء اخلاق مین سے کسی کو اس دستور کے انسداد کا خیال
تک نہین آیا۔ زیادہ سے زیادہ جس شخص نے اصلاح کرنا چاہی، وہ یہ کی، کہ اس کو کسی قدر
محدود رکھنا چاہا۔ اس مسئلہ کی طرف، کہ قتل وہلاکت کو، خواہ وہ مجرمون وخطاکارون ہی
کی ہو، ایک مشغلۂ تفریح ولطف بنالینا بجاے خود سخت مذموم ہی، اُس وقت کے
کسی فلسفیانہ مسلک کا ذہن نہین منتقل ہوا تھا۔ البتہ چند افراد کو کبھی کبھی یہ خیال گزرتا تھا
سسرو کہتا ہی "بعض اشخاص کو ملاعب سیافی ظالمانہ وخلاف انسانیت نظر آتے
ہین، مین یہ نہین کہتا، کہ ان کا موجودہ طریقہ قابل اصلاح نہین ہی لیکن اس مین شک
نہین، کہ مجرمون کو جنگ پر مجبور ہوتے دیکھنے سے کوئی بہتر طریقہ تحمل شداید وموت
پر صبر کی تعلیم حاصل کرنے کا نہین ہوسکتا" سنیکا کے خیالات اس سے زیادہ
عالی ظرفانہ ہین۔ وہ ان ملاعب کو تامتر قبیح سمجھتا ہی، اور ان کی قباحتون کو پُر قوت
طریقے سے ظاہر کرتا ہی۔ اُسے اس استدلال کی صحت تسلیم نہین، کہ چونکہ مقتول مجرم
ہوتے ہین، لہذا ان کے قتل سے لطف اندوزی جائز ہی۔ وہ کہتا ہی، کہ یہ ملاعب
بہر صورت وحشیانہ، قصابانہ، بیرحمانہ، اور قابل نفرت ہین۔ پلوٹارک، اس باب مین
اپنے تمام معاصرین سے آگے تھا۔ وہ صرف انسانی خون ریزی ہی کو نہین بلکہ حیوانات کشی
کو بھی ناجایز قرار دیتا ہی، اور کہتا ہی کہ کشت وخون، خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا، بہر صورت
قابل نفرین ہی۔ ان کے علاوہ تین اشخاص کی اور مثالین ملتی ہین۔ پرُ ڈنیس[1] کی
جوئینیس[2] مارکیس کی، اور سب سے بڑھ کر مارکس[3] آریلیس کی، جس نے سیافون کو صرف

جنگ تلواروں سے لڑنے کی اجازت دی تھی۔ پس ان چند افراد، اور اہل ایتھنز کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد ساری بُت پرست دنیا مین اس ملعبۂ شقاوت مجسم کے خلاف کسی صدائے احتجاج کے بلند ہونے کی نظیر نہین ملتی۔ جو ئیل جس کی ہجو گوئی و نکتہ چینی سے، غلامی سے لیکر رومی اطوار و عوائد کی کوئی قباحت نہین بچی ہی اس ملعبہ کا مکرر ذکر کرتا ہی، مگر اس کے لب و لہجے مین اس کی جھلک بھی نہین پائی جاتی کہ وہ اسے ذرا بھی قبیح و مذموم سمجھتا تھا۔

اسی طرح اکابر مورخین مین جنھون نے ان واقعات کو ہم تک پہونچایا ہی ایک شخص بھی ایسا نہین ہوا ہی جو ان واقعات کا اس طرح تذکرہ کرتا ہو کہ گویا کسی معصیت یا بد اخلاقی کا ذکر کر رہا ہی۔ ایک آدھ نے جو نکتہ چینی کی جرأت کی بھی ہی، تو اخلاقی حیثیت سے مطلق نہین، بلکہ اس خیال سے کہ اس سے ملک و حکومت کے لیے ایک خطرناک گروہ کی تعداد مین اضافہ ہوتا جاتا ہی، یا اس بنا پر کہ اس سے لوگون مین تماشا پسندی کا شوق بڑھتا جاتا ہی۔ رومیون کا مطمح نظر یہ تھا، کہ انسان بجائے متفکر و حکیم ہونے کے جری و بیباک ہو، اور جس کسی صورت سے بھی انسان کا دل موت کی طرف سے بیخوف ہوتا ہو، وہ ان کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ مستحسن تھی، خواہ اس سے جذبات فاضلہ کا کیسا ہی خون ہوتا ہو۔ ٹائیٹس و ٹریجن جن کے عہد حکومت کی مدت قلیل مین یہ ملاعب خونین سب سے کثرت کے ساتھ منعقد ہوتے رہے، رحم دل و خداترس فرمانروا ہوئے ہین۔ اور ٹریجن کے دوران حکومت مین علی الترتیب ۳۰۰۰ و ۱۰۰۰۰ اشخاص کو اپنی جانین دینا پڑین، مگر کسی رومن نے ان کی جانب سفاکی و شقاوت کا انتساب نہ کیا۔ بلکہ سویٹونیس تو ٹائیٹس کی خوش مزاجی کی دلیل اس سے لاتا ہی کہ وہ سپاہی کا تماشہ دیکھنے کی حالت مین لوگون سے ہنسی مذاق کرتا جاتا تھا، اور پلینی اس بنا پر ٹریجن کی مدح و ثنا مین رطب اللسان ہی، کہ وہ صرف ایسے ملاعب کی سرپرستی و قدردانی کرتا تھا، جن سے انسان ہلاکت و جراحت کا عادی ہوتا ہی، نہ کہ اُن کی

جو مزاج مین نفاست پیدا کرتے ہین۔ یہی مصنف، جو خود بھی نہایت حلیم الطبع وفیاض طبع شخص تھا، اپنے کسی دوست سے ایک مرتبہ باقتضاے دیرینہ آشنائی اس استدعا کی منظوری کی سفارش کرتا ہے، کہ ان کے شہر مین بہ ملعبہ جو نین منعقد ہو، اور اس کے آخر مین لکھتا ہے کہ "اس قدر عام استدعا کے بعد اس کو نامنظور کرنا سیرت کی مضبوطی و استحکام کی دلیل نہین، بلکہ ان لوگون پر صریحاً ظلم کرنا ہے"۔ اور زیادہ قدیم زمانے کو جانے دیجیے چوتھی صدی عیسوی کے خاتمے تک یہ حال تھا کہ ایک بزرگ نے جو اپنے معاصرین پرستون مین نہایت درجہ خوش اخلاق و پاکیزہ کردار سمجھے جاتے تھے اپنے لڑکے کی کسی تقریب مین چند سیکسن قیدیون کو سیافی کے لیے تیار کیا، مگر ان غریبون نے یوم مقررہ سے پیشتر قیدخانے ہی مین خودکشی کر لی۔ اس پر یہ بزرگ بیحد متاسف ہوئے، اسے اپنی بدنصیبی سے تعبیر کیا، اور اپنے آپ کو اس خیال سے تسکین دی کہ سقراط و دیگر فلاسفہ کو بھی اسی طرح کے مصایب صبر برداشت کرنا پڑے تھے۔ رومیون کی سیافی کی تاریخ مین تفصیل سے بیان کر چکا۔ لیکن "عیب مے جملہ بگفتی هنرش نیز بگو" کے سررشتہ اصول کو بھی ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ گزشتہ بیانات سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ رومی اخلاق تمامتر بربریون کے اخلاق تھے، اور رومی سیرت کا خمیر وحشت و بربریت سے تھا۔ فطرت البشری، جسے اکثر فلاسفہ ایک سطح ہموار کی مانند سمجھے ہوئے ہین، متعدد ناہمواریون اور تناقضات سے لبریز ہے۔ یکرنگی تو اسے چھو نہین گئی ہے۔ ہر جگہ دورنگی کا جلوہ نظر آئے گا۔ اور یہ بالکل ضروری نہین کہ اگر کسی شخص کا کوئی ایک اخلاقی پہلو مذموم ہو، تو اس کے اخلاق یکسر قبیح ہون۔ اس لیے یہ نتیجہ ہرگز صحیح نہ ہوگا کہ جو اشخاص اُس زمانے مین ملاعب سیافی سے مسرت حاصل کرتے تھے، وہ لازمی طور پر اُسی قدر بداخلاق تھے جتنے زمانۂ حال مین ان ملاعب مین دلچسپی لینے والے اشخاص ہو سکتے ہین۔ کیونکہ یہ اکثر دیکھنے مین آیا ہے کہ جو لوگ

اپنے دور توحش کے معیار اخلاق پر قائم رہے، خواہ وہ ظالمانہ و خونخوارانہ ہی ہو، اُن لوگوں سے اخلاقاً بدرجہا بہتر ہوگئے ہیں، جو دور تمدن جدید میں معیار اخلاق معاصرانہ سے تھوڑا بھی پست ہوگئے ہیں۔ اور یہ تو آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ کسی ایک مخصوص طبقے کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ رکھتے ہیں، وہ دوسروں کے ساتھ بہ غایت عنایت و لطف پیش آتے ہیں۔ یا جو بعض مواقع پر بالکل موم معلوم ہوتے ہیں، وہ دوسرے حالات میں فولاد ثابت ہوتے ہیں۔ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ظالمانہ رسوم کو تو بے تکلف برتتے رہتے ہیں، لیکن رسمی حیثیت سے علیحدہ ہو کر اُن سے کسی ظالمانہ فعل کا ارتکاب ناممکن ہے۔ غرض یہ کہ اخلاق کے کسی ایک پہلو کو دیکھ کر اُس کے تمام پہلوؤں کے متعلق زیادہ سے زیادہ تقریبی و تخمینی نتائج نکال سکتے ہیں، کوئی کلی و قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ مثلاً یہ دیکھ کر کہ ایک شخص حیوانات پر سخت ظلم کرتا ہے، یہ ظاہری نتیجہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہمجنسوں سے بھی سخت ظالمانہ سلوک کرتا ہوگا۔ یا یہ کہ جو حیوانات پر رحیم ہے، وہ انسان پر بھی رحیم ہوگا۔ لیکن تجربہ کی شہادت اس نتیجہ کی تمام تر تصدیق نہیں کرتی۔ اسپینوزا، دنیا کے اُن معدودے چند افراد میں گزرا ہے جو حلم و سلیم الطبعی، فیاضی و نیک مزاجی، اور عام پاکیزگی اخلاق کے لحاظ سے ضرب المثل کی شہرت رکھتا ہے، لیکن اسی اسپینوزا کا خاص مشغلۂ تفریح یہ تھا کہ یہ مکھیوں کو پکڑ پکڑ کر مکڑی کے جال میں ڈالتا تھا، اور خود بیٹھا ہوا اُن کے دم توڑنے کا تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ علمبرداران انقلاب فرانس جو انسانی خون پانی کی طرح بکمال بیدردی بہایا کرتے تھے، (مثلاً فورنیر، میرٹ، ہینیس، وغیرہ) ان میں سے اکثر ایسے ہوئے ہیں، جو جانوروں سے نہایت درجہ محبت رکھتے تھے۔ بیکن بیان کرتا ہے کہ ترک عموماً ایک ظالم قوم ہیں، لیکن حیوانات کے ساتھ بہ غایت شفقت و محبت پیش آئے ہیں، یہاں تک کہ ایک عیسائی کو اس جرم میں انھوں نے

سنگساری کرکے قریب بہ ہلاکت پہونچا دیا کہ اُس نے ایک مرغ کو مار ڈالا تھا۔ مصر میں کیڑے مکوڑے تک کا علاج کیا جاتا ہے، لیکن انسانی درد و دکھ گویا اس قابل ہی نہیں سمجھے جاتے کہ کوئی ادھر اعتنا کرے۔ یہی حال کم و بیش تمام مشرقی اقوام کا ہے۔ اس کے مقابلے میں، سیاحوں کا بیان ہے کہ اسپین میں سیلوں کی جنگ دیکھنے کا شوق عام ہے، حالانکہ اہل اسپین بہت ہی نیک و حلیم الطبع ہوتے ہیں۔ یا پھر اسی طرح بعض مشہور فاتحوں کا حال سنا گیا ہے، کہ وہ بڑی بڑی فوجیں تو بلا تامل کٹوا ڈالتے تھے، لیکن افراد کے ساتھ انتہا سے زیادہ ہمدردانہ و رحیمانہ برتاؤ کرتے تھے۔

اہل روما اس تناقض عملی سے مستثنیٰ تھے۔ جو اشخاص ایک طرف اکھاڑے میں انسانی خون ریزی کو بہ کمال مسرت دیکھا کرتے تھے، وہی تھیٹر میں جب شاعر ٹیرنس کی زبان سے اخوت انسانی کی تعلیم سنتے تو انھیں کے نعرہ ہائے تحسین سے پورا پنڈال گونج اُٹھتا۔ ایک مرتبہ کسی رئیس کے قتل پر جب قاتل کا پتہ نہ چلا، تو سنیٹ نے مجبور ہو کر اُس کے چار سو غلاموں میں سے سب کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس پر شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا، بلکہ علانیہ بغاوت شروع ہو گئی۔ ایک بار ایک سردار ارکسو نے (اغسطس کے زمانے میں) اپنے لڑکے کو کسی بات پر اتنا مارا، کہ وہ اس صدمہ سے مرگیا۔ اس پر شہر میں اتنی برہمی پھیلی کہ لوگوں نے اس کے مکان کا نرغہ کیا، اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچی۔ اسی طرح کیٹو اول نے اس خطا پر ایک ممبر سنیٹ کو اس کے عہدہ سے معزول کر دیا، کہ اُس نے ایک شخص کو سزائے موت دیے جانے کا ایسا وقت مقرر کیا تھا، کہ اس کی صاحبہ بھی اس منظر کو دیکھ سکتی تھی۔ خود ملاعب سیاتی تک میں کبھی کبھی انسانیت کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ ڈرسس سے لوگ اس بنا پر ناخوش تھے، کہ وہ مناظر خونین میں خاص لطف حاصل کرتا تھا، اور کیلوگلا سے اس بنا پر، کہ وہ حالت نزع کو بہت ذوق و شوق سے

دیکھتا ہے۔ شاہ کریگلا اپنے بچپن مین اتنی بات پر ہر دلعزیز ہو گیا تھا، کہ بعض قاتلون کو سزاے موت پاتے ہوے دیکھ کر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ یہ آج کل بازیگر جو دو بانس گاڑ کر اُن مین ایک رسّی باندھ کر اُس کے اوپر چلنے کا تماشہ کرتے ہین، یہ اُس زمانے مین بھی جاری تھا۔ لیکن مارکس آرلیس نے یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ کوئی بازیگر بغیر اس کے کو رسی کے نیچے جال یا مثل اُس کے کوئی شئی اُسے صدمہ سے محفوظ رکھنے والی ہو، یہ تماشہ نہ کرے۔ یہ احتیاط ایسی ہے جسے آج کوئی نہین برتتا لیکن اُس زمانے مین اسے برتا جاتا تھا۔ ان متفرق مثالون سے ثابت ہوتا ہے کہ رومی سیرت سے حسِ انسانیت بالکل فنا نہین ہو گیا تھا۔

فصل (۶)

ملک کی بداخلاقی پر رواقیت کے اصلاحی اثرات

فصل ماسبق سے معلوم ہوا ہوگا، کہ رومی حکماء اخلاق، اور عام رومی آبادی کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھا۔ ایک طرف تو رومی فلسفۂ اخلاق تھا، اس قدر بلند، اس قدر شاندار، اس قدر عالی ظرفانہ، کہ زمانے نے اُس کی نظیر تو شاید کبھی پیدا کی ہو، لیکن اس سے بہتر نمونہ تو دنیا مین آج تک نہین دکھائی دیا ہے۔ دوسری طرف رومیون کا طرز عمل تھا، اخلاق سے معرا، بدچلنی و سیہ کاری سے لبریز، اور اعمال بربریت و وحشت سے پر۔ متقدمین روم کا ضابطہ اخلاق اگرچہ محدود و ناقص تھا، تاہم اُن کی وطنیت، اُن کی عسکریت، اور اُن کی معیشت کی سادگی اُن سے اس پر عمل کرا لیتی تھی۔ بہ خلاف اس کے متاخرین کا ضابطہ اخلاق تو نہایت بلند و مکمل تھا، لیکن عمل کا کہین پتہ نہ تھا۔ اصول اخلاق، کتابون کے صفحات، اور

حکمار کی زبانوں تک محدود تھے۔ ایسی حالت میں حکماء اخلاق کے پیش نظر سب سے اہم یہ مسئلہ تھا، کہ اپنی تعلیمات کو عوام کے دلوں تک کیونکر پہونچائیں اور ان سے کیونکر عمل کرائیں۔

اس مسئلہ کو رواقیت پوری طرح تو حل نہ کرسکی تاہم اس سے جو کچھ بن پڑی اس نے کیا۔ اور گو مرض کا کامل استیصال نہ ہوسکا تاہم اس کی دوائیں بالکل بے اثر بھی نہیں رہیں۔ رواقیت کا سب سے زیادہ مفید اثر یہ پڑا، کہ ایسے متعدد تاجدار پیدا ہوئے رہے، جنھوں نے اپنے قوت واقتدار سے نیکی کی مشعل کو روشن رکھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا، کہ نالایق جانشین نے لایق پیش روؤں کی اصلاحات کو مٹا دینا چاہا، تاہم ان کی پوری بیخکنی کبھی نہ ہوسکی، اور ان کے آثار کم وبیش بہرحال قائم رہے۔ رومی دسترخوان کی فضول خرچیاں ایک زمانے میں حد سے بہت متجاوز ہو گئی تھیں، لیکن جب سے شاہ وسپاسین نے خود اپنے دسترخوان کے اخراجات محدود کیے، الناس علی دین ملوکھم کے اقتضا سے تمام امراء وارکان دربار کو از خود اعتدال کا سبق مل گیا، اور اس طرح شاہی طرز عمل خود بخود سارے ملک کے لیے ایک درس ہدایت بن گیا۔ اسی طرح نیروا کی تخت نشینی سے لیکر مارکس آریلیس کی موت تک، ۸۴ سال کی مدت حکومت روما میں اخلاقی حیثیت سے اس قدر پرامن رہی ہے، کہ اس کی نظیر کسی استبدادی حکومت میں نہیں مل سکتی، اور یہ پانچ تاجدار جنھوں نے اس اثنا میں فرمان روائی کی منجملہ دنیا کے بہترین فرمان رواؤں کے ہوئے ہیں۔ ٹریجن وہیڈرین کی اخلاقی زندگی اگرچہ سخت قابل اعتراض تھی تاہم ان کی قابلیت مسلم ہے۔ انٹونینس ومارکس آریلیس بہ حیثیت مدبرین کے چنداں شہرت نہیں رکھتے، تاہم ان کے فضائل اخلاقی میں کس کو شک ہوسکتا ہے؟ اس چہل سالہ مدت میں تمام دنیا پر متمدن پر امن، سکون، وصلح کی حکومت چھائی رہی۔

بربریوں کے حملے ابھی نہیں شروع ہوئے تھے مختلف قومیں جو رومی شہنشاہی کی ترکیب میں شامل تھیں، حریت فکری پر قانع، اور حقوق سیاسی کی جدوجہد سے ناآشنا تھیں، اور جس سرزمین کی حفاظت کے لیے اس وقت تیس لاکھ سے زاید سپاہی درکار ہیں اُس وقت اُس کے لیے صرف تین لاکھ آدمی کافی تھے۔

اس صورت حال کی تخلیق کا، رواقیت اگر سب سے بڑا باعث نہیں، تو ایک بڑا باعث ضرور تھی۔ اور دوسرے شعبوں میں تو اس کا اثر اور بھی بدیہی و قطعی تھا۔ رواقیت کا ایک اہم اصول یہ تھا کہ حکیم کو ملک کی عملی زندگی میں حصہ لیتے رہنا چاہیے" اس کا قدرتی نتیجہ نکلا کہ رواقیت و طبیعت میں ایک تلازم پیدا ہوگیا۔ اور یہی اندرونی اخلاقی تحریک، جو اشراقیین کو خیالی تصوف میں مشغول رکھتی ہے، اور کتنے ہی لوگوں کو ترک دنیا پر آمادہ رکھتی ہے اُس کا رواقیین پر یہ اثر پڑا، کہ ان میں خدمت ملک و وطن کا سرفروشانہ جوش پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی جبکہ رومیوں سے اُن کے اخلاق ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے تھے جبکہ بیرونی مذاہب، اور غیر ملکی تمدن و تعیش کے متواتر حملوں سے رومی قومیت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، اور جبکہ رومی حریت سیاسی اپنی عمر کی آخری گھڑیاں پوری کر رہی تھی، اگر کوئی جماعت بدستور اپنے قدیم اخلاق پر قائم، اور روایات اخلاقی کی حامل موجود تھی، تو وہ رواقیین ہی کی جماعت تھی۔ انھیں میں فضائل اخلاق مجتمع تھے اور اب درحقیقت فضائل اخلاق، عبارت ہی انھیں کی ذات سے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اُن تمام لوگوں کی مانند جو سیاسیات میں مذہبی غلو سے کام لیتے ہیں، ان میں رواداری و روشن خیالی کی جگہ قدامت پسندی، جمود، و عدم مسالمت تھی، لیکن ان کی ان خامیوں کا نعم البدل اُن کی شریفانہ استقامت و ہمت تھی۔ ان کی معاشرت کی سادگی، ان کی زندگی کی بے لوثی، اور اُن کی موت کی عظمت، نیرو و ڈومیشن کے

عہد مین بھی رومی آزادخیالی کی بات رکھے ہوئے تھی۔ اور جب تک ان کا وجود تھا، یہ کوئی نہین کہہ سکتا تھا، کہ اخلاق پر اجل طاری ہوگئی ہے، کیونکہ ان کی زندگی بجائے خود، نیک کرداری کی ضامن، استبداد کے خلاف ایک حجت قاطع، اور بدچلنی کے خلاف ایک بلند صدائے احتجاج تھی۔

ایک اور طریقے پر رواقیت، رومہ کی حیات اخلاقی کے قیام مین اور بھی زیادہ معین ہوئی، اور وہ رومی قوانین کی وساطت سے۔ علمی زندگی کے ہر شعبہ مین، رومہ و یونان ایک دوسرے کے حریف رہے ہین، اور اپنی اپنی فضیلت کے مدعی۔ لیکن انصاف یہ ہے، کہ جس شعبۂ وحید مین رومہ کو فی الواقع افضلیت حاصل ہے، وہ قانون ہے۔ "ہمارا کام ملکون پر حکومت کرنا ہے" یہ رومیون کا دعوی ان کے شعرا کی زبان سے ادا ہوا ہے، اور اس مین شبہ نہین، کہ ان کی بے نظیر انتظامی قابلیت ان کے اس دعوی کی شاہد عادل ہے۔ قانون کی عزت و تعظیم اُن کا قومی خاصہ تھا جس کی تعلیم وہ بچپن سے پاتے تھے، اور یہ عقیدہ ان کی سرشت کا جزو بن گیا تھا۔ مگر جمہوریت کے زمانے مین جو قوانین وضع ہوئے تھے، وہ چونکہ ایک محدود پیمانے پر، اور صرف مختص القوم و مختص المقام جنگی و مذہبی خصایص کو پیش نظر رکھکر وضع کیے گئے تھے، اس لیے وہ دَور شہنشاہی کے روزافزون سیاسی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی تھے۔ اور اس لیے لامحالہ ان مین تجدید و ترمیم شروع ہوئی، جو آگسطس کے زمانے سے لیکر ہیڈرین و الگزنڈر سیورس کے زمانے تک ہوتی رہی، اور بالآخر تھیوڈسیس و جسٹنین کے قلم سے مکمل ہوئی۔ اس وضع و تاسیس قانون کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ تو بالکل اساسی و بنیادی اصول، اور عدالت و مقننین کے لیے عام ہدایات پر مشتمل تھا، اور جزو دوم مخصوص و متعین دفعات پر شامل تھا۔ اِن مین سے جزو اول تمام تر رواقیت سے ماخوذ اور اسی پر متفرع تھا۔ اور چونکہ رواقیت کا سنگ بنیاد مسئلۂ اخوت

ومساوات انسانی تھا، اس لیے یہی مسئلہ رومی قانون کا بھی اصل الاصول قرار پایا۔ رواقیین اس کے قائل تھے، کہ تمام انسان اصلاً متحد ہیں، اور ذات پات، امارت وافلاس، حکمرانی ومحکومیت، ملکی وغیرملکی، وغیرہ کی مصنوعی تفریقات محض خانہ ساز بندشیں ہیں۔ اس اصول کو رومی واضعان قانون نے بتمامہ لے لیا۔ الپیین (مشہور واضع قانون) کہتا ہے، کہ "جہاں تک قانون فطرت کا تعلق ہے، تمام افراد مساوی ہیں" "فطرۃً ہر شخص آزاد پیدا ہوا ہے" دوسرا مقنن، پال کہتا ہے، کہ "فطرت نے تمام اشخاص کے درمیان ایک رشتہ اتحاد رکھا ہے" ایک اور مقنن فلورنٹیس کے الفاظ یہ ہیں: "غلامی اُس انسانی دستور کا نام ہے جس کی بنا پر، قانون قدرت کے علی الرغم ایک شخص دوسرے پر حکمرانی کرنے لگتا ہے" اسی قبیل کے احکام و اصول سے رومی حکام کو بھی یہ ہدایت کردی گئی، کہ جب کسی مقدمے میں غلامی وحریت کے درمیان اشتباہ پڑ جائے، تو عدالت کو ہمیشہ آخر الذکر کے حق میں فیصلہ کرنا چاہیے۔

رومن قانون پر فلسفہ کا دُہرا اثر پڑا۔ ایک تو اس حیثیت سے کہ اُس کی وضع و نوعیت ہی فلسفیانہ رہی، یعنی یہ نہیں ہوا، کہ مقامی ضروریات کی رفع الوقتی کے لیے کچھ سرسری قواعد مقرر ہو گئے، بلکہ حق و استحقاق کی ماہیت عقلی حیثیت سے طے کر لینے کے بعد تمام کلیات و اصول منضبط کیے گئے۔ اور دوسرے اس لحاظ سے کہ یہ اصول رواقیت ہی کے فروع تھے۔ رواقیت کو رومی حکماء اخلاق میں جو حسن قبول حاصل تھا، نیز قوم کی عملی زندگی میں اُسے جس قدر دخل تھا، اور پھر اس کے مواعظ و کلیات کی انجذابی؛ ان سب چیزوں نے مل کر اُسے قانون کے ساتھ ایسا مدغم و منضم کردیا، کہ پھر ان دونوں میں کبھی افتراق نہ ہو سکا، اور چونکہ رومی قانون تمام دنیا پر محیط ہو گیا ہے، اور اب تک ہے، اس لیے رواقیت سے دنیا کے متمدن کا کوئی قانون غیر متاثر نہیں۔ اور آج دنیا میں جہاں قانون کے پردے میں اخلاق کام کرتا نظر آتا ہے، یہ سب رواقیت ہی کی

صدائے بازگشت ہے۔

اصول رواقیت، عملاً دنیا کے ہر ضابطۂ قوانین پر کس حد تک چسپان ہوتے ہین؟ اس بحث کو چھیڑنا ہمارے فرائض مین داخل نہین۔ اس قدر اشارہ کردینا کافی ہے کہ کوئی شعبہ ایسا نہین، جس کے اصول معدلت وانسانیت کی تہ مین رواقیت کا اثر اپنا کام نہ کر رہا ہو۔ سیاسی زندگی مین ہم دیکھ چکے ہین، کہ رواقیت ہی کے اثر سے رومی شہریت کے حقوق، جو حفاظت خود اختیاری وحقوق قانونی پر مشتمل ہین، کیونکر ایک مخصوص طبقے سے نکل کر تمام آبادی ملک کو ملے۔ اسی طرح خانگی زندگی مین افسر خاندان کو جو اختیارات شروع سے حاصل چلے آتے تھے، اُن پر بھی رواقیت نے کافی اثر ڈالا۔ اور چونکہ اس سے ایک نئے اصول کی بنیاد پڑی، جس پر سارے ملک کی حیات عمرانی قائم تھی، اس لیے ہم چند لفظون مین اس کی تشریح کردینا چاہتے ہین۔

اتنی بات سے ہر شخص واقف ہوگیا، کہ ارتقا، اخلاق مین ترتیباً سب سے پہلے نمبر خانگی فضائل اخلاق کا آتا ہے۔ لیکن اپنے ابتدائی مدارج مین اس قانون کی صرف ایک دفعہ ہوتی ہے، یعنی افسر خاندان کی اطاعت، اور بس۔ رفتہ رفتہ جب جذبات الفت وہمدردی کا نشوونما ہونے لگتا ہے، تو بجائے ایک ہی فریق کے سر ساری ذمہ داری عاید ہونے کے، طرفین پر فرائض کا بار ڈالا جاتا ہے، یہان تک کہ ترقی تمدن کے اقتضا سے بالآخر تمام اعضا، خاندان مین اشتراک، بلکہ ایک حد تک مساوات پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کا ذکر مین تفصیل کے ساتھ کسی آیندہ باب مین کرون گا، کہ بیوی کیونکر ایک غلام محض کی حیثیت سے تدریجاً ترقی کرکے شوہر کی رفیق وہمسر بن جاتی ہے۔ یہان یہ کہنا ہے، کہ ارتقاء تمدن کے ساتھ اولاد کے مرتبہ ودرجہ مین ترقی ہوتی جاتی ہے۔ پہلے سارے فرائض اولاد کے سر، اور سارے حقوق والد کے ہوتے ہین، لیکن بعد کو والد ومولود دونون کے ذمے کچھ کچھ فرائض اور کچھ کچھ حقوق آجاتے ہین۔ پہلے باپ محض حکومت کے لیے

اور بیٹا محض اطاعت کے لیے تھا، لیکن اب حکومت و محکومیت کی جگہ رفاقت، الفت و ہمدردی لے لیتی ہے۔ قدیم روما (و نیز اسپارٹا) مین وہی پرانا دستور تھا۔ یعنی باپ سب کچھ اور اولاد کچھ بھی نہین۔ باپ صرف غیر مسئولانہ حکمرانی کے لیے تھا، اور بیٹا صرف اس لیے تھا، کہ اطاعت و غلامی کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالے۔ رومی مقننین کو فخر تھا، کہ باپ کو اپنی اولاد پر جیسی غیر محدود حکومت ہمارے یہان حاصل ہے، ایسی اور کہین نہین۔ باپ جیسا بھی برتاو چاہے، اپنی اولاد کے ساتھ کرنے کا مجاز تھا، یہانتک کہ اُس کی جان لے سکتا تھا، اور اُس کو اپنی زبان سے اُف تک نہ نکالنا چاہیے تھا۔ اور پھر یہ مطلق العنان حکومت کسی خاص وقت و عمر تک کے لیے نہ تھی۔ بیٹا خواہ کتنا ہی مُسن ہوجاتا، ہمیشہ باپ کا غلام و مملوک رہتا۔ ایک شخص کا سن پچاس ساٹھ سال ہے، وہ صاحب اولاد ہے، حکومت کے کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے، ملکی ذمہ داریون کے بڑے سے بڑے کام سرانجام دیتا ہے، لیکن اگر اُس کا باپ ابھی زندہ ہے، تو اُس کی کوئی مستقل ہستی نہین۔ اُس کی دولت، اولاد، جایداد، بلکہ خود جان تک اُس کی اپنی نہین۔ باپ جب چاہے، اُسے جایداد و دولت سے بے دخل کردے، بلکہ اُس کی جان تک، بغیر خوف بازپرس لیلے۔

اس قانون کے اسقام کھلے ہوئے ہین۔ ہزار ہا نقصان کا ایک سقم یہ ہے، کہ اس کے نفاذ سے خود اسی کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ اس کے جاری کرنے کی غرض تو یہ تھی، کہ خاندان مین خلوص و یکجہتی قایم رہے، لیکن عملاً اسی سے سب سے زیادہ فساد و رنجش پھیلتی تھی۔ درحقیقت اولاد کے دل مین باپ کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی نسخہ ہی نہین، کہ وہ بغیر اُن کے دل کو ہاتھ مین لیے، بغیر اُن کا اعتماد حاصل کیے، اُن پر خود مختارانہ حکومت کرنے لگے۔ اس طرز عمل کے نتائج ہم مین سے ہر شخص اپنی آنکھون سے دیکھ سکتا ہے۔ کتنے گھر ایسے ہین، جو والدین کے اسی

برتاؤ کے باعث خانہ جنگیوں کے آماجگاہ بنے ہوئے ہین! کتنے کنبے ایسے ہین، جو اسی کے ہاتھون اُجڑ گئے! اور کتنے خاندان ایسے ہین جن کے ارکان اسی کے پیچھے ہر طرح کے فساد و رنجش و کدورتون کے مرکز بن گئے ہین! یہی نتیجہ اُس زمانہ مین بھی ظاہر ہوتا تھا۔ ٹائبریس کے عہد کا مورخ کہتا ہے، کہ اُس زمانے مین خود اندرون ملک مین جو جنگین برپا تھین، اُن مین نہایت کثرت سے نظیرین ملتی تھین اُس جان نثاری کی جو بیویان اپنے شوہر پر کرتی تھین، اس وفاداری کی جو غلام اپنے آقاؤن کے ساتھ کرتے تھے، اور اُس غداری و بیوفائی کی جو اولاد اپنے والدون کے ساتھ کرتی تھی۔

رومی خاندانون مین یہ ابتری شائع تھی، کہ رومی سلطنت کے زمانے مین اصلاحات قانونی شروع ہوئین۔ ان اصلاحات کی ایک شاخ یہ بھی تھی، کہ اس خانگی استبداد کا زور ہلکا کر دیا گیا۔ اب جو برتاؤ والدین اور اولاد کے درمیان قرار پایا، اُس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے کہ جہان پیشتر لوگ اولاد کشی کو صبر و سکون کے ساتھ دیکھتے، اور فرط احترام سے زبان نہین کھول سکتے تھے، اب یہ حالت ہو گئی کہ جب اغسطس کے عہد مین اَرکیسو نے اپنے لڑکے کو مارتے مارتے مار ڈالا تو شہر مین ایک بلوہ مچ گیا، اور ارکسو کو اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا۔ ہیڈرین نے اپنے عہد حکومت مین ایک شخص کو جس نے اپنے بیٹے کو قتل کر ڈالا تھا جلا وطن کر دیا۔ بالغ اولاد کو قتل کر ڈالنا، عملاً تو پیشتر سے متروک تھا، لیکن الکزنڈر سیویرس نے باضابطہ اسے ممنوع کر دیا، اور بچہ کشی بھی ناجائز قرار پا گئی۔ اولاد کو اپنی جائداد پر بھی اب کچھ حق حاصل ہو گیا۔ اسی زمانے مین اس کی بھی مثالین ملتی ہین کہ متعدد وصیت نامہ کالعدم قرار دیے گئے، اس بنا پر کہ ان مین اولاد کو محروم الارث کر دیا گیا تھا۔ ڈیوکلیشین نے اولاد فروشی قطعاً ممنوع کر دی اور ہیڈرین نے یہ حکم

نافذ کر دیا، کہ اولاد جو کچھ جنگی خدمات سے کمائے، اس کی آپ ہر طرح مالک و مختار ہے۔ اسے پہلے بھی دو تاجداروں نے بند بند کہا تھا، لیکن ہیڈرین نے اسے بالکل صاف کر دیا۔

اس سے بھی اہم تر قانونی اصلاحات، غلامی کے متعلق ہوئیں۔ غلامی، رومی معاشرت و تمدن کا ایسا جزو بن گئی تھی، کہ وہاں کا تقریباً ہر اخلاقی مسئلہ مسئلہ غلامی سے کم و بیش متاثر ہوتا تھا۔ یہ تو ہم بتا آئے ہیں، کہ غلاموں کی کثرت تعداد اس کا ایک بڑا سبب ہوئی کہ عہد سلطنت کے فلسفۂ اخلاق میں ہمدردی کے دائرے کو وسیع کرے۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہو چکا ہے، کہ آزاد طبقوں کی بدچلنی و بداخلاقی کا بھی خاص باعث یہی غلام تھے۔ اب خاص غلاموں کی حالت پر نظر کرتے ہوئے ہمیں تین مختلف مدارج یا ادوار کا خیال رکھنا چاہیے۔

(۱) دور اول، جمہوریت کے ایام ابتدائی کے معاصر ہوا ہے۔ اس زمانے میں افسر خاندان اپنے غلاموں پر حاکم مطلق تھا، لیکن حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ یہ استبداد کچھ بہت زیادہ مضرت رساں نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک تو غلاموں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ ہر آقا کے پاس صرف دو ایک غلام ہوتے تھے، جو کاشتکاری میں اس کے کام میں حصہ لیتے تھے، اور جب وہ جنگی خدمات پر باہر چلا جاتا تھا، تو اس کی غیبت میں اس کی جائداد کا انتظام کیا کرتے تھے۔ پھر معاشرت میں تکلفات ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے، اس لیے آقا کو اپنے غلاموں سے قدم قدم پر سابقہ رہتا۔ دونوں محنت ساتھ کرتے، غذا ایک کھاتے، اور جتنی حکومت آقا کو غلاموں پر حاصل ہوتی، وہ وہی ہوتی جو اسے خود اپنی اولاد پر حاصل رہتی۔ ان حالات کی بنا پر آقایانہ استبداد کے ہولناک نتائج زیادہ نہیں پھیل سکتے تھے۔ بلکہ غلاموں کی حمایت میں اس طرح کے مذہبی افسانے بھی مشہور تھے، کہ ہر قلب مشقت کا دیوتا

غلامون پر خاص نظر عنایت رکھتا ہی؛ یا یہ کہ اسپارٹا مین چند غلامون کے دغا بازانہ قتل پر زہرہ کو ایک بار اتنا غصہ آیا، کہ اس نے ایک سخت زلزلے سے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی؛ یا یہ کہ خود روما مین ایک مرتبہ عطارد نے خواب مین کسی شخص کو یہ ہدایت کی، کہ سینٹ کو غلامون کے بابت ظالمانہ برتاو پر غیظ ربانی سے مطلع کر دے۔ بعض مذہبی تہوارون کے دن غلام کاشتکارانہ مشقت سے معاف رہتے اور جو دو تہوار خاص غلامون کے لیے مخصوص تھے، ان مین روما مین غیر معمولی پیمانے پر جشن ہوتے، جن مین غلام و آقا ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتے۔ بااینہمہ ظلم و شقاوت کے واقعات کبھی کبھی پیش ہی آجاتے، کیونکہ قانوناً تو کوئی ان پر گرفت تھی نہین۔ کیٹو اول، جسے اس دور کے رومیون کا نمونہ سمجھنا چاہیے، کہتا تھا، کہ غلام محض افزایش ثروت کا ایک آلہ ہین۔ اور اپنی تقریر و نیز طرز عمل سے برابر یہ ترغیب دیتا رہتا تھا، کہ جب غلام ضعیف و ازکار رفتہ ہو جائین، تو انھین فروخت کر ڈالنا چاہیے۔

(۲) دور ثانی۔ یہ وہ زمانہ ہی، جبکہ رومیون کے فتوحات وسیع ہو رہے تھے، اور ان کی حکومت دور دراز ممالک تک پہونچ چکی تھی۔ یہ دور غلامون کے لیے انتہائی جور و تشدد کا ہوا ہی۔ پہلے غلام تعداد مین صرف چند تھے، اب وہ حد شمار سے خارج تھے پہلے رومیون کا طرز معاشرت بالکل سادہ تھا، اب اس مین تکلف و تعیش پیدا ہو گیا تھا۔ غرض اس طرح مختلف حالات کے تغیر سے آقاؤن کے استبداد مین بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ اب رومیون کی مذہبیت مین بھی ضعف آگیا تھا، اور سفاکی کے روز افزون شوق نے اُن مین درد و تکلیف کے نظارون کی طرف سے بیحسی پیدا کر دی تھی۔ اسی زمانے مین سسلی و اسپارٹا مین غلامون نے علم بغاوت بلند کیا، اور اس سے تمام اٹلی مین ان کی طرف سے نفرت و عداوت کا جذبہ موجزن ہو گیا

اب رومہ مین یہ ایک عام کہاوت ہوگئی، کہ دشمنون کی تعداد معلوم کرنا ہو تو غلامون کو شمار کر لو۔ بربری اسیرون کو سخت سے سخت دہشتناک سزائین ملتی تھین، اور ہزارہا باغی غلام بغاوت کے الزام مین سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اسی زمانے مین آقاؤن کی تحفظ جان کے لیے ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے جب کوئی آقا قتل ہو جاتا، تو اس کے تمام غلامون کو، بشرطیکہ وہ بیماری یا قید کی وجہ سے قطعاً معذور نہ ہوتے، سزاے موت دیدی جاتی۔ اسی طرح اور صدہا ستم، ان غریبون کی جان پر توڑے جاتے۔ ایک مرتبہ فلامینیس کے یہان کوئی مہمان آکر اُترا، اُس کی تفریح کے لیے میزبان نے مہمان اور سامان کیے، وہان ایک غلام کے ذبح کیے جانے کا بھی تماشا اُسے دکھایا۔ ویڈیس پولیو نے مچھلیان پالین، اور ان کا طعمہ اپنے غلامون کا گوشت قرار دیا۔ اغسطس کا ایک شامت زدہ غلام اس کی ایک عزیز بٹیر کو مار کر کھا گیا، اس جرم مین اُسے سولی دی گئی۔ یہ چند واقعات، نمونہ ہین اُس برتاؤ کے، جو اس دور مین غلامون کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ جمہوریت کے اواخر اور اوائل شہنشاہی مین اس طرز عمل کا دائرہ اور وسیع ہوگیا۔ غلامون کی شادی قانوناً ناجائز قرار پائی، اور ان کے ساتھ حرامکاری، تعدد ازواج، وغیرہ بے معنی الفاظ رہ گئے۔ عدالتون مین ان کی شہادت ناقابل قبول قرار پائی، بجز اس صورت کے کہ وہ کسی تعذیب مین گرفتار ہون۔ ان شامت زدون کو سزاے موت بھی عجیب ہولناک طریقے پر دی جاتی تھی یہی نہین کہ وہ قتل کر دیے جائین، بلکہ طرح طرح کے آزار دیکر ہلاک کیے جاتے تھے۔ اِن کی خوابگاہین عموماً وہ زندان ہوتے تھے، جو ہر آقا کے گھر مین ہوا کرتے تھے۔ ضعیف و از کار رفتہ ہو جانے کے بعد انھین جزیرہ ٹائبیر مین بے آب و دانہ چھوڑ دیا جاتا تھا، کہ وہین مرین۔ دروازہ پر یہ دربان مقرر کیے جاتے تھے مگر پابہ زنجیر۔ کھیتون مین ان سے ہل چلائے جاتے تھے، مگر اس طرح کہ ان کے ہاتھ پیر

زنجیرون کے وزن سے فگار ہوئے تھے، جو اتنی بڑے بڑے سوئے ان کے جسم مین چبھو دیتین، اور ان کے چہرے کے گوشت کو پھاڑتین - آقا کو اپنے غلامون پر ہر طرح کا تصرف و اختیار حاصل تھا، چاہے انھین بطور سیاست کے فروخت کر ڈالے اور چاہے جنگلی جانورون سے لڑنے کے لیے -

ان حالات کو پڑھ کر ناظرین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہون گے لیکن انھین تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی نظر رکھنا چاہیے - بات یہ ہے کہ بعض مسیحی مصنفین قصداً بت پرستی کی تصویر اس قدر تاریک کر کے دکھاتے ہین، کہ اس کے مقابلہ مین مسیحی اصلاحات کی بیحد افضلیت ثابت ہو، اور اس غرض کے لیے وہ صرف اپنے موافق مطلب واقعات کو چن لیتے ہین، اور باقی کو نظر انداز کر جاتے ہین، حالانکہ دیکھا جائے، تو واقعات دونو طرح کے مل سکتے ہین - بلکہ میرے خیال مین اگر وہ بے کم و کاست، اصلی واقعات کو بجنسہ نقل کر دین، تو رومی زندگی کی تصویر پھر کر اس قدر بدنما نہ معلوم ہو گی - اس مین شک نہین، کہ جس طرح کے واقعات ہم نے اوپر بیان کیے، برابر پیش آتے رہتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہین، کہ ہمیشہ اسی قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے، اور یہ اُس زمانے کی عام حالت تھی - مثلاً ایک مسئلہ ازدواج ہی کو لیجیے - یہ سچ ہے کہ قانون غلامون کی شادی کے جواز کا منکر تھا، لیکن قانون اگر منکر تھا، تو رواج تو منکر نہ تھا رسم و رواج کی بنا پر برابر غلامون کی شادیان ہوتی رہتی تھین، اور کوئی نہین کہتا تھا یا پھر جائداد کے بارے مین بھی اصل واقعہ یہ ہے کہ غلام اپنی زندگی بھر اپنی کمائی کے آپ مالک ہوتے تھے، البتہ اُن کی وفات کے بعد وہ جبراً یا کلاً آقا کی جانب منتقل ہو جاتی تھی، گو بعض بعض آقا، اپنے غلامون کو اس کا بھی مجاز کر دیتے تھے، کہ جس کو چاہین اپنی جائداد وصیت کر جائین - غلامون کی آزادی کوئی نادر واقعہ نہ تھی، بلکہ اس کثرت سے ہوتی رہتی تھی، کہ آزاد شدہ غلامون کی تعداد سے سارا ملک بھر گیا تھا

سسرو کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہی کہ ایک محنتی اور وفادار غلام عموماً چھ سال کی مدت مین اپنی آزادی خرید سکتا تھا۔ بے شبہ وقتہً فوقتہً انتہائی ظلم و شقاوت کے مناظر بھی رونما ہو جاتے تھے، لیکن رائے جمہوران کے بالکل مخالف ہوتی تھی، بلکہ بقول سنیکا، ظالم آقا، راستون مین انگشت نما اور ذلیل کیے جاتے تھے۔ غلامون کے سپرد جو خدمات تھین، وہ بھی کسی طرح ذلت آمیز نہین کہی جا سکتین، غلام طبیب ہوتے تھے، غلام لڑکون کے اتالیق ہوتے تھے، غلام نقاش ہوتے تھے، جن کی صناعی پر سارا شہر فریفتہ رہتا تھا، غلام آقاؤن کے ساتھ گویا ارکان خاندان بن جاتے تھے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، ان کے اُن کے شادی وغمی مین اشتراک ہوتا تھا۔ سسرو کے غلام ٹائیرو نے اپنے آقا کے مکاتیب جمع کر کے شایع کیے۔ ان مکاتیب مین بعض جگہ سسرو نے انتہائی محبت کے القاب کے ساتھ اپنے غلام کو مخاطب کیا ہی۔ پلینی کے اُس خط کا ذکر اوپر گزر چکا ہی جس مین وہ اپنے بعض غلامون کی وفات پر شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہی، اور اپنے تئین اس خیال سے تسلین دیتا ہی، کہ وہ انھین کچھ پیشتر آزاد کر چکا تھا۔ اپکٹیٹس ابتدائً غلام تھا، مگر چند ہی روز مین بادشاہ کا جلیس و رفیق ہو گیا۔ غلامون کے تشدد سے یقیناً آقاؤن کو اپنے کام مین بہت مدد ملتی ہوگی۔ لامحالہ کبھی کبھی جور و تشدد بھی ہوتا ہوگا، لیکن اس کے لیے قانونی مواخذہ کا خوف موجود تھا، اور ایسا بہت کم واقع ہوتا تھا۔ اس مین بھی شک نہین کہ غلامون کی ذات سے بہت کچھ بدچلنی کی تحریک ہوتی تھی، مگر اس سے بھی انکار نہین ہو سکتا، کہ روما کی اندرونی جنگ کے موقع پر غلامون کی وفاداری و پاس نمک کے ہزارہا شواہد ملتے ہین۔ ایسے ایک دو نہین، پچاسون واقعے تاریخ مین موجود ہین، کہ غلامون نے حصول آزادی سے انکار کر دیا، سخت سے سخت عذاب سہ لیے، اپنی جانون کو خطرہ مین ڈال دیا، لیکن اپنے مالک کی رفاقت سے

منھ نہ موڑا، بلکہ اکثر انھین اس کے معاوضہ مین واقعۃً جان دیدینا پڑی۔ اِن مثالون سے ثابت ہوتا ہی، کہ آقاؤن کا برتاؤ عموماً ہرگز اس قدر ظالمانہ نہ تھا، کہ غلامون کے دل مین ان کی طرف سے کوئی جگہہ نہ باقی رہ جائے، اور ضد، عداوت، و نفرت سما جائے۔

"غلامون کے ساتھ عدل وانسانیت سے پیش آنا چاہیے" یہ ایک ایسا مسئلہ تھا، جو تمام حکماء کے نزدیک متفق علیہ و مؤکد تھا۔ فلاطون وارسطو، زینو وابیکورس اس باب خاص مین سب متحد تھے۔ رواقیہ کی تعلیمات مین اس فرض کو ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی، اور سنیکا کے صفحات مین بار بار اس طرح کی ہدایات ملتی ہین، کہ "دنیوی مرتبہ و وجاہت سے نفس انسانی کے حقیقی شرف وعظمت پر کچھ اثر نہ پڑنا چاہیے" "یہ بالکل ممکن ہی کہ مالک بند معاصی مین گرفتار، اور مملوک اپنے فضائل اخلاق کے لحاظ سے آزاد ہو" "مالک کو نہ صرف ظلم وجبر سے محترز رہنا چاہیے بلکہ اپنے غلامون کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ بھی نہ کرنا چاہیے" وغیرہ بعض مصنفین اس طرف گئے ہین، کہ یہ مواعظ مسیحیت کی تعلیمات کا نتیجہ ہین، لیکن یہ صحیح نہین درصل، یہ سب یونانیون کی تلقین کا اثر تھا، خصوصاً زینو کی تلقین کا، جس نے بعثت مسیح سے مدتون پیشتر اپنا مقولہ یہ رکھا تھا، کہ "فطرۃً تمام انسان مساوی الرتبہ ہین۔ فارق جو شی ہی، وہ اخلاق کے مدارج ہین"۔ انٹونائیس کے زمانۂ امن کے بعد اس تحریک نے اور زور پکڑلیا، اور عجیب بات یہ ہی، کہ خود مستبد قیاصرہ کا استبداد اس کا معین ہوا۔ یہ یون ہوا، کہ یہ سلاطین ہروقت اپنی جان کے خلاف سازشون سے خائف رہا کرتے تھے۔ اس کے لیے ضرور ہوا، کہ یہ جاسوسون اور مخبرون کی ایک بڑی جماعت لگائے رکھین، اور چونکہ یہ ظاہر تھا، کہ جاسوسی ومخبری کی خدمت کو غلامون سے بہتر کوئی انجام نہین دے سکتا تھا، اس لیے لامحالہ حکومت کی

طرف سے ان کی حمایت و سرپرستی ہونے لگی۔

(۳) دورِ ثالث۔ یہان سے غلامی کی تاریخ کا تیسرا باب شروع ہوتا ہے۔ حالات بالا کی بنا پر اب قانون بھی غلامون کی حمایت و تحفظ حقوق پر مستعد ہو گیا۔ پٹرونین قانون، جو غسطس یا نیرو کے زمانے مین نافذ ہوا، اُس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ تاوقتیکہ عدالت اس کی باضابطہ اجازت نہ دیدے، کسی آقا کو یہ حق نہین کہ اپنے غلامون کا جنگلی جانورون سے مقابلہ کرلئے۔ کلاڈیس کے زمانے مین بعض لوگون نے اپنے بیمار غلامون کو جزیرۂ عسقلبیوس مین تنہا چھوڑ دیا تھا، اس پر بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا، کہ اگر وہ غلام زندہ بچ جائین، تو آزاد ہین، اور اگر مرجائین تو آقاؤن پر قتل عمد کا مقدمہ چلایا جائے۔ ان قوانین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے مین غلامون کی جان لینا قانوناً ممنوع ہوچکا تھا۔ اسی زمانے مین یہ دستور بھی قائم ہو گیا، کہ جو غلام، بادشاہ کے مجسمہ کے نیچے آکر پناہ لیتا تھا، اُسے پناہ مل جاتی تھی۔

نیرو کے عہد مین ایک عدالت خاص غلامون ہی کے استغاثون کے لیے قائم کی گئی، جس کا کام اُن آقاؤن کو سزا دینا تھا جو غلامون کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے، یا انھین اپنی شہوت رانی کا آلۂ قرار دیتے تھے، اور یا اُن پر ضروریات زندگی کے بارے مین تنگی کرتے تھے۔ اس کے بعد کچھ روز تک سکون رہا۔ لیکن ڈومیشین کے عہد مین پھر ایک قانون جاری ہوا، جس کا منشا یہ تھا، کہ غلامون کو مخنث بنانے کا دستور موقوف ہو، اور انٹونائنس کے زمانے مین ان اصلاحات کی ازسرنو تجدید ہوئی۔ ہیڈرین اور اس کے جانشینون نے یہ قانون جاری کیا، کہ آقاؤن کو اپنے غلامون کے ہلاک کرنے، یا بطور سیاقون کے فروخت کرڈالنے کا کوئی اختیار نہین، اُن کے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آنا جرم ہے، اور جب کبھی کسی غلام پر ایسی سختی ہو، تو آقا اس بات پر مجبور ہوگا کہ اُسے فروخت کرڈالے۔ اسی زمانے مین،

غلامون کی شکایات سننے کے لیے صوبہ دار علیحدہ علیحدہ عدالتین قائم ہوئین ہر گھر مین جو ایک خانگی زندان قائم رکھنے کا دستور چلا آتا تھا، یہ مٹا دیا گیا، اور بجاے کسی مقتول آقا کے قصاص مین اس کے تمام غلامون کو ہلاک کیے جانے کے، اب یہ قاعدہ جاری ہوا، کہ صرف انھین غلامون سے قصاص لینا چاہیے ہی، جو آقا کے اس قدر متصل ہون، کہ اُس کے قتل کے وقت اُسکی چیخ کو سُن سکتے ہون۔ یہ صرف قانونی تحریرین ہی نہ تھین، بلکہ ان پر عملدرآمد بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ ہیڈرین کے زمانے مین ایک خاتون کو اس جرم مین پانچ سال کی جلاوطنی جھیلنا پڑی، کہ وہ اپنے غلام کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئی تھی۔ غرض یہ کہ بہ حیثیت مجموعی، یہ نہین کہا جا سکتا، کہ رومی غلامون کی حالت مسیحی قومون کے مقابلے مین کچھ بھی ابتر تھی۔

فلسفۂ رواقیت کا رومی قانون پر جو گہرا اثر پڑا، اس کا اندازہ تصریحات بالا سے ہوا ہوگا، لیکن ابھی یہ بتانا باقی ہی کہ یہ اثر صرف قانون کے دائرے تک محدود نہ تھا، بلکہ مختلف ومتعدد راستون سے رومی سیرت تک آیا تھا۔ گھر مین جب غمی ہو جاتی ہی، تو انسان کی طبیعت مین ایک خاص گداز پیدا ہو جاتا ہی، اور راہ ہدایت کے قبول کرنے کی صلاحیت واستعداد غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہی۔ ایسے اہم موقع پر یہ فلاسفہ کا کام ہوتا، کہ وہ آکر پسماندگان کو تسکین دین، اور تلقین صبر کرین۔ اکثر اشخاص اپنی جانکنی کے وقت بھی تسلی پانے کے لیے انھین فلاسفہ کو بلاتے تھے، جو اُن کی آخری گھڑیون کو خوشگوار بناتے تھے۔ بہت سے لوگ جب کسی معصیت شدید کے مرتکب ہو بیٹھتے، تو ہجوم یاس یا فرط پشیمانی مین انھین فلاسفہ سے استمداد کرتے۔ یا جب عملی زندگی مین کوئی نازک و دقیق اخلاقی مسئلہ نہ حل ہوتا، تو بھی فلاسفہ ہی کی طرف رجوع کیا جاتا۔ بچون کی تعلیم و اتالیقی بھی عموماً انھین کے ہاتھ مین تھی۔ یہ لوگ مختلف

معاصی سے مصلحات، اور مختلف امراض اخلاقی کے علاج تیار رکھتے تھے، اور ہر شخص کے مزاجی خصوصیات اور ہر موقع کی مناسبت کو ملحوظ رکھ کر ان کا استعمال کرتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا تھا، کہ بار ہا بڑے سے بڑا بدکار شخص ان کے مواعظ سے متاثر ہو کر اپنے گزشتہ افعال سے صدق دل سے تائب ہو جاتا، اور بہ کمال خلوص ان کا تلمذ اختیار کر کے آگے چل کر خود بھی صاحب اخلاق و برگزیدہ صفات ہو جاتا جس طرح آج عیسائی گھرانوں سے متعلق ایک خاندانی پادری ہوتا ہے، اسی طرح اس زمانے مین اکثر خاندانون مین یہ دستور تھا، کہ گھر پیچھے ایک مخصوص فلاسفر ہوتا تھا جو اس گھر کے بسنے والون کی اخلاقی زندگی کی صحت کا ضامن و محافظ تھا، اور بازار مین وعظ کہنا اور اخلاق کی منادی کرنا تو ان فلاسفہ کا عام شیوہ تھا۔

لیکن یہ مبلّغین و منادٗ، دو بالکل مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے، جن کے درمیان کوئی شے قدر مشترک نہ تھی۔ اصول، معتقدات، طریق کار، طرز معاشرت، غرض ایک ایک بات مین ہر فرقہ دوسرے کی ضد تھا۔ اول الذکر فرقہ کے افراد، جنھین "راہبان رواقی" کا موزون لقب دیا گیا ہے، گروہ کلبیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی زاہدانہ زندگی، جسے ہمہ تن رہبانیت کہنا چاہیے، اور مسیحی راہبون کی زندگی مین عجیب طرح کا اشتراک و توافق ہے۔ فرقۂ کلبیہ کے متبعین کے لیے شرایط ذیل لازمی تھے:۔

(۱) کلبی کو اپنا نصب العین، خلقت کی اصلاح قرار دینا چاہیے۔

(۲) اُسے صرف اسی کو اپنا فرض سمجھنا چاہیے، اور اس کے مقابلے مین کسی شی کی پروا نہ کرنا چاہیے۔ خوف و طمع دونون سے اسے غیر متاثر رہنا چاہیے بڑے سے بڑے شخص کو اُسے سر راہ بلا تامل ٹوک دینا چاہیے۔ لوگ اُسے بنائین، ذلیل کرین، اُس پر آوازہ کسین، اُسے گالیان دین، مارین، پیٹین، اُسے

یہ سب بہ خوشی برداشت کرنا چاہیے، مگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دامن کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

(۳) اُسے اپنی جان کی مطلق پروا نہ ہونا چاہیے۔ اُسے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ جان اُس کی اپنی ہی نہیں، بلکہ محض ایک امانت الٰہی ہے، جسے اس کا مالک حقیقی جس گھڑی اور جس طرح چاہے، واپس لے سکتا ہے۔

(۴) اُسے دنیا کی کسی شے سے لوث نہ ہونا چاہیے۔ شادی کرنا اُس کے لیے حرام ہے کہ اس سے دنیا کے ساتھ وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) اُسے اپنے جسم کو سخت سے سخت ریاضتوں اور مشقتوں کا خوگر بنانا چاہیے۔ آرام و عیش ہر طرح کا اُس کے اوپر حرام ہے۔ اُسے ہمیشہ بلا فرش و بستر ننگی زمین پر سونا چاہیے۔ موٹے سے موٹا کپڑا پہننا چاہیے، اور موٹے سے موٹا کھانا کھانا چاہیے۔

(۶) باایں ہمہ اُسے ہمیشہ ہشاش بشاش رہنا چاہیے۔ کبھی مغموم، مضمحل و افسردہ نہ رہنا چاہیے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ تکلیف سے آرام حاصل کرے، اور مشقت کو عیش سمجھے، تکلیف کو تکلیف سمجھ کر برداشت کیا، تو کیا کیا۔

(۷) اُسے تمام مردوں کو مثل اپنی اولاد کے، اور تمام عورتوں کو مثل اپنی بیٹیوں کے سمجھنا چاہیے۔ سب کے ساتھ یکساں لطف شفقت، و اخلاق سے پیش آئے۔ کسی سے دشمنی، ناراضگی، کینہ و حسد نہ رکھے۔

(۸) جو لوگ اُسے ستاتے ہیں اُن سے اُسے خاص کر شفقت و لطف کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

(۹) اس فرقہ میں صرف انھیں لوگوں کو داخل ہونا چاہیے، جنھیں اپنی قوت استقلال، ہمت، و استقامت پر پورا اعتماد ہو، اور جو یہ اعتقاد کامل رکھتے ہوں

کہ وہ اسے زندگی بھر نباہ لے جائین گے۔ جو لوگ اس بار کا آخر وقت تک تحمل نہین کر سکتے، جو آدھے راستے سے پھر پلٹ جانے والے ہین، انھین ہرگز اس کوچہ مین قدم نہ رکھنا چاہیے۔ ایسے لوگون کے لیے نہایت شدید و ہولناک عذاب الٰہی تیار ہی، جس سے انھین ڈرنا چاہیے۔

کلبیہ کے اصول وطرز عمل کا حال معلوم ہو چکا۔ اب آئیے، ذرا دوسرے گروہ کی حالت پر نظر دوڑائیے۔ یہان قدم قدم پر پہلے گروہ کا بالکل عکس نظر آئے گا۔ وہان جیسی سادگی تھی، ویسا ہی یہان تکلف و تعیش کا سامان موجود ہی۔ وہان خشکی تھی یہان رنگینی ہی۔ وہان زہد تھا، یہان رندی ہی۔ وہان فاقہ مستی تھی، یہان دولت و امارت کے قصر کھڑے ہوئے ہین۔ اُدھر صاف گوئی و آزادبیانی تھی، ادھر لسانی و چرب زبانی کے دریا بہ رہے ہین۔ غرض یہ گروہ ہر حیثیت سے فرقۂ سابق الذکر سے متغایر و متناقض تھا۔ بات یہ ہی کہ یہ جماعت خطیبون کی تھی، یعنے ایسے اشخاص کی جنھون نے خطابت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ ان لوگون کے اخلاق تو علی العموم سخت مکروہ ہوتے تھے، لیکن یہ لسّان غضب کے ہوتے تھے، اور اپنی اسی چرب زبانی سے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ اور اپنے سے متاثر بنائے ہوئے تھے۔ یہ جہان کھڑے ہو جاتے، سننے والون کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے، اور انھین حاضرین پر اتنا قابو حاصل ہو جاتا، کہ جس رُخ چاہتے، انھین پھراتے۔ یہ علی العموم صاحب ثروت و مالک جایداد ہوتے، جو اکثر دورہ کرتے رہتے۔ جس شہر مین جاتے، ہاتھون ہاتھ لیے جاتے، اور ان کے آگے روپیون کے ڈھیر لگ جاتے۔ عموماً ان کا موضوع تقریر کوئی بہت حقیر شی ہوتی، مثلاً چوہا، طوطا، مکھی، مٹی، وغیرہ اور ان کا کمال یہ تھا کہ ایسے ہی معمولی عنوانات پر تقریرین کر کے اپنی سحر بیانی سے لوگون کو دنگ کر دیتے۔ بعض ان مین سے یہ بھی کرتے، کہ کسی علمی مسئلہ کے کمزور پہلو یا کسی بدیہی غلطی کی حمایت پر

کھڑے ہو جاتے اور خطابیات کے زور سے اسی کو حاضرین کے ذہن مین صحیح ثابت کر دیتے۔ گویا جھوٹ کو سچ کر دکھانا، ان کا اصلی کمال تھا۔ اور یہ لوگ اثر ڈالنے کے بھی جتنے طریقے ممکن ہین، سب کو کام مین لاتے تھے۔ لب و لہجہ، حرکات و سکنات، لباس، بالون کی وضع، غرض ہر ایسی شی مین جس کا کچھ بھی اثر سامعین پر پڑ سکتا تھا، یہ اُس کو موثر بنانے مین پورے اہتمام سے کام لیتے تھے۔ ان مین سے بعض ازبر کیے مضامین سناتے، اور بعض برجستہ تقریرین بھی کر سکتے۔ یہ جب چلتے، تو اتباع و خدام کا پورا حلقہ جلو مین ہوتا، اور مختلف شہرون سے ان کی دعوتین آتین۔ کہین اس غرض سے کہ یہ وہان کے فرمان رواکے سامنے وہان کے ٹکس کی سختیون کو بیان کرین، اور کہین اس واسطے کہ کسی ملزم کی بریت کے لیے عدالت مین پیروی کرین۔ مختصر یہ کہ ان کا بھی حلقہ اثر نہایت وسیع تھا اور لوگون کی تعلیم و تربیت، نیز تشکیل مذاق مین ان کے اثر کو بہت بڑا دخل تھا۔

بعض فلاسفہ کا شروع سے یہ طریقہ چلا آتا تھا، کہ اس جماعت مین داخل ہو کر اپنے معتقدات و تعلیمات کی اشاعت خوب سرگرمی سے کرتے تھے۔ فلیپس و انٹونائنس کے زمانے مین لسے ترقی ہوتی رہی، اور جب سے ہیڈرین، ویسپسین، و مارکس آریلیس نے فلاسفہ و خطیبون کو بیش قرار معاوضہ پر پروفیسر مقرر کرنا شروع کیا، تب سے فلسفہ و خطابت کا اتحاد اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اس طرح کے فلسفی خطیبون مین سے دو شخصون کے خطبات ابتک موجود ہین، اور انھین دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ خطبات کس قدر بلند پایہ ہوتے تھے۔ ان مین سے ایک تو اشراقی حکیم، میکزمس آف ٹایر ہوا ہے۔ اس کے خطبات کے چند عنوانات یہ ہین:۔ عملیت و خلوت گزینی کا موازنہ، سقراط کی روح، فریضۂ دعا، اشراقی عقیدۂ وجود باری، غایت فلسفہ، عشق و اخلاق، وغیرہ۔ دوسرا شخص، رواقی، ڈیون کریزوسٹم تھا۔ یہ اپنے خطبات مین توحید کامل کی تعلیم دیتا ہے۔

بت پرستی و عبادت کے باہمی تعلقات دکھاتا ہے، غلامون کے ساتھ شفقت و رافت سے ساتھ پیش آنے پر زور دیتا ہے، اور موروثی غلامی کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس کی زندگی نہایت ہی با اخلاق و پُر از واقعات گزری ہے۔ یہ ابتدا مین بہت ہی مشہور و کامیاب خطیب تھا۔ اُس کے بعد کچھ تو ذاتی مصائب اور کچھ افلاطون کی تصانیف کے اثر سے، اس نے اپنے اس پیشے کو ترک کر کے خدمت خلق کا بیڑا اُٹھایا۔ کوئی غریب ڈومیٹین کے استبداد کا شکار ہو رہا تھا، اس کی حمایت مین اس نے پُر زور تقریر کی، نتیجہ یہ ہوا، کہ اسے خود جلا وطن ہونا پڑا۔ اب یہ حالت تھی کہ تن پر گداگری کا لباس تھا، اور زاد سفر مین افلاطون کا ایک مکالمہ اور ڈیماس تھینز کا ایک خطبہ تھا۔ اس حال مین یہ روم سے نکلا، اور مدتون دور دراز ممالک مین پھرتا رہا۔ جہان کہین جاتا، اصلاح اخلاق پر وعظ کرتا، لیکن اس کا کچھ معاوضہ نہ لیتا، بلکہ دستکاری کر کے رزق کماتا۔ یونانی نو آبادیون کے باشندے، بلکہ خود بربری قبائل تک اس کی باتون سے متاثر ہوئے۔ ڈومیٹین کے قتل کے بعد افسران فوج اس باب مین متردد تھے کہ نروا کو بادشاہ بنائین یا نہ بنائین، لیکن اس کی جادو بھری تقریر نے ان کے شک و تذبذب کا خاتمہ کر دیا۔ اسکندریہ و ایشیاے کوچک کے بعض شہرون مین اس نے متعدد بار بغاوتون کو فرو کیا۔ ایک بار ہومر کے ایک شعر کو عنوان قرار دیکر اس نے شہنشاہ ٹریجن کے سامنے فرایض جہانبانی پر وعظ کیا۔ اس کی طبیعت مین گو آخر تک خطیبانہ مذاق کی جھلک باقی رہی، تاہم اس مین شک نہین، کہ اسے جو مختلف ممالک مین حسن قبول حاصل تھا، اُسے اس نے بجاے اپنے ذاتی منفعت کے، عقاید رواقیت کی اشاعت و تبلیغ مین صرف کیا، کہ یہی اُس نے اپنی زندگی کا مقصود قرار دے لیا تھا۔

ان دو کے علاوہ چند اور خطیبون مثلاً اٹیکس، فیورنیس، فرونٹو، ٹارس،

فیسیانس، وجولیانس کے بھی نام آتے ہین، اور کہین کہین ان کے جستہ جستہ اقتباسات پر بھی نظر پڑجاتی ہے۔ ان مین سے ہر شخص کے گرد اُس کے تلامذہ و معتقدین کا ایک وسیع حلقہ رہا کرتا تھا، اور ملک کی علمی زندگی کو جس قالب پر یہ ڈھالنا چاہتے تھے، ڈھالتے تھے۔ بہ طور نمونے کے ہم ان مین سے ایک شخص آلس گیلیس کو لیتے ہین۔ اس کی تصنیف کا بعض حیثیات سے بالکل وہی انداز ہے جو انقلاب فرانس سے کچھ ہی پیشتر کے فرنچ مصنف ہلویشیس کا تھا۔ ہلویشیس کوئی دقیق النظر حکیم نہ تھا، اور نہ اُسے کوئی اخلاقی عظمت حاصل تھی، مگر دیکھو، کہ مختلف فنون کی جامعیت، اعلیٰ انشاپردازی وخطابت، جدت پسندی وطرز بیان کی صفائی نے اُس کی تصنیف کو کیسا شاندار بنا دیا ہے۔ وہ کہین ضخیم مجلدات کے حوالے نہین دیتا، بلکہ ہر مثال، یہی روزمرہ کے معمولی حالات اور گرد وپیش کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لاتا ہے۔ گویا اُس کی تصنیف اس کی گرد وپیش کی سوسائٹی اور اس کی معاصرانہ اجتماعی زندگی کا نہایت صاف آئینہ ہے، اور اس حیثیت سے اُس کی نظیر اگر کہین ملتی ہے، تو آلس گیلیس کے یہان۔ اس کے روزنامچہ کے اندراجات وہی مشاہدات ہین، جو روزمرہ اپنی آنکھون سے دیکھتا، اور وہی مسموعات ہین جن کی آواز اُس کے کانون مین ہر وقت آیا کرتی۔ وہ ایک آئینہ ہے جس مین اُس زمانے کے اکابر فلاسفہ کی طرز معاشرت، طریق کار، وسعت اثر، غرض اُن کی زندگی کے ایک ایک خط وخال کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانے مین ہر فلسفی کے گرد اس کے پرجوش معتقدین کا ایک وسیع حلقہ رہا کرتا تھا، جن کے نعرہائے تحسین سے درسگاہ کا کمرہ گونج اُٹھا کرتا تھا اور جو اُسے اپنی زندگی کے ہر شعبہ مین مرشد کل و ہادی سبل سمجھتے تھے۔ اس کا کام یہ تھا کہ ان کے ہر عیب پر انھین ٹوکتا، ان کے گاڑھے وقت مین ان کے کام آتا، اور

ہر وقت ہر طرح پر ان کی امداد و اعانت کے لیے تیار رہتا۔ ٹارس، تھیورنیس، فرنٹو، واٹیکس کا شمار مشہور ترین حکما مین ہوتا تھا۔ ان مین سے ہر ایک کے گرد وفا شعار، پُرجوش، و مخلص شایق علم نوجوانون کی ایک جماعت رہا کرتی تھی، دران حالیکہ سارا ملک بد مذاقی و بدچلنی کی پستی مین پڑا ہوا تھا۔ ملک مین کسی قسم کا اعلیٰ علمی مذاق باقی نہین رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ترقی علم و کمال کے دن ختم ہو چکے ہین، اور ایک صرف اسلاف پرستی و استخوان فروشی کا مشغلہ باقی رہ گیا ہے۔ علما کا کام صرف یہ تھا، کہ قدیم کتابون کے شروح و حواشی لکھا کرین، قوت اجتہاد معدوم ہو گئی تھی۔ کوئی نیا مسئلہ پیدا کرنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا، قدامت پرستی و جمود ہر شی پر طاری تھا۔ ذوق اس قدر فاسد ہو گیا تھا، کہ اینیس کو ورجل سے بہتر شاعر، اور کیٹو کو سسرو سے افضل نثر نویس مانا جاتا تھا۔ گفتگو مین بڑے بڑے مغلق و متروک الفاظ ٹھونس دینا، علم و فضل کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ نصاب تعلیم مین سارا زور صرف و نحو اور منطق پر تھا۔ صرف و نحو کے مسائل پر بڑی معرکۃ الآرا بحثین ہوتین، اور منطقی معمون کا حل کرنا مقصود زندگانی سمجھا جاتا۔ شام کے وقت ٹارس کے میز پر جب اس کے تلامذہ تفریح و تفنن کی غرض سے جمع ہوتے، تو ہمیشہ اس طرح کے مباحث چھڑ جاتے:۔

"انسان کو مردہ ٹھیک کس وقت پر کہنا چاہیے؟ آیا اُس کی زندگی کے آخری لمحہ پر؟ یا اُس کی موت کی اولین ساعت پر؟"

"یہ ٹھیک کس وقت کہنا چاہیے، کہ آدمی کھڑا ہو گیا؟ آیا اُس کے چارپائی چھوڑنے کے آخری وقت، یا اُس کے کھڑے ہو جانے کی پہلی گھڑی پر؟"

یا پھر اس طرح کے استدلالات پر داد عقل آزمائی دی جاتی:۔

"جو شے تم سے کبھی ضائع نہین ہوئی، وہ تمھارے پاس موجود ہے؛ سینگ تمھارے سر سے کبھی ضائع نہین ہوئے؛ لہذا تمھارے سر پر سینگ موجود ہین۔"

یا مثلاً

"جو مین ہون وہ تم نہین، مگر مین انسان ہون؛ لہذا تم انسان نہین۔"

وقس علی ہذا۔

اخلاق کی جانب بے شبہ اُنھین دل سے توجہ تھی، لیکن یہان بھی کٹھ حجتی اور قدامت پرستی دامن نہین چھوڑتی تھی۔ کوئی مسئلہ ہو، جب تک قدما کے یہان اس کی حلّت وحرمت، جواز وعدم جواز پر نصّ صریح نہ مل جائے گی، یہ ایک قدم آگے نہ بڑھائین گے۔ ضمیر و فرائض اخلاقی کے مسائل پر یہ خوب اپنی کج بحثیون کی قوت کو صرف کرتے۔

خطیبون اور رواقیون کا اتحاد، اگرچہ رواقیت کو مقبول بنانے مین بہت معین ہوا، تاہم دوسری حیثیات سے اس کا اثر بہت مُضر پڑا، بلکہ یہی رواقیت کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کج بحثیان اور دور از کار موشگافیان، رواقیت مین دبی ہوئی تھین، لیکن خطیبون کی تمام تر کائنات یہی تھی۔ اُنھون نے اسے خوب چمکایا۔ پھر انٹونائنیس نے جو فلاسفہ کے لیے بیش قرار وظیفہ ومعاوضہ مقرر کردیے تھے، اس کی طمع مین صدہا مکار آکر فلاسفہ کے حلقے مین داخل ہوگئے۔ ان کے چہرے پر لانبی داڑھیان اور ظاہری وضع و قطع فلاسفہ ہی کی سی تھی، لیکن ان کی خباثت نفس کو معنئ فلسفہ و حکمت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اسی طرح کلابیہ کے گروہ مین بھی ہزارہا بدمعاش شامل ہوگیا تھا۔ یہ لوگ اس فرقۂ محترم کے اس اصول کی آڑ پکڑ کے کہ فلسفی رسم ورواج وعوائد اجتماعی کی پابندی سے آزاد ہوتا ہے، بے تکلف شرم وحیا

تہذیب وشایستگی کے قیود سے آزاد ہوگئے، اور بے دھڑک سیہ کاریون کے مرتکب ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ رواقیت مین گھُن لگنا شروع ہوگیا، اور زیادہ دن نہ گزرنے پائے تھے، کہ لوگون کے دیکھتے دیکھتے یہ آفتاب ڈھل گیا۔ بلکہ جن لوگون کو مارکس آریلیس کی تخت نشینی یاد تھی، انھین کی آنکھون نے یہ نظارہ بھی دیکھا، کہ رواقیت دم توڑ رہی ہے۔ اس کے اسباب وعلل کی تشریح آیندہ دو فصلون مین ملے گی۔

فصل (۷)

مشرقی مذاہب کا پُرجوش استقبال

رواقیت کے اس زوال کے کچھ اندرونی اسباب بھی تھے، مگر ساتھ ہی اُس کے چند زبردست خارجی اسباب بھی تھے، اور بے اُن کو خیال مین رکھے یہ واقعہ پوری طرح سمجھ مین نہین آسکتا۔ سب سے بڑا سبب یہ آپڑا تھا، کہ لوگون کی اعتقادی زندگی مین ایک خاص انقلاب ہو رہا تھا، یعنی لوگون کا رجحان مشرقی مذاہب کی جانب بڑھتا جاتا تھا، اور پلوٹینس، پارفری، وپروکلس وغیرہ کی سرکردگی مین ایک طرح کا تصوف آمیز فلسفہ روز بروز شایع ہوتا جاتا تھا، جو کسی قدر مصری الاصل تھا، اور کسی قدر اشراقیت پر مبنی تھا۔ حیات اعتقادی کا یہ انقلاب ذرا تفصیل سے بیان کرنے والی بات ہے۔

اس کے متعدد اسباب تھے۔ ایک کھلا ہوا سبب تو خود نفس بشری کا یہ خاصہ ہے، کہ جس زور کا عمل ہوگا، اسی قوت کا ردّ عمل بھی ہوگا۔ بہتے ہوئے دریا کی جتنی روک تھام کیجیے گا جب بند ٹوٹے گا، وہ اسی زور وشور سے نکلے گا یہی حال نفس انسانی کا ہے۔ بعض قوی کو آج آپ دباتے ہین، مگر کل جب وہ اُبھرین گے تو یاد رکھیے کہ نہایت خوفناک تیزی کے ساتھ اُبھرین گے۔ تاریخ ہر زمانے مین

اس سبق کا اعادہ کرتی رہی ہے۔ ایک زمانے مین آپ جذبات کو فنا کیے ڈالتے ہین، اور عقل کی پرستش کراتے ہین، نتیجہ یہ ہوگا، کہ کچھ روز کے بعد جذبات کی پرستش ہوگی، اور عقل کو لوگ ٹھوکرون سے پامال کرین گے۔ چنانچہ رواقیت وتشکیک کے خلاف جب ردّ عمل ازخود شروع ہوا، تو اُس نے یہی شکل اختیار کی۔

دوسری بات یہ ہوئی، کہ رواقیت نے فضیلت انسانی کا جو تخیل قائم کیا تھا، وہ خود اس قدر روحانی تخیل کے قریب تھا کہ کچھ عرصے کے بعد اس کا تصوف کے قالب مین منقلب ہوجانا لازمی تھا۔ روحانیت وتصوف مین فرق ہی کیا ہے؟ ایک کے ڈانڈے دوسرے سے بالکل ملے ہوئے ہین۔ یہ کیونکر ممکن تھا، کہ لوگون مین روحانیت ترقی کرتی رہے، اور تصوف کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس طرح رواقیت کی مذہبیت وروحانیت خود اُسے تصوف کے قالب مین ڈھالنے مین معین ہوئی۔

پھر کچھ تجارتی وسیاسی اسباب بھی ایسے آکر جمع ہوگئے جنھون نے مشرقی مذاہب کی خوب اشاعت کردی۔ مثلاً تجارت کی غرض سے، اہل اٹلی واہل مصر مین خوب آمد ورفت وخلا ملا پیدا ہوگیا۔ یا پھر وہ مشرقی غلام جو رومہ مین بکثرت تھے، اپنے آبائی مذہب کے سخت پیرو تھے۔ ان کے علاوہ اب اسکندریہ نے جو مرکزی حیثیت حاصل کرلی تھی، اس کی بنا پر ہر ملک کے حکما وعلما، مذاہب آآکر وہان جمع ہوگئے تھے، اور ان کے اجتماع کے اثر سے بیسیون مختلف معتقدات ومذاہب وہان چل پڑے تھے، جن مین سے چار کو خاص اہمیت حاصل ہوئی:۔ یہودیت کی آمیزش مصری ویونانی فلسفہ سے، مسیحیت مین مصری ویونانی عناصر کا امتزاج، خود مصری ویونانی فلسفہ کی باہمی ترکیب،

اور فلاطون کی اشراقیت کا مشرق کے تصوف سے اختلاط۔ لوگون کو اس آخری صورت مین خاص طور پر موزونیت و مناسبت نظر آنے لگی، یہان تک کہ رفتہ رفتہ یہ دونون مدغم و ممزوج ہو کر ایک ہو گئے۔

ان سب سے بالاتر و قوی تر سبب خود نفس انسانی کا ایک نہ مٹنے والا جذبہ ہوا۔ وہ کون جذبہ؟ جذبۂ مذہبیت۔ مذہبیت، درحقیقت انسان کی جبلت مین، انسان کی سرشت مین، انسان کی خمیر مین داخل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے برگ و بار بارہا کاٹے گئے، لیکن اس کی جڑ جون کی تون قائم رہی۔ بلکہ میرے نزدیک تو مذہب کی حقانیت و صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے، کہ یہ جذبہ ہماری ہستی کا ویسا ہی جزو غیر منفک ہے، جیسے ہمارا جسم اور ہمارے قویٰ۔ روم و یونان نے (جو اس حیثیت سے ہمارے معاصرین مین کامٹ کے فلسفۂ حسی کے متبعین سے بہت کچھ مشابہ کہے جا سکتے ہین)، یہ کوشش کی کہ انسان کی توجہ مذہب و الٰہیات کے مباحث سے ہٹا کر تمامتر اخلاقی مسائل پر مصروف رکھین۔ یہ کوشش عرصے تک چلنے والی نہ تھی۔ کچھ روز تو مذہب سے بے اعتنائی رہی، لیکن جبلت کے نقوش کو کون مٹا سکتا ہے؟ جذبۂ مذہبیت اچھلا، اور اس زور کے ساتھ اچھلا، کہ الحاد، انکار، تشکیک، و تغافل سب کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ پہلی صدی عیسوی کے وسط تک تو مذہب کی طرف سے تغافل و بے اعتنائی رہی، لیکن اس کے بعد انکار کی جگہ اعتقاد نے لینا شروع کی، اور لوگون مین طرح طرح کی وہم پرستیان پیدا ہونے لگین۔ حکومت نے اس کی روک تھام کرنا چاہی، مگر مذہب کی قوت کے آگے کچھ نہ چل سکی۔ بالآخر خود حکومت اس کی تائید پر آمادہ ہو گئی۔ اسی زمانے مین ایک طرف تو سیاسی انحطاط کے اقتضا سے لوگون کی توجہ وطنیت و قومیت کی طرف سے ہٹی، تو خواہ مخواہ مذہب کی جانب مائل ہوئی۔

اور دوسری طرف ملک میں جو ہولناک وبا پھیلی، اُس نے رہی سہی بداعتقادی و بیدینی کا اور بھی خاتمہ کر دیا۔ عین اسی وقت افلاطون و فیثاغورس کے فلسفون نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کی، اور یہ دونون فلسفے خاص مذہبی رنگ مین رنگے ہوئے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ مصری فلسفہ (یعنی فیثاغورس کا) انسان کی روحانی زندگی کی اصلاح پر زور دیتا تھا، اور یونانی فلسفہ (یعنی فلاطون کا) انسان کی عقلی زندگی کی اصلاح پر، لیکن ماحصل دونون اصلاحون کا، تزکیۂ روحانی و تخلیق مذہبیت ہی تھا۔

اشراقی تحریک کا علمبردار پلوٹارک تھا۔ یہ عقل کی اشرفیت و فضیلت کا قائل تھا۔ یہ وہم پرستی کو الحاد سے بھی بدتر جانتا تھا، کیونکہ الحاد تو وجود باری کا صرف انکار کرتا ہے، اور اس سے جو خرابیان پیدا ہوتی ہین، وہ محض سلبی یا منفعلانہ ہوتی ہین، بہ خلاف اس کے وہم پرستی، ذات باری کی غلط تصویر کھینچتی ہے اُس کی جانب بے اصل و بے بنیاد امور کا انتساب کرتی ہے، اور اس کے مفاسد بالکل صریح ایجابی، و مثبتانہ ہوتے ہین۔ تاہم پلوٹارک اساطیر قدیم کا سرے سے منکر نہ تھا۔ بعض چیزون سے انکار کرتا تھا، بعض کی تاویل کرتا تھا، اور بعض کا صراحتہً معتقد تھا۔ اس کی تعلیم خالص توحید کی تعلیم تھی۔ چھوٹے چھوٹے معبودون و دیوتاؤن کو وہ یا تو مظاہر ربانی سے تعبیر کرتا ہے، اور یا انھین ملائکہ کے درجے مین رکھتا ہے۔ البتہ ان کے بابت جو بداخلاقی کے افسانے مشہور تھے، ان کا وہ شدت سے منکر ہے۔ وہم پرستون کی وہ خوب خبر لیتا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے، کہ

"وہم پرست شخص دیوتاؤن کا قائل ضرور رہتا ہے، لیکن اس کا تخیل نہایت غلط و ناقص ہوتا ہے۔ جو ہستیان ہر وقت اس کی خبرگیری کرتی ہین، اور اُس کی خطاؤن سے بہ کمال مہربانی چشم پوشی

کرتی رہتی ہین، اُنھین وہ ظالم وشقی القلب تصور کرتا ہے۔ وہ دیوتاؤن کی جانب انسانی شکل وصورت کا انتساب کرتا ہے۔ وہ بتون کی پوجا کرتا ہے، اور اہل علم کی آواز پر کان نہین دھرتا، جو خدا کی عظمت ورافت کا خیال دلاتے رہتے ہین۔"

مگر خالص موحّد ہونے کے ساتھ پلوٹارک کہانت کا قایل تھا، سعادر وحانی، و تقدیر آلہی کا معتقد تھا، اور باپ کے جرم پر اولاد کو سزا دینے کا حامی تھا۔

پلوٹارک کا جانشین میکزمیس آف ٹایر ہوا۔ اپنے پیشرو کی طرح یہ بھی خالص عقیدۂ توحید کی تعلیم دیتا تھا، اور کہتا تھا کہ زی اس (خدا) تمام چیزون کا خالق، سب کا حاکم، اور سب سے قدیم ہے۔ اُسی کی طرح یہ اس کا بھی قایل تھا کہ دیوتاؤن سے مراد ملائک ہین۔ ہومر کے افسانہ بت پرستی کی شریعت کے صحیفہ تھے، اس نے ان کی بھی نہایت آزاد خیالی سے تاویلات کین۔ غرض یہ کہ ہر طریقے پر اُس نے شرک وبت پرستی کی آلایش سے مذہب کو پاک کر کے خالص عقیدۂ توحید کی تعلیم دی۔ اُس کے الفاظ سننے کے قابل ہین:۔

"دیوتا خود اپنے وجود کے لیے کسی بُت اور مورت کے محتاج نہین یہ پیکر تراشی تو صرف اسی واسطے ہے کہ ہم اسی ذریعے سے تصور جما سکین۔ ایسے لوگ کہان ہوتے ہین جو بغیر بتون کی مدد سے تصور باری کر سکین؟ لیکن جو شاذ و نادر لوگ ایسے ہین، اُنھین اُن کی کچھ بھی حاجت نہین۔ یہ تو صرف عام افراد کے لیے لازمی نہین، جو ان کی اعانت کے بغیر ذات الٰہی کا تخیل کر ہی نہین سکتے۔۔۔۔۔

خدا، جو تمام کائنات کا خالق ومبدع ہے، آفتاب وماہتاب، آسمان وزمین، زمان ومکان، غرض جملہ موجودات سے قدیم تر ہے۔ اُسے

نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے، نہ کوئی زبان اس کا بیان کر سکتی ہے ...... وہ ذات واحد دیکھتا ہے، اب خواہ ہم اس کا تصور یونانیون کی طرح بتون اور مجسمون کے ذریعہ سے کرین، خواہ مصریون کی طرح جانورون کے ذریعہ سے، اور خواہ ایرانیون کی طرح آگ کے ذریعہ سے، یہ ہماری اختیاری بات ہے، البتہ ہمین اس کی ذات کی وحدت کا ہمیشہ اعتقاد رکھنا چاہیے محبت صرف ایک سے کرنا چاہیے، اور اعتقاد صرف ایک پر رکھنا چاہیے "

اسی مسلک و مشرب کا ایک اور مصنف اسی زمانے مین آپولیس نامے ہوا ہے، یہ بلحاظ معلم اخلاق ہونے کے اپنے دونون پیشروون سے کم درجے کا ہوا ہے۔ اسے مصری مذہب سے خاص انس تھا، لیکن فلسفہ مین یہ مسلک افلاطون کا پیرو ہوا ہے۔ جنات کے بارے مین اس کے اقوال قابل غور ہین۔ کہتا ہے، کہ

"جنات" انسان و معبودون کے درمیان بطور پیامبر کے کام دیتے ہین۔ انسان کی دعائین خدا تک پہونچانا اور پھر خدا کی رحمت و برکت کو اہل دنیا پر نازل کرنا، یہ ان کا کام ہے.... ہر طرح کے وحی و الہام، کرامت و استدراج، کہانت و نجوم وغیرہ کے احکام و اعمال انھین کے تصرف سے صادر ہوتے ہین۔ ان مین سے سب کے کام الگ الگ بٹے ہوئے ہوتے ہین۔ بعض خواب دکھلاتے ہین، بعض پرندون کے پرواز پر حاکم ہوتے ہین، وقس علی ہذا .... معبودان اعظم یہ کام نہین کرتے۔ یہ سب انھین کے ذریعہ سے انجام پاتے ہین.... یہ ہمارے اعمال کے کاتب اور ہمارے اخلاق کے محافظ بھی ہوتے ہین۔ ہر شخص کے گرد و پیش اس کے اعمال زندگی کے غیر مرئی شاہد

ہر وقت موجود رہا کرتے ہین، جو نہ صرف اس کے اقوال و اعمال کو بلکہ اس کے افکار و تصورات کو بھی لکھتے جاتے ہین۔ جب انسان موت کے بعد داورِ محشر کے سامنے جاتا ہے، تو ہر شخص کے ساتھ اُس کے یہ جنات بھی موجود ہوتے ہین، اور انھین کی تصدیق یا تردید کی بنا پر اُس کو اُس کے اعمال کی پاداش ملتی ہے۔"

مذہبی اصلاح کی یہ کوششین متعدد حیثیات سے دلچسپ و اہم ہین۔ ایک تو اس لحاظ سے کہ وجوداجنہؔ کو مسیحی علمانے تمامتر لے لیا، بلکہ کاتب اعمال جن کی جگہ انھون نے کاتب اعمال فرشتہ قرار دے لیا، اور ایسے حاکم مطلق کا تصور، جو اپنے ماتحتون کے ذریعے سے کارفرمائی کرتا ہے، بداہتہً مسیحیت کی مقبولیت و اشاعت مین معین ہوا۔ پھر اس حقیقت کے انکشاف کے لحاظ سے بھی یہ اصلاحات کچھ کم دلچسپ نہین، کہ انسان اپنے مذہبی تخیلات کو اپنی دماغی و اخلاقی سطح تک بلند کرنے کی کس کس طرح کوشش کرتا ہے، اور اپنے مذہبی قوانین کو کیونکر اپنی اخلاقی ترقی کا ذریعہ بناتا ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ اس لحاظ سے دلچسپ ہین، کہ مصری و یونانی اصلاحات نے دو صاف سانچے تیار کر دیے، جن مین تمام اصلاحات ما بعد ڈھلتی رہین۔ یونانی تحریک تمامتر عقلی و دماغی تھی، برخلاف اس کے مصری تحریک یکسر روحانی و باطنی تھی۔ یونانی اپنے مذہب پر رد و قدح کرتے تھے، مہملات کی تاویلات کرتے تھے، تناقضات کو رفع کرتے تھے، اور تخیلات دینی پر اُسی آزادی سے تنقید و تنقیح کرتے تھے، جیسے وہ اپنی روزانہ زندگی کے دوسرے اعمال مین کرتے تھے۔ مصریون کا طریق عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ اپنی آنکھین بند کر لیتے تھے، اعتقاد کے سامنے عقل کی گردن خم کر دیتے تھے، اور تسلیم و رضا کا دامن کبھی ہاتھ سے نہین جانے دیتے تھے۔

یہی آپولیس ایک جگہ کہتا ہے، کہ "مصری دیوتاؤن کی عزت آہ وزاری سے تھی، اور یونانی دیوتاؤن کی رقص وسرود سے" اور اس مین شبہ نہین، کہ اس مقولہ کے آخری جزو کی تصدیق تاریخ یونان مین قدم قدم پر ہوتی ہے۔ درحقیقت کسی مذہب کے مراسم مین جشن، کھیل، وتماشون کی اتنی آمیزش نہین پائی جاتی، جتنی اس مین۔ اور نہ کسی مذہب مین خوف ودہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے، جتنا اس مین۔ اس مذہب مین خدا کا تقدس بس اسی درجہ کا تھا، جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے، اور اُسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت وتمجید کے لیے بالکل کافی تھا۔ اس کے برخلاف، مصریون کے یہان مذہب کی ایک ایک شے اسرار وغوامض مین داخل تھی۔ تجرد، ترک حیوانات، غسل ووضو، قربانی وغیرہ کے پُراسرار مراسم عبادت کے لازمی اجزا تھے۔ اور فطرت کی قوتون کی جیسی اسرار پرستش ان کے یہان تھی، اس کی نظیر کسی قدیم مذہب مین نہین ملتی۔

مشرقی مذاہب کے ہمراہ جو فلسفہ اور فلسفۂ اخلاق آیا، وہ بھی اسی نوعیت کا تھا۔ اس فلسفہ کا اصل الاصول یہ تھا، کہ عقل کو اشراق ومکاشفہ کے سامنے مغلوب رکھا جائے۔ اشراقیت جدید اور اس کے متحد النوع فلسفہ اگرچہ وحدت وجود پر متفرع تھے، تاہم ان مین اور رواقیت کے وحدت وجود مین بہت فرق تھا۔ رواقیین، عبد ومعبود مین رشتۂ اتحاد اس لیے قائم کرتے تھے، کہ انسان کی عظمت ہو، بخلاف اس کے اشراقیین اسے اس واسطے مانتے تھے، کہ اس سے خدا کی عظمت مین اضافہ ہو۔ اول الذکر کے نقطۂ خیال سے انسان ایک خودمختار واشرف الموجودات ہستی ہے۔ بہ خلاف اس کے آخر الذکر کے نزدیک، انسان، ایک ہستی مجبور ومجہول ہے، جس مین روح یزدانی سرایت کیے ہوئے ہے، تاہم اس کی یزدانیت کو اس کا جسم زیر کیے ہوئے ہے۔ اس بنا پر انسان کی زندگی کا اصل مقصد، جسمانی سرکشی کو

مغلوب کرنا، اور جسم کے قیود سے آزاد ہونا ہی۔ پارفری کہتا ہی، کہ فلسفہ کی غایت موت
کا حصول قرب ہی، نہ اس معنی مین کہ بہ قول رواقیین کے اس سے موت کی طرف سے
بیخوفی پیدا ہو جاتی ہی، بلکہ اس معنی مین کہ اس سے اصلی مقصود زندگی حاصل ہوتا ہی، یعنی
جسم و روح کا انفصال۔ یہین سے ایک رہبانیت آمیز فلسفۂ اخلاق کی بنیاد پڑی
اور اس طرح کے اقوال نظر آنے لگے، کہ "انسان کے لیے سب سے بڑی مصیبت،
لذت و مسرت ہی، کہ اسی کے باعث روح کو جسم سے وابستگی و دلچسپی قائم ہو جاتی
ہی۔ اور اسی کے باعث روح کا عنصر یزدانیت ماند پڑ جاتا ہی، اور وہ راہ حقیقت
چھوڑ کر جسم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگتی ہی" "حُسن حقیقی و عدل، اور ان کے
مرکبات کو آج تک نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہی، اور نہ کسی حواس مادی نے انھین محسوس
کیا ہی۔ فلسفہ کی تحصیل، حواس ظاہری کو مردہ کرنے کے بعد صرف خالص و بے آمیز
عقل کی بنا پر ہونا ممکن ہی۔ جسم روح کو گمراہ کرتا رہتا ہی، اور جب تک روح قید مادّی مین
گرفتار ہی، ہم کبھی حقایق اصلی کو نہین پا سکتے"

لیکن ان فقرون مین جس عقل کی بہ حیثیت کاشف حقایق اس قدر مدح و توصیف
ہوئی ہی، اُس سے مراد استدلال سے ہرگز نہین۔ ان لوگون کے نزدیک عقل کی
جو تعریف ہی، اُس مین قیاس و استقرا، بُرہان و استدلال، تحلیل و تنقید کی مطلق
گنجایش نہین۔ بلکہ وہ ایک ودیعت فطری، ایک ملکۂ وہبی ہی، جس مین ایک
مدت کی تمرین و ریاضت کے بعد روحانی جِلا آجاتی ہی۔ فرض کیجیے ایک شخص دفعتہً
باہر سے کسی تاریک کمرہ مین داخل ہوتا ہی، تو داخل ہوتے ہی اس کی کیا حالت
ہوتی ہی۔ یہ کہ اُسے مطلق سوجھائی نہین دیتا۔ لیکن چند منٹ کے بعد جب اس کی
آنکھین اس تاریکی کی خوگر ہو جاتی ہین، تو رفتہ رفتہ اس کی بصارت کام دینے لگتی ہی،
یہان تک کہ کچھ عرصے مین اُسے اپنے گرد و پیش کی اشیا رخاصی طرح دکھائی دینے لگتی ہین

اس تمثیل کے ذریعہ سے اشراقیین روح کی ماہیت سمجھاتے تھے، وہ کہتے تھے، روح جسم کی کثافت سے آلودہ ہو کر مثل ایک تیرہ و تار کمرہ کے ہو گئی ہے تاہم اُس مین یزدانیت کی چشم بصیرت موجود ہے، جو اگرچہ ابتداءً مادیات کی تاریکی مین خیرہ رہتی ہے، لیکن کچھ عرصے کی ریاضت، مکاشفہ و مراقبہ کے بعد اُس مین رویت کی قوت پھر عود کر آتی ہے۔ اس بنا پر یک سوئی ذہن عقلی حیثیت سے، اور انسان کی فنائیت فی اللہ اخلاقی حیثیت سے، سب سے بڑی نعمت ہے۔ "انسان کا انجام، خدا ہے" یہ فیثاغورث کا مقولہ تھا۔ ذات احد، جو تمام اوصاف و اعراض سے منزہ ہے، اُس مین فنا ہو جانا، یہ غایت حیات انسانی ہے۔ مشہور یہ تھا کہ یہ حالت، پلوٹینس پر کئی بار طاری ہوئی تھی اور پارفری پر مدت کی ریاضت کے بعد صرف ایک بار۔ اس حالت کے حصول مین عقل و دلیل، نہ صرف غیر مفید ہوتی ہے بلکہ صریحًا مُضر ہوتی ہے۔ یہان استدلال و استقرا، چون و چرا کو بالکل دخل نہین، بلکہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے، سخت سے سخت ریاضت، نفس کُشی، ترک خواہشات، اور پُر اسرار جادہ طریقت پر چلنے سے حاصل ہوتا ہے۔

فصل (۸)

اشراقیت جدید

اشراقیت جدید نے جو فلسفہ پیش کیا، وہ کچھ اپنی نوعیت مین انوکھا نہین، بلکہ مختلف قالبون اور مختلف نامون کے ساتھ ہمین اس کی جھلک متعدد جگہ نظر آتی ہے، روحانیت، تصوف، یوگ، یہ سب اسی کے مختلف نام ہین۔ ماحصل ان سب کا یہ ہے کہ مادیات سے پرے ایک ایسی اقلیم ہے، جہان حواس کا گزر نہین، بلکہ

جہان جو کچھ ہوتا ہی، مراقبہ و مکاشفہ کی مدد سے ہوتا ہی۔ اس فلسفہ کی تعلیم کا داغی اثر یہ ہوا، کہ لوگون مین زود اعتقادی، وہم پرستی، وعجائب پسندی بڑھ گئی، کرامت و خرق عادت کا دور دورہ ہو گیا، اور عقل و منطق و قانون قدرت پر اعتماد لوگون کے دلون سے اُٹھ گیا۔ اخلاقی حیثیت سے یہ فلسفہ تزکیہ باطن و تکملہ انسانیت مین تو بے شبہ بہت معین ہوا، تاہم اس کا سب سے بڑا مہلک اثر یہ پڑا، کہ لوگون مین عملی زندگی کی طرف سے بے اعتنائی آگئی۔ اور اس حیثیت سے یہ فلسفہ ہمیشہ کے لیے رومن فلسفہ کا خاتم ثابت ہوا۔ اس سے بیشتر تمام رومی حکما، عمل کو اخلاق کا ایک لازمی جزو قرار دیتے تھے سسرو کہتا تھا، کہ جو لوگ حکومت کی خدمت وفاداری سے کرتے ہین، ان کے لیے یقیناً عقبیٰ مین بخشش ہی۔ رواقیین کا قول تھا، کہ ہر نیکی بیکار ہی، تاوقتیکہ عمل و کردار مین اس کا اظہار نہو۔ خود ایپکٹیٹس، مارکس آریلیس تک نے باین تعبس و رہبانیت، کبھی عملی زندگی کے حقوق و فرائض کو نظر انداز نہین کیا تھا۔ پلوٹارک کا مقولہ تھا، کہ ہماری زبان مین انسان اور نور کے لیے جو ایک ہی لفظ ہی، سو اس کا منشا یہ ہی، کہ انسان کو عملاً اپنے تیئن دنیا کا نور ثابت کرنا چاہیے، اور کاشتکار کے لیے بھی کافی نہین کہ وہ اپنی خوش حالی کے لیے خدا سے دعا مانگتا رہے، بلکہ اس کی زبان کو دعا مین مشغول رہنا چاہیے اور ہاتھ کو ہل پر رہنا چاہیے آپولیس کہتا تھا، کہ جو انسان نیکی کرنا چاہتا ہی، اُسے یہ سمجھنا چاہیے، کہ وہ تنہا اپنی ہی ذات کے لیے نہین پیدا ہوا ہی، بلکہ ساری دنیا کے حقوق اُس کے اوپر ہین۔ مثلاً سب سے پہلے اُس کے اوپر اُس کے وطن کا حق ہی، پھر اُس کے خاندان کا، اور پھر اُس کے ہم پیشون کا۔ اسی طرح سیکزٹس نے پورے دو مقالات اس باب مین لکھے ہین، کہ محض تصور و خیال مین نیکی کرتے رہنا تاوقتیکہ عملاً اس کا اظہار نہو محض لا حاصل ہی۔ اُس کے بعض فقرہ یہ ہین:۔

"انسان کو علم سے کیا حاصل، اگر وہ اپنے علم سے دوسرون کو فایدہ نہین پہونچاتا؟ طبیب کو طب پڑھنے سے کیا فائدہ، اگر وہ دوسرون کا علاج نہین کرتا؟ صنعت و حرفت کس کام کی، اگر صناع مصنوعات نہین بناتا؟... ہرقلس ایک مشہور حکیم ہوا ہے، مگر کیون؟ اس لیے کہ وہ اپنی حکمت کو اپنی ذات تک محدود نہین رکھتا تھا، بلکہ اس سے تمام دنیا کو نفع پہونچاتا تھا... لیکن اگر وہ ساری دنیا سے الگ ہو کر کسی گوشے مین اپنے تئین مقید رکھتا، تو آج ہرگز وہ اس عظمت و عزت کے ساتھ نہ یاد کیا جاتا۔ خود خدا کو دیکھو، جو تمام ممکن محاسن کا جامع ہے، کہ وہ کسی لمحہ بیکار نہین ہوتا، ہروقت عمل مین مشغول رہتا ہے۔ اگر وہ ایک گھڑی کے لیے بھی عمل سے غافل ہو جائے تو آسمان کی گردش، زمین کی قوت نامیہ، دریاؤن کا بہاؤ، موسمون کا تغیر و تبدل سب اکبارگی بند ہو جائے"۔

غرض یہ کہ جتنے حکما گزرے تھے، سب کے نزدیک، فضیلت اخلاق کی مقدم شرط عملیت تھی، لیکن اشراقیت جدید نے اس کے بالکل برعکس اثر ڈالا۔ اس کا سارا زور مراقبہ و مکاشفہ پر تھا، اور اس کے لیے ترک تعلقات، زاویہ نشینی و عزلت گزینی لازمی تھی۔ اس مسلک کا ماحصل انکسارغورس کے ان الفاظ مین تھا کہ "آفتاب و نجوم، اور واقعات فطرت کا مطالعہ کرو، اور ان مین تدبر سے کام لو، کہ آیات الٰہی مین یہی تدبر، اصلی حکمت ہے"۔ سینٹ کے ایک رکن، روگن ٹیانس پر پلوٹینس کی اس تعلیم کا ایسا گہرا اثر پڑا، کہ وہ اپنی ساری جایداد سے دست بردار ہو گیا، تمام فرائض منصبی سے استعفا دیدیا، اور ہر قسم کے مشاغل دنیوی سے علیحدہ ہو کر زاویہ نشین ہو گیا۔ اس پر پلوٹینس اُس سے اس درجہ خوش ہوا کہ اُسے

اپنا خاص ممتاز تلمیذ قرار دیا، اور دوسرون کے سامنے اُسے بہ طور ایک حقیقی فلسفی کے نمونے کے پیش کرتا تھا۔

فیثاغورثی مسلک کے ان دونون خصوصیات یعنی عقل کی مغلوبیت اور علایق دنیوی سے بے تعلقی کی جھلک یون تو اس مین ابتدا ہی سے نظر آتی تھی، لیکن تیسری وچوتھی صدی مین یہ زیادہ نمایان ہو گئیں۔ تاہم پلوٹینس اب بھی ایک آزاد مشرب فلسفی تھا، جو یونانی روایات کو زندہ رکھے ہوئے تھا، اور جو اپنا نظام عقلی اصول پر قائم کیے ہوئے تھا، اور جو مذہبی ڈھکوسلون کا کٹر منکر تھا۔ لیکن اُس کے شاگرد پارفری نے مسیحیت کی مخالفت شروع کی، اور اسی نے مذہب اشراقیت جدید کو ایک مذہب کے قالب مین تبدیل کرنے لگا۔ اس کی اس کوشش کو آئیمبلیکس نے تکمیل تک پہونچایا، جو خود مصری مذہب کا ایک پادری تھا، اُس نے سارے فلسفہ اخلاق کو مذہبی اعجوبہ پرستیون کا محکوم کرکے، عقل کو اعتقاد کی لونڈی بنا دیا۔ اس کے بعد جولین کی یہ کوشش رہی، کہ فلسفہ کی آمیزش کے ساتھ بت پرستی کی پھر تجدید کرے۔ ان تمام مختلف تحریکات مین یہ شے بہ طور قدر مشترک کے رہی، کہ زود اعتقادی واعجوبہ پرستی کا مرض برابر بڑھتا گیا۔ جنات کا وجود روز بروز مسلم ہوتا گیا، اور یہ قدیم مسلک مٹتا چلا گیا، کہ مختلف دیوتا، مختلف صفات ربانی کے مظہر ہین۔ اخلاقی حیثیت سے فلاطون کی تعلیمات اگرچہ رائج وشائع تھین، تاہم ان پر خارجی اثرات غالب آگئے تھے۔ مثلاً ایک خودکشی کا مسئلہ تھا۔ اسکے عدم جواز پر فلاطون اور اشراقیین جدید دونون متفق تھے، لیکن عدم جواز کے وجوہ مین دونون ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ فلاطون اس کی صرف یہ وجہ قرار دیتا تھا، کہ خدا نے زندگی مین ہمارا جو منصب قرار دے دیا ہے، اُس سے ہٹنا آئین فرض شناسی کے منافی ہے، برخلاف اس کے اشراقیین جدید یہ بھی کہتے تھے، کہ خودکشی کرنے سے روح نجاست سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ معاد کا اعتقاد

جو فیثاغورس و افلاطون کے مسلکوں میں مشترک تھا، اب عام ہو گیا تھا۔ وطنی عظمت کا اثر روز بروز زائد پڑتا جاتا تھا، اور اس کی جگہ عقبیٰ کا تصور لیتا جاتا تھا، خصوصاً مشرقی المذہب غلاموں کی تعداد کثیر، جو رومیوں کی زندگی پر ایک اثر عظیم رکھتی تھی، قدرتی طور پر اس عالم کا ذوق و شوق سے انتظار کرتی رہتی تھی، جہاں وہ آزاد ہو سکے گی۔ سیرو، لکریشیس، و پلینی کے زمانے میں جو انکار و تشکیک کی عام ہوا چلی ہوئی تھی، وہ اب مدت ہوئی فنا ہو چکی تھی۔ مذہب و اخلاق مدغم ہو گئے تھے، اور اب معلمین اخلاق، تزکیۂ اخلاق کا بہترین طریقہ، عبادات بتاتے تھے۔

باب ہذا کے موضوع پر مجھے جو کچھ لکھنا تھا، لکھ چکا۔ بت پرست اخلاقیین کے اصل اقتباسات دیکر، اور اس زمانے کے عام رجحانات کو بیان کر کے یہ دکھایا جا چکا، کہ فلسفۂ رومی کے عروج اور شیوع مسیحیت کے درمیانی زمانے میں ان اخلاقیین کی تحریکات کا رخ کس جانب تھا۔ میرا مقصد ان مصنفین کی، یا اُن کے فلسفہ کی تاریخ لکھنا نہ تھا، بلکہ مقصود صرف یہ دکھانا تھا، کہ یہ حکما ہر دور میں کس کس نیکی کو ام الفضائل یا اخلاقی سانچہ قرار دیتے تھے، اور پھر اس کی ابتدا و ماہیت کیا ہوتی تھی، چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس فرض کو ادا کر چکا۔ تاریخ محض سنہ وار متفرق واقعات کے مجموعہ کو نہیں کہتے، بلکہ وہ نام ہے علت و معلول کی کڑیوں کے ایک سلسلہ کا، جس میں ہر پچھلے واقعہ کو پہلے سے مربوط ہونا چاہیئے۔ پس جب ہم کسی جماعت کو نہایت نیکوکار یا نہایت بدکار پائیں، یا جب کوئی قوم ایک اخلاقی منزل سے دوسری میں قدم رکھنے لگے، تو ہمیں چاہیئے کہ اس کیفیت کے اسباب و موثرات کا سراغ لگائیں۔ چنانچہ رومن اخلاق کی تاریخ لکھنے کے معنی یہ ہیں، کہ ہم اس کے تین دور قائم کر کے ہر دور کی خصوصیات الگ الگ کر کے گنا دیں۔ یہ تینوں دور رواقی تحریک کے

دور، یونانی تحریک کے دور اور عصری تحریک کے دور سے علی الترتیب موسوم کیے جا سکتے ہیں۔

کیٹو و سسرو کے زمانے میں اخلاقی سانچہ کی نوعیت بالکل رومی انداز کی تھی گو اس کا فلسفیانہ پہلو، رواقیین یونان سے ماخوذ تھا۔ اس میں رومی عظمت، قوت، شدت، و عملیت، اور وسیع المشربی کی جامعیت تھی، رفتہ رفتہ یونانی عنصر کو جو قدما کے یہاں انسانیت کے لطیف و نازک پہلوؤں کا محافظ تھا، غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ اس کا سبب کچھ تو خود اسی کی تبلیغ و اشاعت، اور کچھ عہد انٹونائنس کی طویل مدت ہوئی۔ اور پھر دولت و ثروت کی فراوانی سے ملک میں تعیش کی جو خو پیدا ہو گئی تھی، نیز دارالحکومت روم کی مرکزیت کے باعث اُس میں یونانیوں کی جو جماعت کثیر آ گئی تھی، وہ بھی اس میں معین ہوئی۔ ان سب پر مستزاد یہ ہوا، کہ ٹیرنٹیس و سسرو نے اخوت انسانی کا جو سبق دیا تھا، اُس کا مفہوم اب لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا تھا، اور اب جا کر اُس پر عملدرآمد شروع ہوا تھا۔ اس تغیر کا سب سے بڑا مظہر یہ تھا، کہ افلاطونیہ زور و شور سے رواقیین کی جذبات کشی کی تردید کرتے تھے، اور رواقیت کی سختیوں کو ہلکا کرتے تھے۔ سنیکا کی تحریروں میں گو رواقیت کی سختیاں بہت نمایاں ہیں، تاہم درمیان درمیان فیاضی و ہمدردی کے اقوال بھی کثرت سے آتے جاتے ہیں، ڈایان کریزوسٹم کے صفحات میں بھی فیاضی و ہمدردی کی تعلیم موجود ہے، اور خودی و بیدردی کے عناصر بھی بہت کم ہیں۔ اپکٹیٹس کے یہاں بے شبہ رواقیت کی پوری سختی پائی جاتی ہے تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے، کہ اُس کے یہاں جذبۂ مذہبیت اور نہایت وسیع ہمدردیوں کی تعلیم بھی موجود ہیں۔ مارکس آریلیس کے ارشادات میں جذبات کا غلبہ صاف نظر آنے لگتا ہے، اور ملنساری کو ایثار پر صاف فضیلت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اسی زمانے سے خیال و تصور کی پاکیزگی اور

جذبۂ تقدس پر خاص زور دیا جانے لگتا ہے۔

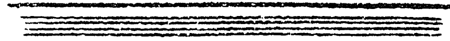
یہ دوسرا دور، رومی و یونانی تحریکات کا جامع تھا۔ اب بے غرضانہ عقل، اور یونانی موشگافیوں سے معریٰ رواقیت ایسے لوگوں کا مذہب تھی، جو ایک طرف تو تمام دنیا کے حکمران و سردار، جوش و طلبیت سے لبریز، اور فرض پر جان دینے والے تھے، مگر جن میں دوسری طرف روحانیت، لطافت و لینت بھی آ گئی تھی۔ پہلے رواقیت ایک کرخت اور ٹھوس شے تھی، مگر اب اس میں اجزاء لطیفہ کی بھی آمیزش ہو گئی تھی۔ مگر عین اس زمانے میں، جبکہ رواقیت اپنے حسن و جمال، عظمت و قوت کے اوج کمال پر تھی، ایک نئی تحریک پیدا ہوئی، جس کے باعث فلسفہ ناقدری و کس مپرسی میں پڑ گیا، اور اس ڈراما کا آخری ایکٹ ہونے لگا۔

یہاں سے تیسرا دور شروع ہوا۔ اس میں بھی مثل ادوار سابقہ کے کوئی نئی و غیر معمولی بات نہیں ہوئی، بلکہ جو کچھ ہوا، واقعات کی عام و تدریجی رفتار سے ہوا۔ اب ایک طرف تو عرصۂ دراز کی مستبدانہ حکومت نے رواقیت کی پیدا کردہ عملیت و طلبیت کا خاتمہ کر دیا تھا، دوسری طرف یونانی موشگافیوں کے داخلہ اور خطیبوں کے اژدحام کثیر نے فلسفہ کو ایک بازیچۂ اطفال بنا دیا تھا۔ اور تیسری طرف جذبات پرستی نے مرکز اخلاق کو اپنی جگہ سے ہٹا کر بجائے انضباط اعمال کے، جذبات کے نشو و پرداخت کو لوگوں کی توجہ کا اصل مرکز بنا دیا تھا۔ ان سب اسباب کا مل ملا کر یہ نتیجہ ہوا کہ رومہ کے بجائے اسکندریہ مرکز اخلاق قرار پایا، قدیم تشکیک و عقل پرستی کا چراغ گل ہو گیا، رومی تحریک کا خاتمہ ہو گیا، اور مصری دیوبالا نے یونانی اشراقیت سے ساز کر کے تمام قلوب پر قبضہ جما لیا، چنانچہ اب لوگ بجائے فلسفہ و منطق، عقل و دلیل کے مراقبہ و مکاشفہ، کشف و کرامت کے قائل ہو گئے، اور وہم پرستیوں کا جلوہ ہر جگہ نظر آنے لگا۔

یہ ہو ان اثرات کی مختصر تاریخ جو باری باری ایک ایسی جماعت پر عامل ہوتے رہے جو صدہا سال سے استبداد غلامی، سفاکانہ تفریحات، و انواع و اقسام کی بداخلاقیوں کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کی ہر مصلح نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اصلاح کرنا چاہی مثلاً رواقیت نے یہ کیا، کہ حق و باطل، گناہ و ثواب کے امتیازات نہایت واضح طور پر بتا دیے، عام اخوت انسانی کی تعلیم دی، وطنیت کا جوش پیدا کیا، اور ایک عالی ظرفانہ قانون و ادب کی بنا ڈالی۔ اشراقیت قدیم نے اپنے عہد میں یہ کیا، کہ رواقیت کی افراط و تفریط میں اعتدال پیدا کیا اور جانبازی و سرفروشی کے پہلو بہ پہلو روزانہ زندگی میں تپاک، ملنساری، و خوش خلقی کی بھی تعلیم دی۔ آخر میں جب اشراقیت جدید و فیثاغورثیت کا دور دورہ ہوا، تو اس نے یہ کیا، کہ مذہبیت کے قالب مردہ میں از سر نو روح پھونکی، استجابت دعا و خضوع و خشوع کی تعلیم دی، پاکیزگی خیال و انکسار کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا، اور یہ بتایا کہ مکارم اخلاق کا مرکز و مرجع نفس انسانی نہیں، بلکہ ذات باری ہے۔

لیکن اب ان تمام اصلاحات کے خاتمے کی ساعت آچکی تھی۔ اب وہ آفتاب طلوع ہونے والا تھا، جو عرصے سے زیر سحاب تھا۔ اپنے اصول اخلاق کے حسن و لطافت، اپنے زبردست مذہبی نظام دنیوی طاقت سے کام لینے کی قابلیت، اور اپنے متبعین میں جو منتظم عقل و تدبیر کی صلاحیت اس نے پیدا کر دی تھی، ان مختلف اسباب کی بنا پر مسیحیت چند ہی روز میں تمام مذاہب پر غالب آگئی، اور صدیوں تک دنیا سے اخلاق کی حاکم وحید رہی۔ رواقی عقیدۂ اخوت انسانی، یونانی تعلیم انکسار و خوش خلقی، اور مصری جذبۂ تقدس و مذہبیت، ان تمام چیزوں کی جامعیت نے مسیحیت میں وہ اثر و اقتدار پیدا کر دیا، جس کے لگ بھگ بھی اُس کا کوئی پیش رو فلسفہ نہیں پہونچتا۔ اب

ہم باب آیندہ مین یہ دکھانا چاہتے ہین، کہ روم مین اس مذہب کی اشاعت کے کیا کیا، اخلاقی اسباب ہوئے؟ اس نے کیا معیار اخلاق پیش کیا؟ اقوام کی سیرت کو اس نے اپنے سے کہان تک اور کیونکر متاثر کیا، اور پھر خود اس مین کیا کیا مفاسد پیدا ہوتے گئے؟-



باب سُوم

رومہ کا قبول مسیحیت

فصل (۱)

انسانی معلومات کی تاریخ مین شاید اس سے زیادہ حیرت انگیز کوئی واقعہ نہین کہ قسطنطین کی تخت نشینی سے پیشتر بت پرست مصنفین مسیحیت کی اہمیت اور اس کے اثرات کی طرف سے کامل بے اعتنائی برتتے رہے۔ اس زمانے کے سارے ذخیرۂ ادب مین مسیحیت سے متعلق کل دس بارہ اشارے ملتے ہین، اور اگر انھین کے بھروسے پر کوئی کام کرنا چاہے، تو مسیحیت کے قرون اولی کی تاریخ لکھنا بالکل ناممکن ہوگا۔ پلوٹارک پلینی اول، وینیکا تو اس باب مین سرے سے خاموش ہین، ان کے یہان مسیحیت کا کبھی نام تک نہین آتا۔ ایکٹیٹس و مارکس آرلیس ضمناً اس کا ذکر کرتے ہین، مگر صرف اس لیے کہ تحقیر سے اس کا نام لیتے ہوئے گزر جائین ٹیکیٹس، نیرو کے مظالم کے ضمن مین لکھتا ہے کہ مظلوم (مسیحی) مذہب ایک نفرت انگیز وہم تھا، اور سیوٹونیس بھی بعینہ اسی لقب سے یاد کرتے ہوئے اتنا اور بڑھا دیتا ہے، کہ نیرو کا یہ عمل اگر کار ثواب نہ تھا، تو کسی طرح مذموم بھی نہ تھا۔ سب سے زیادہ تفصیل جس تحریر مین ملتی ہے، وہ پلینی ثانی کا ایک مشہور خط ہے۔ لوسین کے صفحات سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ مسیحی فیاضی کے کیا حدود تھے، نیز یہ کہ اس زمانے کے مذہبی بازیگر مسیحیون کو

کس نظر سے دیکھتے تھے۔ بس یہ چند اشارے، اور وہ ضمنی تذکرے جو ہیڈرین کی اورنگ نشینی سے عروج مسیحیت تک کے سلاطین کی سوانح عمریون مین پائے جاتے ہین، .... تمام تر وہ معلومات ہین، جو بت پرست مصنفین کی وساطت سے ہم تک پہونچے ہین۔

ان لوگون کے سکوت کی اصل وجہ ان کا تعصب یا تنگ خیالی نہین، اور نہ یہ ہے کہ یہ لوگ تاریخ کو صرف سلاطین و امرا کی داستانون تک محدود رکھتے تھے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ذہن مین تاریخ کا نہایت صحیح مفہوم تھا؛ یہ اس حقیقت سے ناآشنا ہرگز نہ تھے، کہ تاریخ نام ہے عہد بہ عہد کے اخلاقی تغیرات و انقلابات کے سُراغ لگانے کا؛ اور گو یہ ظاہر ہے کہ آج کل کی سی اس زمانے مین ترقی نہ تھی تاہم یہ لوگ اس تعریف کو عملاً تاریخ نگاری کے وقت بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ رومہ کے تعیش آفریدہ انحطاط کی تصویر کا انھون نے جس احتیاط سے ایک ایک خط و خال محفوظ رکھا ہے، وہ درحقیقت قابل صد مدح و ستایش ہے۔

ایسی حالت مین یہ امر یقیناً حیرت انگیز ہے کہ مسیحیت کے نشوونما کی جانب سے کیون اتنی بے اعتنائی برتی گئی۔ فلاسفہ و مورخین کی ایک بلند پایہ جماعت کی جماعت سامنے موجود ہو، اس کی آنکھون کے آگے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان اخلاقی تحریک کا نشوونما ہو رہا ہو، اور وہ متصل تین صدیون تک اس کی طرف سے اپنی آنکھین بند کیے رہے، یہ کچھ سمجھ مین آنے والی بات نہین، اور اس پر ہمین جتنا اچنبھا ہو، کم ہے۔ لیکن اس کا اصل باعث مذہب اور اخلاق کے حدود کا وہ اختلاف ہے، جس کا ذکر ہم باب گزشتہ مین کر چکے ہین، آج کل اگر کوئی شخص دنیا کے اخلاق مستقبل کا اندازہ لگانا چاہتا ہے، تو وہ یقیناً سب سے پہلے مذہبی نظامات کے اثرات پر توجہ کرتا ہے۔ لیکن عہد رواقیہ مین مذہب و اخلاق کے حدود بالکل علحدہ علحدہ تھے

اور دونون مین کوئی شی مشترک نہ تھی۔ مذہب کی اصل اہمیت فلسفہ کو حاصل تھی فلسفہ ہی کردار انسانی کا رہبر تھا، فلسفہ ہی غوامض الہیات کا حلاّل تھا، اور فلسفہ ہی قلب مین تعبد وخشوع کی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ غرض یہ کہ فلسفہ سے قطع نظر کرکے مذہب سکے کوئی معنے نہ تھے، بلکہ مذاہب وشرائع مروجہ کو تحقیر سکے ساتھ توہمات وخرافات کا لقب دیاجاتا تھا۔ ان مین بھی خصوصیت سکے ساتھ یہود کا مذہب اور بھی حقیر سمجھا جاتا تھا کیونکہ یہود اپنی عملی زندگی مین سب سے زیادہ شریر سب سے زیادہ ذلیل اور سب سے زیادہ ان میل تھے۔ اور ایک پرُلطف بات یہ ہے، کہ اہل رومہ مسیحیت کو یہودیت ہی کی ایک شاخ سمجھتے تھے۔ یہ دعوی آج کل کسی سکے سامنے کیاجاسے، تو اُسے بے اختیار ہنسی آجاسے، لیکن مسیحیت سکے بارے مین رومیون سکے معلومات اس قدر غلط ناقص اور دور از حقیقت ستھے، کہ اُن سکے بہتر سے بہتر مورخین (مثلاً ٹیکیٹس) اس دعوی کو بہ کمال سنجیدگی اپنی تحریرون مین جگہ دیتے تھے۔

مین اگرچہ اس تصنیف مین مذہبی مباحث سے بالکل الگ رہنا چاہتا ہون اور مسیحیت پر صرف اُس سکے ایک معلم اخلاق ہونے کی حیثیت سے نظر کرنا چاہتا ہون، تاہم بغیر اس سکے بتائے تو چارہ نہین، کہ مسیحیت کی کن کن اخلاقی اسباب سے ترویج ہوئی، اور معاصر فلسفہ سے اُس سکے تعلقات کس نوعیت سکے تھے؟ اب یہان سے اختلاف راسے شروع ہوتا ہے۔ ایک گروہ سنے رواقیۂ متاخرین اور قدما مسیحین کے عقاید وتعلیمات مین مماثلت دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ مسیحیت کو ابتدا ہی مین فلسفہ پر خاص اقتدار واثر حاصل ہوگیا تھا، اور رومہ سکے مشاہیر معلمین اخلاق مسیحیت ہی کے خوشہ چین تھے۔ دوسری جماعت اس طرف گئی ہے، کہ مسیحی علما سنے بیانات اناجیل کے ایسے زبردست شواہد پیش کیے، کہ منکرین کو مجال انکار نہ رہی۔ ایک اور فریق اشاعت مسیحیت کو تمام تر تائید ایزدی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے، کہ حالات

واسباب ہر طرح پر قبول مسیحیت کے مخالف وغیر مساعد تھے، اور اُسے جو کچھ کامیابی
حاصل ہوئی، وہ یکسر اُس کے منزّل من اللہ ہونے کے سبب سے تھی۔

ان نظریات مین سے نظریۂ اول کی بابت مجھے کچھ زیادہ کہنا نہین ہے۔ باب گزشتہ
مین جو کچھ کہہ چکا ہون، اس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ جب یہ مسلم ہے، کہ رومہ کے اکابر
اخلاقیین نے مسیحیت کا یا تو کبھی نام ہی نہین لیا، یا اگر کبھی نام لیا تو صرف تحقیر کی غرض
سے، جب یہ مسلم ہے۔ کہ اہل رومہ اپنے سوا تمام غیر مذاہب کو سخت بے اعتنائی بلکہ حقارت سے دیکھتے تھے،
اور جب یہ مسلم ہے، کہ ہمارے پاس رومیون کے مسیحیت سے متاثر ہونے کا قطعی
ثبوت ذرہ برابر بھی نہین موجود ہے، تو ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟
اس نظریہ کی بنیاد، درحقیقت، اس قیاس پر ہے، کہ چونکہ یہ تین چیزین مسیحیون اور رومیون
مین مشترک ہین، اس لیے ضرور ہے، کہ رومیون نے انھین مسیحیون سے اخذ کیا ہو۔
وہ تین چیزین یہ ہین:۔ محاسبۂ نفس، اخوتِ عامہ، اور عملی زندگی مین رحم و رافت۔
لیکن گزشتہ صفحات مین ہم یہ دکھا چکے ہین، کہ ان تینون چیزون کے مآخذ مسیحی لااصل
مطلقاً نہ تھے۔ محاسبۂ نفس کی تعلیم تو صریحاً فیثاغورث کے اصول کا جزو تھی، جو شیوع
مسیحیت سے مدتون قبل فیثاغورث کے عام عقاید کی اشاعت کے پہلو بہ پہلو رومہ
مین رائج ہوتی گئی۔ اسی طرح اخوت عامہ کا خیال صاف ان حالات کا نتیجہ تھا، کہ سیاسی
واجتماعی تغیرات کے باعث تمام دنیائے متمدن سمٹ کر رومی سلطنت مین سما گئی تھی،
جس کی بنا پر مختلف اقوام و طبقات مین میل جول کا بڑھ جانا، اور طبقہ وار و فرقہ وار امتیازات
کا مٹ جانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ سسرو و سنیکا دونون اس باب مین یکسان قوت کے ساتھ
اپنا اظہار خیال کرتے ہین۔ اس پر وحدت وجود کا اعتقاد، جو تمام ہستیون کو ذات باری
کا جزو اور اُسی سے ماخوذ سمجھتا ہے، اس خیال کا اور مُعین ہوا۔ رہی وہ رافت و انسانیت
جس کی جھلک ہمین متاخرین رواقیہ مین نظر آتی ہے، سو اُس کا ماخذ یونانی اثر کا غلبہ ہے۔

اس اثر کی بنا، رومن شہنشاہی کے قیام کے ساتھ ہی پڑنے لگی تھی، ہیڈرین کے زمانے مین اس تحریک کو اور تقویت پہونچی، اور پھر تمدن زائیدہ تعیش سے طبائع مین جو نفاست و لطافت پیدا ہو گئی تھی، اُس نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ باانیہمہ نظری و عملی دونون حیثیتون سے شاگرد (رومی) استاد (یونانیون) سے کبھی نہ بڑھے، مگر اس لحاظ سے، کہ یونان مین انسانیت کا تخیل ایک خاص حلقے کے واسطے محدود تھا، برخلاف اُس کے روم مین یہ کسی فرقے یا کسی طبقے کے لیے محدود و مخصوص نہ تھا۔

میرے علم مین اب تک جو کسی حد تک معقول استشہاد کیا جا سکا ہی، وہ سنیکا کی ایک استثنائی مثال ہی۔ دعوی یہ کیا جاتا ہی کہ یہ حکیم عہد نامہ جدید سے خاص طور پر متاثر تھا اور قرون وسطی کے مصنفین کا یہ عام خیال تھا، کہ یہ مذہبًا مسیحی تھا، جس کے ثبوت مین اس کی اور سینٹ پال کی مراسلت پیش کی جاتی تھی، مگر اس مراسلت سے متعلق جس پر تین صدیون تک کسی نے توجہ نہین کی تھی، اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہی، کہ وہ قطعًا جعلی ہی۔ اس کے ضمن مین اور بہت سے فرعی مباحث چھڑ گئے تھے، جن سے تعرض کرنا بحث فیہ سے الگ جا پڑنا ہی۔ تاہم ان سے یہ قطعی ثابت ہوتا ہی، کہ مسیحی طرز تحریر اور سنیکا کی طرز تحریر کی جس باہمی مماثلت پر اس قدر زور دیا جاتا ہی، وہ بجائے خود ایک فرضی و وہمی شی ہی، اور جو تھوڑی بہت واقعی مماثلت ہی اُس کا مدار صرف اتنے پر ہی، کہ بعض انجیلی فقرے اُڑتے پڑتے سنیکا کے کانون تک پہونچ گئے ہون گے۔ اس سے زیادہ کا جو شخص مدعی ہی، وہ مسیحیت و رواقیت کے مبادیات و اصول اولیہ تک سے ناواقف ہی۔ اُسے اس کی بھی خبر نہین، کہ ان دونون نے جو اخلاقی تخیل پیش کیے ہین، اُس کے لحاظ سے یہ دونون ایک دوسرے کی بالکل ضد ہین۔ مسیحیت کے اصول اولین کیا ہین؟ انکسار و فروتنی، انابت الی اللہ، عظمت و اجلال الٰہی، انسان کی ضعیف البنیانی و بیچارگی

اور آخرت کی جزا و سزا پر اعتقاد کامل۔ اس کے مقابلے مین سنیکا کے اخلاقیات کے عنوانات جلی کیا ہین؟ انسانی عظمت و رفعت، عالم عقبیٰ کی طرف سے بے اعتنائی عبد و معبود دونون کی تحسین و تفریق سے بے پروائی اور خالق و مخلوق کے درمیان عدم تفریق اور مروجہ امتیازات کی سعد دمیت۔ پھر یہود کے بارے مین کہ مسیحی انھین کی ایک شاخ سمجھے جاتے تھے، جانتے ہو کہ اس کا کیا خیال تھا؟ یہ کہ وہ ایک ”ملعون جماعت“ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان عقاید و خیالات کے شخص کو مسیحیت سے متاثر کہنا کہان تک جائز ہو سکتا ہے؟ ہان البتہ رواقیہ کی جماعت مین ایک شخص، اور صرف ایک شخص ایسا ہوا ہے، جو اپنی جماعت کے عام خصوصیات غرور و پندار سے آزاد ہوا ہے، اور جو اپنے ذاتی حلم فروتنی، و انکسار کی بنا پر مسیحی اخلاق سے لگا کھا سکتا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجیے گا، کہ خود اس کے (یعنی مارکس اریلیس) دامن عمل پر مسیحیون کو قبول مسیحیت پر سخت مواخذہ کرنے کے دھبے نظر آتے ہین، اور اس کے مقالات مین تصریح کے ساتھ مسیحی شہدا پر اظہار حقارت و نفرت ملتا ہے۔

فصل (۲)

متاخرین اخلاقیین روما پر مسیحیت کا اثر

شروع شروع مین مسیحی علما مین خود باہم اس بارے مین سخت اختلاف رہا ہے کہ اُن کے اور بت پرست فلاسفہ کے باہمی تعلقات کیا ہین۔ ان مین سے ایک گروہ سقراط کے قتل کو واجبی بتاتا تھا، اُس کے نام کے ساتھ تمسخر کرتا تھا، اُس کی تعلیمات کو شیطانی اثر کا نتیجہ قرار دیتا تھا، کمار روم کو جماعت ملاحدہ کے

لقب سے یاد کرتا تھا، اور اُن کا ذکر سخت سب وشتم کے ساتھ کرتا۔ دوسرا فریق اس کے مقابلے میں بت پرست حکماء کے فلسفہ و مسیح کی تعلیمات میں مماثلت دکھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس جماعت کے اکثر ارکان چونکہ بچپن سے فلسفۂ افلاطون کے خوگر ہوتے تھے، اس لیے اُنھیں قدرۃً اپنے معتقدات مذہب و تعلیمات فلسفہ کے درمیان مماثلت و مشابہت کے نظارے سے کمال مسرت حاصل ہوتی۔ اور بعض دفعہ ان کی یہ کوشش مطابقت جائز حدود سے متجاوز ہو کر مضحکہ خیز ہو جاتی۔ مسیحی علماء میں جسٹین مارٹیر سب سے پہلا شخص ہوا ہے، جس کی تحریروں میں فلسفیانہ شان پائی جاتی ہے۔ تمامتر اسی خیال کا ہوا ہے، اور اپنی اس کوشش میں اس نے عجیب عجیب دور از کار باتیں بیان کی ہیں۔ اس کا جانشین کلیمنٹ اسکندروی، نہایت وسیع النظر و بے تعصب شخص تھا، تاہم اس کی عقل پر عجیب بڑے بڑے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کہتا ہے کہ قدماء کے ذرائع معلومات دو تھے۔ ایک یہ کہ فرشتہ جو زمین پر آکر حسین عورتوں کے عشق میں مبتلا ہو جاتے تھے، وہ اپنی معشوقوں کی نظر میں اپنی عزت بڑھانے کے لیے علوم آسمانی، یعنی فلسفہ و الٰہیات کے مسائل انھیں بتادیا کرتے تھے۔ شدہ شدہ یہ باتیں لوگوں میں پھیلیں، اور حکماء انھیں کے مجموعہ کو فلسفہ کہنے لگے۔ مگر چونکہ ان فرشتوں کے معلومات بجائے خود نامکمل ہوتے اس لیے ان حکماء کا فلسفہ بھی ناقص رہ جاتا۔ ایک ذریعہ تو یہ تھا، اور دوسرا ماخذ توریت تھا۔ فلاطون کا فلسفہ، ہومر کی شاعری، ڈیماستھینز کی بلاغت، ملٹیاڈس کی جنگ جوئی، سب کچھ اسی سے ماخوذ تھا، بلکہ فلاطون نے براہ راست ایک اسرائیلی پیمبر کی تعلیمات سے استفادہ کیا تھا، اور فیثاغورث تو ایک مختون یہودی تھا۔

یہ ایک نمونہ تھا اُس طرز مناظرہ کا، جس سے مسیحی متکلمین اپنے مخالفوں کو ساکت کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ناظرین کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا، کہ ہمارے

پیشرو، مخالفانہ اعتراض کی قوت کو ذرہ بھر بھی تسلیم کرنے کے مقابلے میں بے بنیاد قصہ کس آسانی سے گڑھ لیتے تھے۔ مثلاً جب بت پرستون کی طرف سے یہ اعتراض پیش ہوتا کہ بائبل انسانی کلام معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بہت سے قصے وہی ہین، جو ہمارے یہان پیشتر سے مشہور تھے، تو اس کے جواب مین مسیحی علما یہ کہتے، کہ کلام ربانی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے شیاطین پیشتر سے جا کر آسمان سے ان قصون کو اُڑا لائے ہین، اور انھین دنیا مین مشہور کر رکھا ہے۔ یا کبھی کبھی اس سے بڑھ کر مسیحی علما یہ غضب ڈھاتے، کہ قدیم بت پرست مصنفین کے نام سے خود جعلی تصانیف کر کے ان کی طرف منسوب کر دیتے۔ لیکن یہ لحاظ رکھنا چاہیے، کہ باایںہمہ یہ ساری کوشش نہایت قدیم حکما سے متعلق کی جاتی تھی معاصر حکمائے رومہ سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ تو اکثر کہا جاتا تھا، کہ افلاطونؔ و فیثاغورث کی تعلیمات اور مسیحیت کے درمیان کوئی نہ کوئی خاص تعلق ہے، لیکن اس کا کوئی بھی مدعی نہ تھا، کہ سینیکا، مارکس آرلیس، ایپکٹیٹس مسیحیت سے خوشہ چین ہوئے ہین۔

فصل (۴)

معجزات اور رومہ کا قبول مسیحیت

غرض یہ دعوی تو بتمامہ مہمل ہے، کہ عروج رواقیت کے زمانے مین مسیحیت سے گروہ حکما متاثر ہوا، اور اس پر مزید گفتگو کرنا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ اب ہمین اس کی تحقیق کرنا ہے، کہ اہل رومہ مسیحی معجزات سے کہان تک متاثر ہوئے۔ لیکن اس بحث مین پڑنے سے قبل، یہ مسئلہ طے ہو جانا ہے، کہ خود معجزہ فی نفسہ

کیا ہی۔ اور اس پر یقین کرنے کے کیا اصول و شرائط ہین؛

آج کل ہم اپنے گرد و پیش یہ پاتے ہین، کہ بجز رومن کیتھولک کی ایک محدود جماعت کے تقریباً ہر تعلیم یافتہ شخص وقوع معجزات کا منکر ہی۔ عام حالت اس وقت یہ ہی، کہ ہر شخص، خواہ وہ کسی خاص معجزہ کا قائل ہو، لیکن عموماً خرق عادت کی روایات کو، جو مستند سے مستند قدیم مورخین مین پائی جاتی ہی قطعاً غلط سمجھتا ہی، حالانکہ اگر وہی راوی کوئی معمول بہ واقعہ بیان کرتے ہین، تو اُسے بلا تامل تسلیم کر لیتا ہی۔ اس انکار کی یہ وجہ تو ہو نہین سکتی، کہ یہ بیانات عقلاً محال ہوتے ہین، کیونکہ معجزات مزعومہ کی ایک بڑی تعداد یقیناً ایسی موجود ہی، جن مین کسی قسم کا استحالۂ منطقی یا عدم امکان نہین۔ مثلاً اس قسم کی روحانی مجرد ہستیون کے وجود کے تسلیم کرنے مین کیا استحالہ لازم آتا ہی جو انسان سے بدرجہا زاید عقل و قوت رکھتی ہین، اور اس بڑھی ہوئی عقل و قوت کی بنا پر ایسے ایسے افعال کرتی رہتی ہین، جو ہمارے لیے ویسے ہی حیرت انگیز ہوتے ہین، جیسی ہماری ایجادین ریل، تار وغیرہ کی، افریقہ کے وحشیون کے لیے ہوتی ہین۔ اور نہ پھر اس انکار کی یہ وجہ ہو سکتی ہی، کہ ان کے راوی ضعیف ہوتے ہین۔ کیونکہ ہم بہت سے معجزات کے نام لے سکتے ہین۔ جن کے وقوع کے راوی ویسے ہی ثقہ اور اتنے ہی کثیر التعداد ہوئے ہین۔ جتنے مستند سے مستند تاریخی واقعات کے۔ صدہا معمولی بہ تاریخی بیانات کو ہم محض معمولی درجے کے ایک آدھ مورخ کے اعتماد پر تسلیم کر لیتے تھے، لیکن جب مستند سا مستند رومی مورخ پورے وثوق کے ساتھ بھی کسی خرق عادت کا ذکر کرتا ہی، تو ہم بلا تامل اس کی قطعی تغلیط و تکذیب پر اپنے تئین آمادہ پاتے ہین، اور گویا زبان حال سے صاف صاف کہتے ہین، کہ معجزات کا وقوع

ممکن ہی نہیں۔

پس اگر میرا خیال صحیح ہے، تو آج کل کے تعلیم یافتہ نفوس میں معجزات سے متعلق شک و تذبذب نہیں، بلکہ قطعی و بلا دلیل انکار پایا جاتا ہے۔ یہ صورت حال حیرت انگیز ہے، نہ صرف اس لیے کہ اس عام انکار کے پہلو بہ پہلو چند مخصوص معجزات کو بھی تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ یہ انکار کسی برہان و استدلال کا نتیجہ نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ امتداد زمانے کے اثر سے معجزات پر سے اعتقاد خود بخود ہٹ گیا ہے۔

ذہن میں یہ کیفیت کس طریق سے پیدا ہوئی؟ اسے سمجھانے کے لیے ہم ایک صاف اور کھلی ہوئی مثال دیتے ہیں۔ یہ مثال پریوں کے وجود کی ہے۔ آج کسی تعلیم یافتہ شخص کی بابت یہ کہہ دیجیے، کہ وہ پریوں کے وجود کا قائل ہے، تو وہ اسے اپنی انتہائی توہین سمجھے گا۔ لیکن اگر انھیں حضرت سے انکار کی دلیل پوچھیے تو انھیں مشکل پڑ جائے گی۔ ہم کہتے ہیں، کہ ان کے ماننے سے آخر کیا استحالہ لازم آتا ہے؟ کن محالات عقلی کا سامنا کرنا ہوتا ہے؟ کون سے قوانین منطق کی خلاف ورزی ہوتی ہے؟ پری نام ہے ایک لطیف ہستی کا، جو پرندوں کی طرح ہوا میں اڑتی ہے، انسان کی طرح عقل و شعور رکھتی ہے، ناچنے کا سودا رکھتی ہے، اور شاید نباتات کے خواص سے خاص طور پر واقف ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک تو ایسے وجود کے امکان میں کوئی بھی منطقی تناقض و استحالہ لازم نہیں آتا۔ روایۃً دیکھیے تو اس سے زیادہ مضبوط شہادت کس کے وجود کی ہو سکتی ہے؟ صدیوں تک لوگ ان کے وجود پر ایمان کامل رکھتے رہے۔ اب بھی کوئی ملک و صوبہ کیا معنی، کوئی گاؤں و قریہ بھی، مشکل سے ایسا نکلے گا، جہاں پریوں کے نظارے کے، چشم دید یا سماعی شاہد نہ موجود ہوں۔ یہ تمام شواہد خواہ قطعی ثبوت کے لیے

کافی نہ ہوں تاہم ان سے اتنا تو ہر حال ثابت ہوتا ہے کہ پریوں کا وجود کوئی ایسا
مسئلہ نہیں، جسے سرسری طور پر یا ہنسی میں اُڑا دیا جائے، بلکہ اس قابل ضرور ہے
کہ انسان اس پر غور سے کام لے۔

لیکن عملاً ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ عملاً یہ ہوتا ہے کہ جاہل غیر تعلیم یافتہ آبادیوں
میں رات دن پریوں کے تذکرے رہتے ہیں لیکن جوں جوں تعلیم پھیلتی جاتی ہے،
یہ عقیدہ لوگوں کے دلوں سے از خود محو ہوتا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
پریوں کے قصے، ایک خاص سطح تخیل کے پیداوار ہوتے ہیں، اور جوں جوں
انسان اُس سطح سے اوپر ہوتا جاتا ہے، یہ عقیدہ از خود پیچھے چھوٹتا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ وحشی جب اپنے چاروں طرف نظر کرتا ہے، اور نظام کائنات کے
بابت کوئی رائے قائم کرنے لگتا ہے، تو وہ تین عظیم الشان غلطیوں کا شکار رہتا ہے،
جو آگے چل کر اُس کی تمام رایوں کو فاسد کرتی ہیں۔ اس کی تین اصولی غلط فہمیاں یہ
ہوتی ہیں:- (۱) زمین مرکز کائنات ہے، اور جملہ موجودات اہل ارض کے لیے آفرینش
کی گئی ہے۔ (۲) روئے زمین کا ہر اہم تغیر و تبدل، خصوصاً واقعۂ موت، کسی نہ کسی
تاریخی واقعہ سے وابستہ ہے۔ (۳) ہر اہم واقعہ کسی ذی ادراک و ارادہ روح یا مادہ کے
اشارہ سے انجام پا رہا ہے۔ پھر ان تین غلط اصولوں کے گرد، افسانوں کا ایک میلہ
لگ جاتا ہے۔ وحشی کے قریب اگر کوئی پتھر آ کر گرتا ہے، تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ کسی شخص
نے اسے پھینکا ہے۔ تارہ ٹوٹتا ہے، تو اُس کے خیال میں یقیناً یہ کسی آسمان نشین
ہستی کی حرکت ہوتی ہے، غرض یہ کہ وہ اسی طرح ہر غیر معمولی واقعہ، شہاب ثاقب، طوفان
وبا، وغیرہ کو براہ راست و علیحدہ علیحدہ کسی قوت ارادی کا معلول سمجھتا ہے۔ گویا اُس کے
نزدیک نظام کائنات، کسی ایک خاص آئین و ضابطے کے ماتحت نہیں، بلکہ
ہر فعل کا صدور علیحدہ علیحدہ کسی دیوتا یا پُر قوت ہستی کے ارادے سے ہوتا ہے۔

اس بنا پر معجزات کا وقوع نہ کسی عادت کا خارق ہے، اور نہ حیرت انگیز۔

اِن اہم عقلی خصوصیات کی تائید میں چند اور ضمنی مویدات بھی پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً ایک بات یہی ہے کہ بیجان چیزوں کو جاندار سمجھا جانے لگتا ہے۔ شاعری و خطابیات کا ذکر نہیں، جہاں اس شے کا استعمال، بطور ایک صنعت کے قصداً کیا جاتا ہے۔ بلکہ جن مسائل میں ہم سنجیدگی سے رائیں قائم کرتے ہیں، اُن میں بھی ہمارے نفس کی یہ خصوصیت ہم کو بلا ارادہ متاثر کرتی رہتی ہے۔ جاہلوں و وحشیوں سے ذرا دیر کے لیے قطع نظر کر کے آپ خود اپنی حالت کا امتحان لیجیے، کہ آپ ایک تعلیم یافتہ و شایستہ فرد، اور ایک متمدن جماعت کے رُکن ہیں۔ آپ اُٹھ کر چلتے ہیں، اور اتفاقاً دروازہ میں آپ کے زور سے ٹھوکر لگتی ہے۔ غور کر کے بتائیے، کہ عین اس وقت آپ میں کون جذبہ پیدا ہوتا ہے؟ کیا صرف چوٹ کے درد و تکلیف کا؟ نہیں، بلکہ ساتھ ہی غیظ و غضب کا۔ ٹھوکر لگتے ہی بے تحاشہ دروازے پر غصہ آتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ اُس سے فوراً انتقام لیا جائے۔ گو عقل آکر فوراً ہاتھ پکڑ لیتی ہے، اور غصہ سرد پڑ جاتا ہے۔ یہ کیفیت جب اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ و متمدن افراد میں موجود ہوتی ہے، تو ناتعلیم یافتہ غیر متمدن افراد میں تو یہ بدرجہا بڑھی ہوئی ہوگی۔ اسی جذبہ جبلی کے اقتضا سے انسان، ہر اُس شے کو جس سے وہ تیزی کے ساتھ متاثر ہوتا ہے، ذی روح سمجھنے لگتا ہے؛ اسی کے اقتضا سے وحشی افراد اپنے معبودوں کو بشری الصفات سمجھتے ہیں؛ اور اسی صنعت تخیل کے باعث وہ اپنے تمام کیفیات غیر مادی کو قالب مادی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مختلف جذبات کے کشاکش کو وہ دو مختلف رُوحوں کی جنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح سے رفتہ رفتہ افسانوں اور دیومالا کا ایک طومار تیار ہو جاتا ہے۔

پس جب تک تمدن ایک خاص پست سطح تک رہتا ہے، ہمیں اس پر

مطابق حیرت نہ کرنا چاہیے، کہ اس میں معجزات وخوارق عادات کا خاص شہرہ رہتا ہے
یہ تو اُس مخصوص سطح اور مخصوص موثرات کا لازمی نتیجہ ہے جسے وہ رکھتے کے لیے ہمیں
بالکل اسی طرح تیار رہنا چاہیے، جیسے فصل بہار میں شادابی اور برسات میں بارش
کے لیے۔ ایسے وقت میں، جبکہ قوت تنقید مفقود ہو جبکہ ارتقا کے تخیل سے دماغ یکسر
بیگانہ ہوں، جبکہ قانون قدرت وناموس فطرت کے الفاظ غیر مفہوم ہوں، اعاظم رجال
کی شخصیت کے گرد، محیر العقول افسانوں کا حلقہ قایم ہو جانا، بالکل قدرتی ہے، ہر ملک
وہر زمانے میں برابر یہی ہوتا رہا ہے۔ تا آنکہ اشاعت ترقی تعلیم نے صورت حال بدل دی
ہے۔ مشرق ومغرب کے مروجہ افسانوں کا مقابلہ کرو، ہر ملک کے معجزات وافسانے
دوسرے ملک کے معجزات وافسانوں سے بلحاظ نوعیت بالکل متحد نظر آئیں گے
فرق جو کچھ ہوگا وہ مختص القوم ومختص المقام حالات کی بنا پر جزئیات میں ہوگا جن چیزوں
کو ایک ملک میں پری کہتے ہیں، دوسرے میں اُنھیں کو چڑیل کہتے ہیں۔ ایک ہی
شے کا نام کہیں دیو پڑ گیا ہے، اور کہیں بھوت۔ یہ توہمات جو عالمگیر طور پر رائج ہوتے
ہیں، کہیں کہیں ہمیں ان کے مخصوص ومتعین اسباب بھی مل جاتے ہیں، مثلاً یہ خیال
کہ آفتاب زمین کے گرد حرکت کرتا ہے، صدہا افسانوں کے وضع کیے جانے کا
باعث ہوا۔ یا مثلاً مرض مالیخولیا جس میں آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے، کہ وہ کوئی حیوان
بن گیا ہے، جن وآسیب وغیرہ کے سیکڑوں قصوں کا اصل مبنیٰ ہوا ہے، لیکن
اکثر ان کا کوئی مخصوص ومتعین سبب نہیں ملتا، اور ہمیں صرف اس مشاہدہ پر
قانع ہونا پڑتا ہے، کہ معجزات وتوہمات کی اشاعت، سوسائٹی کی ایک خاص سطح
کے متناسب ہوتی ہے۔ جب تک وہ سطح قایم رہتی ہے یہ افسانے بھی رائج رہتے ہیں،
اور جب تمدن اس سطح سے اونچا ہو جاتا ہے، تعلیم پھیلنے لگتی ہے، دماغوں میں
روشنی وشایستگی آجاتی ہے، تو ان توہمات پر سے اعتقاد خود بخود ہٹ جاتا ہے۔

اس سے ہمارا یہ مقصود ہرگز نہیں، کہ معجزہ کا وجود ناممکن ہے، بلکہ ہم اس بیان سے اعتقاد معجزات و غیر تعلیم یافتگی کا تلازم دکھانا چاہتے ہیں۔ بھوت پریت کے وجود کے ہم نہ منکر ہیں نہ مدعی، لیکن یہ ضرور کہیں گے، کہ اگر ان کی رویت اور دماغ کی سرسامی حالت میں تلازم پایا جاتا ہے، تو ہر صحیح الدماغ شخص بجائے خود فیصلہ کر سکتا ہے، کہ ان کا وجود کہاں تک ثابت شدہ ہے۔

اشاعت تعلیم کے ساتھ اعتقاد معجزات کے مٹتے جانے کے اسباب ہمارے خیال میں تین ہیں۔

(۱) اولاً۔ تعلیم کا ایک اثر یہ ہوتا ہے، کہ غیر محدود متخیلہ مقید و محدود ہو جاتا ہے۔ انسان بجائے خیالی پلاؤ پکانے کے حقایق و واقعات پر زیادہ متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اس لیے ہر روایت کو قبول کرنے کے لیے بہ نسبت ایک غیر تعلیم یافتہ شخص کے، زیادہ قطعی ثبوت کا طالب ہوتا ہے۔

(۲) ثانیاً۔ دور جہالت میں انسان ہر شے کو ذی روح و صاحب ارادہ سمجھتا رہتا ہے۔ تعلیم کی افزونی، نفس میں قوت تجریہ کو بڑھا کر اس کیفیت کو گھٹاتی ہے۔

(۳) ثالثاً۔ سائنس کی ترقی، کائنات کے مستقل النظام ہونے کا یقین دلا دیتی ہے۔ وحشیوں کا خیال ہوتا ہے، کہ نظام کائنات کسی خاص آئین و ضابطہ کا پابند نہیں، لیکن سائنس کے اصول اس کے بالکل منافی ہیں۔ سائنس سے معلوم ہوتا ہے، کہ تمام کائنات کا نظم و نسق، چند خاص ضوابط و قوانین کی ماتحتی میں انجام پا رہا ہے، جو قانون ہے، وہ جس طرح آفتاب و ماہتاب پر حاوی ہے، اسی طرح ایک ذرہ ریگ پر بھی عامل ہے، بڑے سے بڑے اور عجیب سے عجیب اجرام فلکی، اور حقیر سے حقیر مخلوقات خاکی سب ایک ہی قانون، ایک ہی آئین کی محکوم ہیں۔ سائنس کی ترقی سے صدہا امور جو پہلے کرامات و خرق عادت کے دائرے میں تھے، اب عقل و علم کی روشنی میں

آ گئے۔ دمدار ستارہ کا نکلنا، تارہ کا ٹوٹنا، پہلے کسی بلائے عظیم کا مقدمہ سمجھا جاتا تھا اب معلوم ہوا، کہ وہ ایک معمولی طبعی واقعہ ہے، اور مدتوں پیشتر سے اس کے وقت کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ پہلے جو آسیب زدہ سمجھے جاتے تھے جن کے سروں پر جن اور بھوت آیا کرتے تھے، اور جو درگاہوں و مزاروں پر کھیلا کرتے تھے۔ اب وہ معمولی دماغی امراض میں مبتلا نکلے، اور اسپتالوں و شفاخانوں میں کامیابی کے ساتھ ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ پہلے برق زدگی سے بچنے کے لیے دعائیں مانگی جاتی تھیں، ٹوٹکے کیے جاتے تھے، لیکن اب ایک نیم ملحد شخص (بنجمن فرانکلن) نے ایک برقی تار ایجاد کر دیا ہے، جو ہمارے کلیساؤں اور صلیبوں کو آسانی سے بجلی کی زد سے محفوظ رکھتا ہے۔ غرض ہر شعبۂ کائنات، ہر صیغۂ موجودات میں ایک خاص نظام، ایک خاص آئین، اور ایک خاص ضابطہ کا پتہ چلتا ہے، جس سے ہمارے سائنس دانوں میں بجا طور پر یہ یقین پیدا ہو گیا ہے، کہ دنیا، چند متعین قوانین قدرت کے بل پر چل رہی ہے، جس میں کہیں فرق و شکست نہیں، اور یہ خیال کرنا کہ کوئی حاکم اعلیٰ اس کارخانے میں ہر وقت دخل دیتا رہتا ہے، ایک تصور بے معنی بلکہ سراسر وہم پرستی ہے۔

اشاعت تعلیم و سائنس کی ان خصوصیات کا اثر بھی عقیدۂ معجزات پر تین مختلف طریقوں پر پڑا:۔

(۱) اول یہ کہ صدہا افسانے، جو کائنات کی بے آئینی پر مبنی ہوتے ہیں، وہ خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ مثلاً قدما یہ جو کہا کرتے تھے، کہ فلاں فلاں مرتبہ شہاب ثاقب کے نمودار ہونے پر فلاں فلاں شدید بلاؤں کا ظہور ہوا، اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا، کہ شہاب ثاقب کا ظہور ایک خاص طبعی قانون کا محکوم ہے، اس کی نحوست کا اثر دلوں سے، از خود زائل ہو گیا۔

(۲) دوسرے یہ کہ نظام کائنات کے مختلف اجزا کے باہمدگر مربوط و وابستہ ہونے نے بھی بہت سی وہم آرائیون کا خاتمہ کر دیا۔ جس زمانے مین یہ لوگ یہ سمجھتے تھے، کہ زمین ساکن ہے، اور آفتاب محض ایک کرۂ نور ہے، جو اس کے گرد گھومتا ہے، اُس وقت یہ تسلیم کر لینے مین کچھ زیادہ استبعاد نہین نظر آتا تھا، کہ کسی پیمبر یا بزرگ کی دعا سے آفتاب کی حرکت تھوڑی دیر کے لیے رک گئی۔ لیکن اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ آفتاب کا وجود کائنات سے بے تعلق نہین، بلکہ اس کی حیثیت صرف ایک عظیم الشان نظام سیارگان کے مرکز کی ہے، جس کے گرد صدہا سیارے ہر وقت ایک خاص ترتیب وقت اور ایک خاص اسلوب و وضع کے ساتھ گردش کرتے رہتے ہین، تو یہی معجزہ سخت مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح زمانۂ قدیم مین یہ دعوی، کہ کوئی نباتات خوار حیوان دفعۃً گوشت خوار ہو گیا، چندان عجیب نہین معلوم ہوتا تھا، لیکن اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ اس واقعہ سے صرف ایک تغیر مذاق لازم نہین آتا، بلکہ یہ اس کا بھی مستلزم ہے، کہ اس کے آلات ہضم و دانت وغیرہ سب بدل گئے ہون، تو ظاہر ہے کہ اس کا استبعاد بدرجہا بڑھ جاتا ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ علوم جدید کی ترقی نے صدہا اُن معتقدات و نظریات کا بھی خاتمہ کر دیا، جو تمامتر اس خیال پر مبنی تھی، کہ کرۂ ارض مرکز کائنات ہے۔ اب جبکہ ثابت ہو چکا ہے، کہ کرۂ ارض مرکز نہین، بلکہ منجملہ کرات دوری کے ایک یہ بھی ہے، جبکہ یہ طے ہو چکا ہے کہ زمین کا وجود ۶۰۰۰ ہزار سال سے نہین بلکہ لاکھون کرورون سال سے قائم ہے، اور جبکہ ہزارہا مشاہدات و تجربات نے اس حقیقت کو مسلم کر دیا ہے کہ نظام کائنات قطعاً ایک قانون و آئین کی پابندی مین چل رہا ہے، جس مین کسی خارجی حاکم کا دخل دینا ایک مہمل خیال ہے، تو لازمی طور پر انسان کو اپنے خیالات پارینہ پر نظرثانی کرنا پڑتی ہے۔ ان نئے حقائق و واقعات کی روشنی مین وہ اپنے معلومات سابقہ کو

جانچتا ہے، اور اپنے متخیلے کے حدود کو ان جدید معلومات کے مطابق بناتا ہے۔

بہت سے لوگوں کے دماغ میں اس شعبہ کائنات سے متعلق، سائنٹفک آئین کی قطعیت و ہمہ گیری کا تصور ابھی کامل نہیں ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس صیغے میں کوئی حاکم علی الاطلاق اب بھی دخل در معقولات کرتا رہتا ہے۔ مثلاً اگرچہ تغیرات جوی بہ حیثیت مجموعی قوانین سائنس کے ماتحت ہیں، تاہم بارش کی کمی و بیشی اسباب طبعی پر نہیں، بلکہ انسان کے طرز عمل و دعاؤں پر منحصر ہے۔ قحط و خشک سالی، اور طوفان و سیلاب، ان لوگوں کے نزدیک اسرار ربانی ہیں، اور یہی خیال اُن کا بعض امراض سے متعلق ہے۔ جن امراض کے اسباب کی پوری طبی تحقیقات ہو چکی ہے، انھیں تو یہ معمولی بیماریاں سمجھتے ہیں، لیکن جن کی ابھی اس قدر کامل تحقیقات نہیں ہو چکی ہے، انھیں یہ قہر الٰہی و عذاب خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے، کہ جوں جوں ان امراض کی طبی تحقیقات مکمل ہوتی جاتی ہے، رفتہ رفتہ یہ برابر سائنٹفک قوانین کی ماتحتی میں آتے جاتے ہیں، اور ان سے شفا یابی اصول حفظان صحت کو ملحوظ رکھنے پر منحصر ہوتی جاتی ہے، نہ کہ خوش اعمالی و بداعمالی پر۔ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ اس قہر الٰہی کے نتائج علی العموم بالکل برعکس نکلتے ہیں۔ مثلاً ایک بار جب انگلستان کے مویشیوں میں ایک سخت وبا پھوٹی، تو مقدس کلیساؤں سے صدائیں آنے لگیں کہ آج کل انجیل پر جو دریدہ دہنی سے تنقید کی گئی ہے، یہ اس پر قہر الٰہی نازل ہوا ہے۔ لیکن اس لطیفے کو دیکھیے، کہ جن مصنفین کے قلم سے یہ تنقیدیں شائع ہوئی تھیں، اُن کے پاس مویشی تھے ہی نہیں، اس لیے وہ اس عذاب سے بالکل محفوظ رہے، اور جنھیں اس وبا سے سب سے زیادہ نقصان پہونچا، یعنی زراعت پیشہ دیہاتی، وہ بیچارے وہ لوگ تھے، جن کے کان میں ان ملحدانہ تحریروں کی کبھی بھنک نہیں پڑی تھی۔ پھر یہ بھی کبھی مشاہدے میں نہیں آیا،

کہ جو لوگ ان تحریروں کو زیادہ شوق سے پڑھتے تھے، ان کا نقصان زیادہ ہوتا، اور دوسروں کا کم، بلکہ دیکھا یہ گیا کہ غلہ کی گرانی سے گنہگار و بے گنہ، ملحد و زاہد رند و شیخ، سب یکسان مصیبت مین گرفتار رہے۔ ان بدیہی کمزوریوں اور نقائص کے باوجود بھی سنجیدہ سے سنجیدہ اشخاص مدتوں قہر الٰہی کے نظریہ پر ایمان رکھتے رہے۔

ان وہم پرستیوں کا اصلی باعث میرے نزدیک یہ ہے، کہ لوگ اس پر غور نہین کرتے، کہ اس قسم کے مسائل کسی بڑی حد تک استقرائی اصول پر حل کیے جانے کے قابل ہین۔ مفہوم چند مثالون کی مدد سے ہم سمجھاتے ہین۔

(۱) مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے، کہ وبا گناہون کے پاداش مین بھیجی جاتی ہے تو اس دعوی کی تصدیق و تکذیب یون ہو سکتی ہے کہ پہلے ہم وبا کی تاریخ کا سراغ لگائین، یعنی یہ تلاش کرین، کہ یہ وبا کس زمانے مین پھیلتی رہی ہے پھر اس کا تفحص کرین، کہ سیہ کاری و بدچلنی کا کن کن زمانون مین زیادہ زور رہا ہے، اور پھر یہ دیکھین کہ یہ دونون واقعات (یعنی وبا کا پھیلنا اور گناہون کا عام ہونا) کتنی مرتبہ متعاصر رہے ہین۔

(۲) یا مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلان جنگ کسی فوجی فضیلت کی بنا پر ایک فریق کے حق مین نہین فتح ہوئی، بلکہ تائید ایزدی کی بنا پر، تو ہمین اس کا ویسے ہی تجربہ و اختیار کرنا چاہیے، جیسے قوت برقی کا کیا گیا تھا۔

(۳) یا مثلاً جب یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ کوئی خاص مذہب منزل من اللہ ہے، تو اصول استقراء کے مطابق اس دعوی کی جانچ ان طریقون پر کرنا چاہیے کہ اس کی تعلیمات مین کوئی تناقض، کوئی رد و بدل، کوئی ترمیم و اضافہ تو نہین ہوا ہے؟ اس نے کبھی حقائق تجربی کی مخالفت تو نہین کی؟ اس نے کبھی عوام کے غلط معلومات کی تائید تو نہین کی؟ اس نے کبھی محققین کی راہ اجتہاد و

وانکشافات میں ان کی مزاحمت تو نہیں کی ؟ وغیرہ۔

(۴) یا جب کبھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں مذہب کی اشاعت محض تائید غیبی سے ہوئی، تو ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا اسباب طبعی کی بنا پر اس کی توجیہ کسی طرح ممکن نہیں ؟

اس طرح مذہب سے متعلق جتنے عجیب دعوی کیے جاتے ہیں، ہم سب کی تحقیق، استقرائی اصول پر کر سکتے ہیں۔ بعض جگہ، بے شبہ، تعدد اسباب و پیچیدگی حالات کے باعث ہمیں کسی خاص نتیجہ پر پہونچنا دشوار ہوگا، مثلاً جنگ میں کامیابی حاصل کرنا ظاہر ہے کہ صدہا مختلف پیچیدہ و گوناگون اسباب و حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی ہنگامی اتفاقات کی بنا پر ہم صحیح نتیجہ پر پہونچ سکیں گے تاہم اس طرح کے عوامل خارجی کو حذف کرنے کے بعد اکثر حالتوں میں صحیح سبب تلاش کر لینا یقیناً ہمارے بس کی بات ہے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ تاریخ کا ہر انقلاب عظیم اپنے جلو میں فرعی نتائج کی ایک بڑی فوج سا تھ رکھتا ہے، جو اگر کھلا واقعہ واقع ہوا ہوتا، ہرگز وجود میں آتے فرض کیجیے، اگر ہنیبال اپنی عظیم الشان فتح کے بعد، روم کو بالکل تاخت و تاراج کر دیتا، تو کیا ہوتا ؟ یہ ہوتا کہ رومن سلطنت کو عروج نہ حاصل ہوتا، اور اس سے جو کچھ نتائج نکلے ہیں، یہ کبھی نہ نکلے ہوتے۔ رومی تمدن کی جگہ، ایک بحری، تجارتی و پرامن سلطنت قائم ہوئی ہوتی جس کے تمدن کی نوعیت رومی تمدن سے بالکل مختلف ہوتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے اثرات رومی تمدن کے پیدا کردہ اثرات سے زمین و آسمان کا فرق رکھتے۔ اگر یہ کہیں ہو گیا ہوتا، تو ہمارے حاملین شریعت فوراً ہنیبال کو ایک فرشتہ غیبی قرار دے کر اس کے تمام کارناموں کو معجزات کہہ ڈالتے۔

پس اگر ہم ان معاملات میں کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنا چاہتے ہیں، تو چاہیے کہ واقعات تاریخی پر ایک بالکل غیر جانبدارانہ وبسوط نظر رکھیں ہمیں اس کی خوب جانچ کرنا چاہیے کہ آیا واقعات کی رفتار کسی خاص سمت میں اس تواتر وتسلسل کے ساتھ رہی ہے، جو اسباب طبعی کی بنا پر ممکن نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ نہ صرف ان واقعات کو ملحوظ رکھیں جن سے ہماری تائید ہوتی ہے، بلکہ انھیں بھی پیش نظر رکھیں، جن سے ہماری تردید ہوتی ہے۔

مگر ایسا علی العموم نہیں کیا جاتا۔ کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس لیے کہ بقول بیکن، لوگ وہ نشانے تو یاد رکھتے ہیں، جو لگ جاتے ہیں، اور انھیں بھول جاتے ہیں، جو خطا ہو جاتے ہیں۔ جو جو سندیں انھیں اپنے موافق ملتی ہیں وہ انھیں یاد رہ جاتی ہیں، مگر جن مثالوں سے ان کی مخالفت ہوتی ہے، انھیں وہ بھلا دیتے ہیں۔ نیک کردار و فرشتہ خو سلاطین عظام کو وہ سند میں ہر جگہ پیش کرتے ہیں، لیکن تیمور، بایزید، ہنیبال، وغیرہ ظلم مجسم فرمانرواؤں کو اپنی زندگی میں جو عظمت حاصل ہوئی، اُسے وہ دبا جاتے ہیں۔ کسی اجنبی ملک میں تبلیغ مذہب کے لیے سو مشنری جاتے ہیں۔ ان میں سے ننانوے ہلاک ہو جاتے ہیں، اور کوئی اُن کا نام بھی نہیں لیتا، لیکن ایک اتفاق سے بچ جاتا ہے، اور اُسے اپنے کام میں کچھ کامیابی بھی ہو جاتی ہے، بس اُسی کی کامیابی یادگار رہ جاتی ہے، اور اسے بلند آہنگی کے ساتھ اس دعوی کی ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ تائید ایزدی اس مذہب کے سر پر ہے۔ ایک مذہب مختلف ملکوں میں داخل ہوتا ہے، ہر جگہ مختلف جنگی وسیاسی حالات پیش آتے ہیں جن کی بنا پر کہیں اس کا قدم جم جاتا ہے، اور کہیں سے اکھڑ جاتا ہے، لیکن اول الذکر واقعہ کی تمام مثالیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں، اور آخر الذکر کی، گویا پتھر کی لکیر ہو جاتی ہیں

جن سے قدم قدم پر تائید ربانی کا استشہاد کیا جاتا ہے۔ عرصۂ دراز کے امساک باران کے بعد حسب اتفاق خود بارش کا ہونا قرین قیاس ہو جاتا ہے، لوگ دعا کے لیے مجتمع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کبھی پانی برستا ہے اور کبھی نہیں۔ لیکن کتنے آدمی ایسے ہیں جو پانی نہ برسنے کی مثالوں کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھتے ہیں؟ یہ چند نمونے تھے اس عام کیفیت نفسی کے جس کا ظہور نہایت کثرت سے ہوتا رہتا ہے۔

زیادہ افسوسناک یہ واقعہ ہے کہ اس طرح کے واقعات ہمیشہ از خود ذہن سے محو نہیں ہو جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات قصداً بھلائے جاتے ہیں۔ ایک عام توہم بچپن ہی سے دلوں میں جا گزین ہے کہ پرہیبت واقعات طبیعی کی سائنٹفک تحقیق کرنا اسرار ربانی کے ساتھ بے ادبی کرنا ہے، اس نے بہت سے امور میں ہمارے قوائے تحقیق و تنقیح کو شل کر رکھا ہے۔ ایک پادری صاحب کی زبان سے اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں کہ

"ایک فلسفی راہ میں کچھ آدمیوں کے ہمراہ سفر کر رہا تھا، اتنے میں زور کا طوفان آگیا۔ خوب بادل گرجنے لگا، اور بجلی چمکنے لگی۔ مسافر پریشان ہوئے، فلسفی انھیں تسکین دینے لگا، اور رعد و برق کے اسباب طبیعی پر تقریر کرنے لگا۔ ابھی اس کی بے ادبانہ گفتگو ختم بھی نہیں ہوئی تھی، کہ دفعۃً بجلی گری، اور وہ فلسفی صاحب انتقال کر گئے۔ اس سے زیادہ واضح طور پر خدا اس شخص کو کیا سزا دے سکتا تھا، جو اس کے پرہیبت کارناموں سے مرعوب و متحیر ہونے کے بجائے ان کی تحلیل و توجیہ میں مشغول رہے"

ان پادری صاحب کے نزدیک گویا رعد و برق کے اسباب طبعی کی تحقیق کرنا ہی

شدید گستاخی ہے جس کا مرتکب سزائے موت کا مستحق ہے۔ اخیر ادوی واقعات میں تو ایسا نہیں، لیکن تاریخی مسائل میں تو ہر شے کی اسباب طبعی کی بنا پر تحقیق کرنے کو ایک بڑا گروہ اب بھی معصیت شدید سمجھتا ہے۔

میری معروضات کا یہ منشا ہرگز نہیں، کہ موثرات اخلاقی کو انسان کی مسرت وکامیابی میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ میرا منشا ہے، کہ میں کائنات میں تصرفات ایزدی کے وجود کے امکان سے انکار کروں۔ بلکہ میرے نزدیک تو ایسا ہونا بالکل ممکن ہے، اور اس میں کوئی استحالہ نہیں، لیکن کسی شے کا ممکن ہونا علیحدہ ہے اور اس کا واقعۃً ہونا علیحدہ۔ اور میرا خیال ہے، کہ اس کائنات کے نظام میں ایسے امکان کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کوئی شخص اس کی واقعیت کو ثابت نہیں کر سکتا اس سے قطع نظر کر کے میرے نزدیک عام مصنفین کی اصلی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی تمام بحث کو ان دو مسائل تک محدود رکھتے ہیں، ایک یہ کہ معجزہ کا وقوع کہاں تک ممکن ہے؟ دوسرے یہ کہ کسی معجزہ کا جو ثبوت پیش کیا جاتا ہے اس کی کیا نوعیت ہونی چاہیے؟ لیکن جو سوال اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم ہے، وہ ان دونوں کے علاوہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی جماعت میں معجزہ پر یقین لانے کی صلاحیت و استعداد کہاں تک موجود ہے؟ یہ سوال میرے نزدیک اہم المسائل ہے۔

میری تحریر سے غلط فہمی نہ ہونا چاہیے، میرے مفہوم کا خلاصہ دو لفظوں میں ادا ہو سکتا ہے:-

ایک یہ کہ معجزات کا اصلی مبدا و ماخذ یہ خیال ہے، کہ کوئی معبود نظام کائنات میں ہر وقت خود مختارانہ دخل دیتا رہتا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ تخیل ذہن میں کچھ تو قوانین فطرت کی ناواقفیت، اور کچھ استدلال استقرائی کی ناقابلیت سے پیدا ہوتا ہے جس کی بنا پر لوگ صرف انھیں

واقعات کو محفوظ رکھتے ہیں جن سے ان کے تعصبات و تخیلات سابقہ کی تائید ہوتی ہے، اور جن سے ان کی مخالفت ہوتی ہے، انھیں یکسر فراموش کر جاتے ہیں۔

نفس بشری کی اس خصوصیت کا یہ اثر ہے، کہ مدار ستارہ کی نحوست کے ثبوت میں صدہا شگون، قطعوں، اور دعاؤں کے تذکرے سے مجلدات کے مجلدات تیار ہو گئے ہیں۔ اور کوئی ایسا شگون نہیں جس کی بابت ہر شخص بیشمار مثالیں مستحضر نہ رکھتا ہو۔ آپ کہیں گے، تجربہ ان وہم پرستیوں کا مصلح ہو جاتا ہوگا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ ملاح سے زیادہ کس کو موسم کی موافقت و ناموافقت کا پیشتر سے علم ہو سکتا ہے، لیکن باایںہمہ وہ آثار موسم کو چھوڑ کر دن و تاریخ کی نحوست کا معتقد رہتا ہے! قمار بازی سے زیادہ کون شی بخت و اتفاق پر موقوف ہو سکتی ہے، لیکن کسی جواری کے دل کو ٹٹولیے، کس درجہ تقدیر پرست ہوتا ہے! سخن پروری و سخن سازی کا تو وہم پرستوں پر خاتمہ ہے، مشاہدہ و تجربہ ان کی کیسی ہی تردید کرے، مگر اپنی ہار یہ کبھی نہ مانیں گے، بلکہ ہمیشہ کھینچ تان کر کوئی نہ کوئی تاویل کر ہی لیں گے۔ مثلاً ایک خواب کو لیجیے قدما کا خیال تھا، کہ خواب غیر مادی قوتوں کا معلول ہوتا ہے۔ انسان روحانی ہستیوں کی مدد سے خواب دیکھتا ہے۔ اب اگر کوئی خواب صحیح نکلا، تو تو ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی عملی تائید ہو گئی۔ لیکن اگر اس کے بالکل برعکس کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوا، تو یہ کہا جائے گا، کہ خواب کی تعبیر الٹی نکلتی ہے۔ پھر اگر ان میں کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی، جسے براہ راست خواب سے کوئی صریحی تعلق نہیں معلوم ہوتا، تو فوراً یہ تاویل پیش کر دی جائے گی، کہ یہ خواب تمثیلی تھا، یعنی جو واقعہ پیش آنے والا تھا، وہ خواب میں اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ

ایک تمثیل کے پیرایہ میں دکھایا گیا۔ اور پھر آخر میں اگر خواب و بیداری کے
واقعات میں کوئی بعید سا بعید تعلق بھی نہ نکلا تو کم از کم "اضغاث احلام"
کا جواب تو کہیں نہیں گیا، یعنی یہ کہ شیطان کبھی کبھی انسان کو محض دق کرنے
اور ستانے کے لیے پریشان خواب بھی دکھا دیتا ہے جو بے معنی ہوتے ہیں۔

پس جو شخص معجزات کے مبحث پر قلم اٹھاتا ہے، اُسے سب سے پہلے یہ
دیکھنا چاہیے کہ کسی قوم میں معجزات پر یقین کرنے کی استعداد کس حد تک تھی
کیونکہ یہ ایک واقعہ ہے، کہ بعض قوموں اور جماعتوں میں یہ استعداد فوق الحد
رہی ہے، اور انھوں نے اپنی خود فریبیوں سے متعلق نہایت اہتمام سے
شہادتوں کا انبار جمع کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس طرح کا ایک آدھ نمونہ درج
کرتے ہیں:۔ روم میں صدہا سال تک یہ عقیدہ مسلم رہا کہ ہر بڑے
واقعہ کی اطلاع پیشتر سے کسی نہ کسی خارق عادت ذریعہ سے ہو جاتی ہے
اور اگر کوئی مصیبت آنے والی ہے تو نذر و نیاز سے ٹالی جا سکتی ہے۔ یہ
عقیدہ دو چار سال تک نہیں صدیوں تک ہر طبقے میں شایع رہا ہے، ہزارہا
تجربات اس کی تصدیق میں پیش کیے جاتے تھے، ٹیسیٹس سے لیکر
ادنیٰ درجے کے مورخ تک تمام مورخین کا اس پر ایمان تھا، اور جمہوریت
کے زمانے میں گورنمنٹ نے سرکاری طور پر اس کی تحقیقات کر کے اس کی
واقعیت پر باضابطہ اپنی مہر لگا دی۔ سچ کہا ہے سسرو نے کہ متمدن و شایستہ
یونانیوں سے لیکر جاہل وحشیوں تک کوئی قوم قدیم زمانے میں ایسی نہیں
ہوئی ہے جسے یہ اعتقاد نہ تھا کہ کہانت و نجوم وغیرہ مختلف طریقوں سے
انسان کے لیے غیب دانی ممکن ہے۔ دوسری مثال سحر و طلسم کی ہے، خیال
بھی معجزات کے عقیدہ سے کچھ کم عالمگیر و مستحکم نہ تھا۔ عام پبلک کا اس پر

ایمان تھا، بڑے بڑے حکما و فضلا اس کی تصدیق کرتے تھے، اور اعلیٰ سے
اعلیٰ عدالتوں نے کامل تحقیقات کے بعد اس کے موافق فیصلہ کیا تھا۔ یا
پھر اسی طرح ایک اور مثال اس عقیدہ میں ملتی ہے کہ بادشاہ کے ہاتھ کے مس
کرنے سے فیل پا فوراً اچھا ہو جاتا ہے۔ تاریخ انگلستان کا جو زمانہ روشن سے
روشن کہا جاتا ہے، اس میں یہ عقیدہ رائج تھا، اور سال دو سال نہیں سیکڑوں
برس تک رائج رہا۔ پھر اس کے قائل محض جاہل و ناخواندہ افراد نہ تھے، بلکہ
شاہی کونسل کے ارکان، کیتھولک پروٹسٹنٹ مذاہب کے نامور اساطین
اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے علماء۔ ان دونوں مثالوں
سے ظاہر ہوا ہوگا کہ وقتاً فوقتاً قوموں میں معجزہ و خرق عادت پر اعتقاد
رکھنے کا مادہ کس قدر بڑھا ہوا رہا ہے۔ اب اگر اصول درایت پر دیکھیے، تو سحر
کے موثر ہونے اور انسان کے پاس ذرائع غیب دانی ہونے میں نہ کوئی منطقی تناقض
ہے اور نہ استحالہ عقلی ہے، اور روایۃً دیکھیے، تو ان چیزوں کے ثبوت میں اس کثرت
سے شہادتیں ملیں گی، کہ کسی مسلم تاریخی و طبعی واقعہ کے ثبوت میں بھی اتنی نہیں
مل سکتیں۔ لیکن باایں ہمہ ہمیں ہر قسم معجزات سے انکار ہے۔ اس انکار کی آخر
کوئی وجہ ہے؟ وجہ یہی کہ ہمیں تحقیقی طور پر ثابت ہو چکا ہے، کہ سوسائٹی کی ایک
خاص عقلی سطح، اور چند علمی مغالطات کے درمیان معجزات و سحر وغیرہ،
ہفوات کا خاص طور پر دور دورہ ہو جاتا ہے، اور جب وہ خاص دور گزر چکتا ہے،
یا وہ مغالطات باطل ہو جاتے ہیں، تو از خود دلوں سے معجزات کا اعتقاد
جاتا رہتا ہے۔

بے شبہ آج معمولی دل و دماغ کے اس شخص کے لیے جو ماضی کی تاریخ
و تصانیف سے کافی واقف نہیں، اور جو زمانہ گزشتہ میں بھی عقلی پستی کا

وہی دور دورہ سمجھتا ہے، جو اس وقت ہے۔ اس کے لئے یہ یقین کرنا سخت
دشوار ہے کہ عجیب عجیب مضحکہ خیز بے سر و پا قصوں پر قرنوں لوگوں کا ایمان
رہا ہے، اور صدیوں کسی کو ان کی تحقیق و تنقید کا خیال تک نہیں آیا ہے۔ لیکن
ہمیں یہ لحاظ رکھنا چاہیے، کہ اول تو قدما بجائے آج کل کے علوم مادی و
تجربی کے اُس وقت علوم نظری میں زیادہ مشغول رہتے تھے، دوسرے یہ
کہ آج کل مطابع کی ایجاد کے باعث جن بہت سی غلطیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے
یہ اُس وقت ممکن نہ تھا، پھر آج جو طرح طرح کے آلات و وسائل تجربہ و اختبار
سے تحقیقات میں مدد مل رہی ہے، یہ اُس زمانے میں کیونکر ممکن تھی، اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ اُس زمانے میں یہ مسیحی اعتقاد جو شایع تھا، کہ ایمان و اعتقاد وسیلۂ بخشش
اور شک و شبہ معصیت ہے، اس نے اور آزادانہ تحقیق کو دبا رکھا، پھر ہمیں
اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیے، کہ حرکت اجرام فلکی کے صحیح نظریہ کی
دریافت، اور قانون کشش کے انکشاف سے قبل جبکہ مختلف مظاہر فطری باہم
غیر مربوط و غیر منتظم معلوم ہوتے تھے، تعلیم یافتہ دماغوں میں بھی اس خیال کے
شائع ہونے کی قدرۃً بہت گنجائش تھی، کہ کائنات کا ہر ذرہ کسی جداگانہ خارجی
قوت کا مطیع ہے۔ اس حالت میں، اور یہ حالت رومی سلطنت کے سب سے بہتر
زمانے کی تھی۔ ایک عام و عالمگیر قانون قدرت کا تخیل اگر لوگوں کو مستبعد معلوم
ہوتا تھا، تو یہ بالکل قدرتی امر تھا۔ ان حالات کے درمیان جبکہ معجزات و خوارق عادات
کا قدم قدم پر سامنا تھا، جو محقق کو مجبوراً عجیب عجیب تاویلات اختیار کرنا ہوتی تھیں
مثلاً اگر سینیکا نے جب تمام کائنات کو قانون طبیعی کے ماتحت لانے کی کوشش
کی، تو اس سلسلہ میں اُسے اس واقعہ کی کہ بعض پیغمبر کے منتر سے منصل ایک چشمہ کا
پانی دن کی بہ نسبت رات میں کیوں گرم رہتا ہے، یہ تاویل کرنا پڑی، کہ اتصال

زمین مین پانی کے گرد، آگ کے کچھ تخم موجود ہین، جنھین دن کو آفتاب اپنی طرف کشش کر لیتا ہے، اس واسطے پانی سرد رہتا ہے، مگر رات کو وہ پانی سے باہر نکلنے نہین پاتے، اس لیے پانی گرم ہو جاتا ہے۔ اسی قبیل سے چند مثالین اور ملاحظہ کیجیے۔ کسوف و خسوف کے بارے مین عام اعتقاد تھا، کہ یہ کسی مصیبت عظیم کی علامت ہوتے ہین، تاہم رومی سپاہیون کو یہ بھی اعتماد تھا، کہ زور سے ڈھول بجانے سے چاند گرہن سے نکل آتا ہے۔ خواب کے احکام اس درجہ مانے جاتے تھے کہ ایک مرتبہ انھین کی تعمیل مین شہنشاہ آگسٹس روم کی گلیون مین گدا گری کرنے نکلا، اور مورخ سیوٹونیس نے انھین کی بنا پر ایک بار ایک مقدمہ کا التوا چاہا۔ بجلی کی بابت یہ عقیدہ مسلم تھا، کہ یہ ایک خاص نشانہ ہوتا ہے، جس کے ہدف بڑے آدمی ہوتے ہین، جنھین طوفان رعد و برق مین خاص طور پر اپنی حفاظت کرنا چاہیے۔ چنانچہ شہنشاہ کلیگولا، با این عظمت و جبروت، اپنے پلنگ کے نیچے پناہ لینے لگتا تھا، آگسٹس ایک دریائی جانور کی کھال پہن لیتا تھا، اور ٹائبریس، با این آزاد مشربی، ٹیسو کی پتیون کی آڑ ڈھونڈھنے لگتا تھا۔ ایک بار جس زمانے مین جولیس سیزر کی شان مین مختلف ملاعب ہو رہے تھے، ایک دمدار ستارہ نکلا، جو برابر چھہ دن تک طلوع ہوتا رہا۔ لوگون کو یقین ہو گیا، کہ یہ مردون کی روح تھا، چنانچہ اُس کی یادگار مین ایک مندر تعمیر کر دیا گیا۔

پھر یہ بھی کچھ ضرور نہ تھا، کہ جو لوگ ان ہفوات پر ایمان رکھتے تھے، وہ واقعات کے اسباب طبعی کے منکر ہون۔ نہین، بلکہ یہ ہوا ایسی چلی ہوئی تھی، کہ اچھے خاصے ملحد، جو مذہب کے نام سے چڑھتے تھے، سحر و طلسم، کہانت و نجوم کے ڈھکوسلون مین گرفتار تھے۔ اور جو اشخاص ایک طرف اسباب طبعی کے

اچھی طرح ماہر تھے، وہ تک دوسری طرف اسی خرافات پرستی مین مبتلا تھے - ان لوگون کے خیالات کے تناقضات اور الجھاؤ بھی سیر کے قابل ہین - لیوی کو ایک طرف پیشینگوئیون کا اذعان کامل ہے، مگر دوسری طرف کہتا ہے، کہ ان پیشینگوئیون پر جتنا زیادہ کان دھریے، اتنا ہی ان کی اور کثرت ہوتی ہے - بہت سے لوگ جو کہانت وفال کے قایل تھے، یہ بھی دعوی کرتے تھے، کہ اس کی قوت ہر شخص مین فطرۃً موجود ہوتی ہے، مگر مجہول رہتی ہے - البتہ خواب کی حالت مین یا زہد و فقر کی زندگی سے یا سکرات موت مین، یا ہذیان سرسامی مین، یہ قوت چمک اٹھتی ہے - اسی طرح زلزلہ ایک طرف تو اسباب طبعی کے معلول سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف یہ بھی یقین تھا، کہ یہ مصائب عظیم کے مخبر ہین - البتہ ان کے مسببات مین اختلاف تھا - یونانی ان کی علت زمین دوز چشمون کو ٹھہراتے تھے، فیثاغورث مردون کی کشاکش کو، اور رومی اس باب مین مذبذب تھے - پلینی صاحب ایک طول طویل تقریر کے بعد اس نتیجے پر پہونچتے ہین، کہ زلزلہ اگرچہ مسامات زمین مین ہوا کے یک بیک زور سے بھر جانے سے پیدا ہوتے ہین، تاہم یہ کسی آفت عظیم کے مقدمۃ الجیش بھی ہوتے ہین - یہی مصنف ایک جگہ ان حکما و علما ہیئت کی مدح و ستایش مین اپنے سارے زور فصاحت کو صرف کر دیتا ہے، جنھون نے جہالت و وہم پرستی کو دور کر کے قوانین طبعی کی حکومت قائم کی، لیکن کچھ ہی آگے بڑھ کر خود اپنا اعتقاد و مدار ستارون کی نحوست پر ظاہر کرنے لگتا ہے -

ان مثالون سے معلوم ہوا ہوگا، کہ سسرو و سنیکا کے بعد بھی، اور اگسٹس و انٹونانیس تک کے زمانے مین، رومی سرزمین مین معجزہ پرستی کی کس قدر استعداد موجود تھی - بے شبہ اس وقت تک اشاعت تعلیم کے باعث، تخئیل، مادیت و تجسیم کے قیود سے آزاد ہو چکی تھی، اور مذہبی ضعیف الاعتقادیون کا خاتمہ ہو چکا تھا

تاہم اسباب طبعی سے لاعلمی اور قوانین استقرا سے بیگانگی جون کی تون قائم تھی۔ اس وقت کے اکابر رجال و ماہرین فن تک، خود اپنے اپنے مخصوص فنون سے متعلق جن عجیب عجیب غلط فہمیون مین مبتلا تھے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہین، جنھون نے ان کی تصانیف کو پڑھا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے، ناظرین بھی ملاحظہ کرین۔ قدما مین پلینی سے بڑھ کر علم الحیوانات کا ماہر اور کون ہوا ہے، لیکن یہ حضرت با این فضل و تبحر اپنی تصانیف مین بہ کمال سنجیدگی فرماتے ہین کہ مہیب سا مہیب شیر، مرغ کے بانگ دینے پر لرز اٹھتا ہے؛ ہاتھیون کی جماعت مذہبی جشن مناتی ہے، بارہ سنگھا اپنے سانس کے زور سے سانپون کو اُن کے بل سے نکال کر اپنے پیرون سے کچل ڈالتا ہے؛ جہاز جب طوفان کے تھپیڑون سے اتنا بے قابو ہو گیا ہو کہ کسی لنگر سے نہ تھم سکے، اُسوقت اگر ایک خاص قسم کی مچھلی اسمین باندھ دی جاوے تو وہ فوراً رک جائے گا۔ اور سنیے لعاب دہن مین یہ کرامات ہوتی ہین، کہ اگر روزہ دار شخص سانپ کے منھ مین تھوک دے تو سانپ فوراً مر جائے گا؛ اگر انسان اپنا لعاب دہن اپنی آنکھ مین لگاتا رہے تو بصارت کبھی نہ جائے گی؛ اگر کوئی گھونسہ باز اپنے حریف پر حملہ کرنے کے بعد اپنی کف دست کو اپنے لعاب دہن سے تر کر لے تو اُسے چوٹ نہ معلوم ہوگی، اور اگر اپنی مٹھی مین لعاب دہن لگا کر حملہ کرے، تو اس مین یقیناً بہت زیادہ قوت ہو جائے گی۔ یونان مین ارسطو سے بڑھ کر علم الحیوانات کا کوئی ماہر نہین ہوا ہے۔ ان کا یہ حال تھا کہ فرماتے ہین، کہ سمندر کے ساحل پر تمام حیوانات جزر کے زمانے مین مرتے ہین، مد کے زمانے مین کوئی نہین مرتا۔ ارسطو کا یہ بیان تو تھا ہی، کئی صدیون کے بعد پلینی صاحب پیدا ہوئے، آپ نے مدت دراز کی سائنٹفک تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ شایع کیا، کہ ارسطو کا یہ بیان نہایت مبالغہ آمیز تھا، کیونکہ اُس نے جو کچھ تمام حیوانات سے متعلق لکھا ہے

وہ صرف انسان کے بارے میں صحیح ہے! یہ مغالطہ اٹھارویں صدی عیسوی کی ابتدا تک رہا، اور ۱۷۲۷ء میں جاکر باطل ہوا۔

غرض رومی زندگی میں اس طرح کے عجیب عجیب افسانوں اور دورازکار قصوں سے مجلدات کے مجلدات تیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے صدہا ایسے تھے، جن کی پردہ دری نہایت آسانی سے ممکن تھی، تاہم علماء و فضلا تک برابر ان پر ایمان رکھتے تھے۔ لیکن اس موقع پر ہمیں اس اہم تحریک کی اہمیت اثر کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے، جس کا ذکر ہم باب گزشتہ میں کر چکے ہیں، اور جس کی بنا پر قسطنطین کے قبول مسیحیت سے ڈیڑھ صدی پیشتر روما میں وہم پرستی و ضعیف الاعتقادی کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اس زمانے کے تعلیم یافتہ دماغوں کا صحیح عکس نہ سسرو و سنیکا کی تصانیف میں نظر آسکتا ہے اور نہ پلینی و پلوٹارک میں لذتیئین کا الحاد و انکار، مشککین کا شک و ارتیاب، اور رواقیین کی سادگی و بے تکلفی، ان میں سے اس وقت کوئی شی بھی نہیں قائم تھی۔ مارکس آریلیس کے "مقالات" اور لوسین کے "مکالمات" کا دور ہدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ ان سب کے بجائے اب مصری یا فیثاغورثی فلسفہ کا زور تھا۔ سسرو کے فلسفہ کا مقصد انسان کے قوائے عقل و نقد کو جلا دینا تھا، فیثاغورث کا مقصود، اس کے بالکل برعکس روحانی طرز پر مکاشفہ و مراقبہ کو چمکانا تھا۔ اس فلسفہ کی ترویج و اشاعت کا اثر یہ ہوا، کہ ہر دماغ سحر و طلسم، دیو و پلید کے سودے میں گرفتار ہو گیا۔ اور ہر فلسفی کے گرد اس کے تلامذہ نے کشف و کرامات کا ایک حلقہ کھینچ دیا۔ اپولونیس آف ٹیانا، جسکو بت پرستوں نے مسیح کا مدمقابل قرار دیا تھا، اس کی بابت یہ عام طور پر مشہور تھا، کہ وہ مردوں کو جلا سکتا ہے، بیمار کو تندرست کر دیتا ہے، جن و آسیب کو اتار سکتا ہے، اور ایک ملک کے وقوعات کو دوسرے ملک میں بیٹھے بیٹھے

دیکھ سکتا ہے۔ اسی قبیل کی شہرت اپولیوس افلاطونی کو بھی حاصل رہی، باوجودیکہ وہ غریب خود اس سے انکار کرتا رہا۔ فلسفی اسکندر عجیب عجیب مکارانہ سازشین کر کے لوگون کے سامنے اپنی کرامتون کا اظہار کیا کرتا تھا، جن کی تفصیل لوسین نے دی ہے۔ بعض ساحرون کے بابت یہ روایات تھین، کہ اُن کا سحر کبھی کبھی خود اُلٹا اُنھین پر لوٹ پڑا۔ پارفری کی بابت منقول ہے کہ اُس نے حمام سے ایک بار ایک بھوت کو نکالا۔ آئیمبلیکس سے متعلق اُس کے تلامذہ کا مشاہدہ تھا، کہ حالت دعا مین اُس کے جسم ولباس کا رنگ سنہری ہو جاتا، اور وہ زمین سے ۱۰ فٹ بلند ہو جاتا، اور یہ تو سب کو مسلم تھا کہ اُس نے ایک چشمہ سے دو چڑیلون کو نکال کر انھین انسانی شکل مین اپنے سب مقلدین کو دکھلا دیا۔ اسی طرح ایک عورت سوسیٹرا کی بابت یہ روایت شایع تھی، کہ ایک بار دو ورحین، دو بزرگ کلدانیون کی شکل مین اس کے پاس آئین، اور اُسے غیر معمولی حسن وجمال اور غیب دانی کے جوہر عطا کر گئین، چنانچہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی ساری دنیا کا حال دریافت کر سکتی تھی، جس سے متاثر ہو کر لوگ اُسے ذات خداوندی مین شریک سمجھتے تھے، اور بجز موت وعشق سے مغلوب ہونے کے اُس مین کوئی انسانی کمزوری باقی نہین رہ گئی تھی۔

رومی دماغون کی یہ حالت تھی، جب مسیحیت کا ظہور ہوا۔ گویا یہ کہنا چاہیے، کہ ملک رومہ مین اس سرے سے اُس سرے تک وہم آرائیون اور ضعیف الاعتقادیون کا سمندر موج زن تھا، کہ اُس کے اوپر مسیحیت کا جہاز تیرنے لگا۔ یہ ضعیف الاعتقادیات کیا کیا تھین؟ وہی جنھین مشرقی مذاہب اپنے جلو مین لائے تھے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا، کہ گو مسیحیت کے اخلاقی پہلو دوسرے مذاہب سے بدرجہا متباین رہے، تاہم اُس کے معجزات کو مخالف وموافق سب نے آسانی سے

تسلیم کرلیا۔ بت پرستون کی نظر مین یہودی خصوصیت کے ساتھ ضعیف الاعتقاد ہوتے تھے، اور مسیحیون نے اپنے طرز عمل سے ان کے اس خیال کو اور پختہ کردیا۔ بت پرستون کے یہان، جن لوگون کا رجحان تشکیک و مادیت کی جانب ہوتا تھا، وہ یہ کہتے تھے کہ مختلف دیوتا پہلے انسان تھے، اور جو راسخ العقیدہ تھے، اُن کا خیال تھا کہ وہ پہلے جنات تھے۔ اب مسیحیت نے آکر ان دونون نظریات کو قبول کرلیا، اُس نے یہ تعلیم دی کہ یہ دیوتا پہلے سلاطین متوفی ہوا کرتے تھے، مگر پھر اُن کی جگہ جنات نے لیلی، اور مشرکین کے معجزات کے بارے مین تو علماء مسیحیت نے متفق اللفظ ہو کر فیصلہ کردیا، کہ یہ سب اُسی طرح قابل تسلیم ہین، جیسے مسیحیت کے معجزات۔ فال و کہانت کی واقعیت سے فلاسفہ منکر ہو چلے تھے، لیکن علماء مسیحیت نے اس انکار کی سختی سے روک تھام کی، کیونکہ اُن کے خیال مین خود اُن کے مذہب کی تصدیق بہت سی پیشینگوئیون کے پورے ہونے پر مبنی تھی۔ چنانچہ جہان تک مجھے علم ہے، یہ عقیدہ تقریباً سترھوین صدی کے خاتمہ تک بالکل مسلم و غیر مختلف فیہ رہا، اور سب سے پہلے جب اس کی مخالفت کسی مسیحی نے کی ہے، وہ ۱۶۸۶ء تھا، جبکہ ایک ڈچ پادری وان ڈیل نامے نے ایک رسالہ اس کی تردید مین لکھا، جس کا ملخص ترجمہ فونٹنل نے شائع کیا۔ ظاہر ہے کہ جن لوگون کے دماغ پر اس قدر وہم پرستی و ضعیف الاعتقادی مسلط ہو، اُن سے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے، کہ وہ اُن معجزات کے وقوع و عدم وقوع کی تحقیقات کرسکے ہون گے، جوان سے صدی دو صدی پیشتر (یعنی پہلی صدی عیسوی مین، یہودیہ مین) واقع ہونا بیان کیے جاتے ہین۔ اور پھر بالفرض تحقیق کے بعد اُن کا واقع ہونا ثابت بھی ہوجاتا، تو اس سے لوگون پر کیا خاص اثر پڑتا، دران حالیکہ ہر طرف معجزات کی کثرت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ موسوی معجزات کی واقعیت کا سوال، روما کے قبول مسیحیت کے

سوال سے بالکل علیحدہ ہے۔ یہ دو بالکل جداگانہ مسئلہ ہین۔ آج ہم اپنے موجودہ علم معلومات کی روشنی مین موسوی مصنفین کی شہادت کا وزن کرنا چاہتے ہین، گو ہمارے معاصرین متکلمین مین جو زیادہ دانشمند ہین، وہ محض شہادت کی سوال کو تو ہاتھ تک نہین لگاتے، بلکہ ان مسائل کو ثابت کرنے مین مصروف رہتے ہین، کہ معجزات کا وقوع ممکن ہے یا یہ کہ بایبل مین جو معجزات بیان ہوئے ہین، خود ان کا لب و لہجہ اُنکے واقعی ہونے کی شہادت دے رہا ہے، یا یہ کہ مسیحی معجزات بہ لحاظ نوعیت بھی دوسرے مذاہب کے معجزات سے مختلف ہین۔ وغیرہ۔ لیکن جس زمانے مین رومہ نے مسیحیت کو اختیار کیا تھا، پچھلے معجزات کی تاریخی تحقیق ناممکن تھی، اور سچ یہ ہے کہ اُس زمانے مین بجز آرنوبیس کے اور کوئی اُس کا نام بھی نہین لیتا تھا۔ پھر جب کبھی استدلال مین شہادت کا نام لیا بھی جاتا تھا، تو اس سے مراد معجزات سے نہین بلکہ پیشینگوئیون سے ہوتی تھی۔ گو یہ بھی ایک فضول ہی سی حرکت تھی، کیونکہ اس وقت رومیون کے دماغ اس سطح پر کب تھے، جو وہ اس کی تحقیق کر سکتے، کہ یہودیہ مین جو واقعات گزرے، وہ پیشینگوئیون کے عین مطابق تھے، یا یہ کہ پیشینگوئیان واقعی پیشینگوئیان ہی تھین، اور بعد کو نہین گڑھ لی گئی تھین، خصوصاً ایسی حالت مین جبکہ ہمین معلوم ہی ہے، کہ اُس وقت کے خوش عقیدہ مسیحیون نے فرط جوش مین دو ایک پیشینگوئیان نہین، بلکہ صدہا ہزارہا جعلی پیشینگوئیون کا ایک سارا لٹریچر وضع کر لیا تھا صدہا موضوع پیشینگوئیون مین مسیح کی زندگی کے مصایب پوری تفصیل سے بیان کیے گئے تھے، اور مسیحی علماء، موضوعات و مخترعات کے اس سارے دفتر کو بیچون و چرا تسلیم کیے ہوئے تھے۔ جسٹن مارٹر، کلیمنٹ آف الگزنڈریا، سلیش، قسطنطین اعظم و سنیٹ اگسٹاین وغیرہ جملہ اساطین مسیحیت مختلف پیرایون مین، ان پیشینگوئیون پر ایمان لانے کی تاکید کرتے تھے، اور ان کے منکرین کو قابل مواخذہ و گنہگار

قرار دیتے تھے۔ بے شبہ بت پرست مصنفین ان پیشینگوئیون کو جعلی وموضوع کہتے تھے، لیکن مسیحیون مین سے ان کی بات پر کون کان دھرتا تھا؟ ان کے یہان ان کی واقعیت قطعاً مسلم تھی، اور نہ صرف اس زمانے مین مسلم رہی، بلکہ قرون مظلمہ قرون وسطی سے گزرتے ہوئے سولھوین صدی تک کسی کو شک وانکار کی جرات نہ ہوئی۔ سب سے پہلے اصلاح کنیسا کے زمانے مین بدنصیب کسٹلیو نے متعدد عبارتون کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا، کہ یہ الحاقی معلوم ہوتی ہین۔ اس کے بعد سترھوین صدی کے اوائل مین پوسوین نے یہ تحقیق کی، کہ سایبلیون کا زمانہ تو موسیٰ کے بعد ہوا ہے، پھر اس کے کیا معنی ہین، کہ ان کی تصانیف مین موسیٰ کی بابت پیشینگوئیان ملتی ہین، لہذا یقیناً یہ عبارتین شیطان کی الحاق کی ہوئی ہین۔ آخر کار سب سے پہلے سترھوین صدی کے عین وسط، یعنی ۱۶۴۹ء مین ایک فرنچ پروٹسٹنٹ پادری نے جرات کر کے یہ دعوی کیا، کہ یہ تصانیف تمامتر جعلی وموضوع ہین، چنانچہ مدت دراز کی ردوقدح کے بعد اب جا کر دنیائے مسیحیت کو اس کا یقین آیا۔

ہم ابھی کہہ چکے ہین، کہ رومی مسیحیون کی رائے نہ تو تاریخی تحقیقات کے معاملہ مین سند ہو سکتی ہے، اور نہ ادبی حیثیت سے کسی تصنیف کے اصلی وجعلی ہونیکے بارے مین اُن سے حجت لائی جاسکتی ہے، لیکن معجزات کی ایک خاص صنف مین ان کی شہادت خاص طور پر قابل لحاظ ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے، کہ خرق عادت کی ایک خاص شکل، یعنی جھاڑ پھونک اور آسیب کے اُتارنے کو مسیحی برابر شروع سے اپنا حصہ بتاتے چلے آتے ہین۔ جسٹن مارٹر سے لیکر متاخرین تک علی الاتصال مسیحی مصنفین اسے اپنی ملک مخصوص کہتے آئے ہین، بلکہ اس بارہ مین عجیب عجیب دعوی کرتے رہے ہین۔ مثلاً سینٹ آیرینیس فرماتے ہین، کہ تمام مسیحیون مین خرق عادت کی قوت تھی

وہ غیب کی باتین بتا دیتے تھے، بھوت پریت اُتارتے تھے، بیمار کو اچھا کر دیتے تھے اور مردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔ اور اُن کے زندہ کیے ہوئے مُردے بعد کو کئی کئی سال تک زندہ رہا کیے ہین" یا سنیٹ ایی فینیس تحریر کرتے ہین، کہ "ہر سال معجزہ مسیح کے یادگار مین مسیحی صدہا دریاؤن اور چشمون کو شراب کی شکل مین تبدیل کر دیتے تھے چنانچہ مین نے خود اس طرح کے ایک چشمہ سے ایک بار اپنی پیاس بجھائی ہے" سینٹ اگسٹائن جن کا زمانہ اس قدر بعد مین ہوا ہے، وہ کہتے ہین کہ ہمارے زمانے مین گو معجزات اُس قدر کثیر الوقوع نہین، جتنے پہلے تھے تاہم وہ واقع ہوتے رہتے ہین، چنانچہ بعض کی مین خود چشم دید شہادت دے سکتا ہون۔ مین جب کبھی کسی معجزہ کے صدور کی خبر سنتا ہون، تو خاص طور پر اس کی تحقیقات کرتا ہون، اور گواہون کے بیانات کو پبلک مین شایع کر دیتا ہون۔ ایک مرتبہ ایک پادری لوسیا نس کو خواب مین یہ القا ہوا کہ فلان مقام پر سینٹ اسٹیفن کی نعش مدفون ہے، چنانچہ تلاش کے بعد وہ وہین ملی، اور وہان سے اُس گرجا مین لائی گئی، جس کا مین پادری تھا۔ یہان پہونچکر اُس کی تاثیر سے پانچ مُردے زندہ ہو گئے۔ اور جتنے بیمارون کو شفا ہوئی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگرچہ بہت ہی کم شفا پانے والون کا نام درج رجسٹر کیا جاتا تھا تاہم ان کی تعداد بھی دو سال مین ستّر تک پہونچ گئی، اور ایک دوسرا گرجا جو ہمسایہ مین تھا اُس مین تو شفا پانے والون کا کوئی شمار ہی نہین ہو سکتا۔ اسی طرح ایک مرتبہ سینٹ امبروز نے جوش مناظرہ مین مشتعل ہو کر اپنی غیب دانی کا اس دعوی سے ثبوت دیا، کہ فلان مقام کو کھودو، وہان لاشین نکلین گی، چنانچہ وہ جگہ کھودی گئی، اس کے اندر خون سے لبریز قبرین نکلین، جن مین دو قوی ہیکل سر بریدہ ڈھانچے برآمد ہوئے، جن کے متعلق تحقیق ہوئی کہ یہ ۳۰۰ سو سال پیشتر کے دو شہید سینٹ بروسیس وسینٹ پروٹیسیس ہین، اس کی

تصدیق کے لیے وہ ہڈیاں جب ایک نابینا کے جسم سے مس کی گئیں، تو اس کی بینائی فوراً عود کر آئی، اور جب آسیب زدوں سے مس کی گئیں، تو فوراً ان کو صحت ہو گئی، بلکہ ان آسیبوں اور جنات نے خود شہادت دی، کہ تثلیث برحق، اور یہ استخوان واقعی شہداء کے ہیں۔ اس کے دوسرے دن سینٹ امبروز نے منکرین معجزات کو مخاطب کر کے تقریر کی۔ میں نے اسی دن اس واقعہ کو قلمبند کر لیا، اور ان دونوں شہیدوں کی پرستش تمام افریقہ میں پھیلا دی سینٹ امبروز کی شہرت و مقبولیت میں اس روز سے چار چاند لگ گئے، لیکن اس کے مخالفین یہ کہتے رہے کہ اس نے جنات کو رشوت دیکر اپنے موافق بنا لیا ہے۔"

ان اقتباسات سے آدمی چاہے، تو بہت سے نتائج نکال سکتا ہے، لیکن ہمیں سردست اور کسی شے سے بحث نہیں، اس وقت تو ہمیں یہ کہنا ہے کہ یہ معجزات عموماً منکرین کو یقین دلانے کے لیے، بلکہ خود معتقدین کو زیادہ راسخ العقیدہ بنانے کے لیے صادر کیے جاتے تھے۔ البتہ ایک خاص صنف کے معجزات کا مقصد مخصوص، منکرین ہی کو قائل کرنا تھا۔ اس سے ہماری مراد جھاڑ پھونک ہے۔ یہ خیال تو بہت قدیم سے چلا آتا تھا، کہ امراض مادی اسباب سے نہیں، بلکہ روحانی اسباب سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن یہ خیال یونانیوں میں نہ تھا، کہ انھیں بھوت پریت یا جن و شیطان پیدا کرتے ہیں۔ آسیب زدگی کا تخیل سب سے پہلے روما میں ظہور مسیحیت کے وقت، مشرقی وہم پرستیوں کے ساتھ ساتھ داخل ہوا۔ اور یہودی جو اپنے ملک میں روزمرہ چند آسیب زدوں کو سر گلی کوچے میں دیکھنے کے عادی تھے، اور جو اپنے طریقہ علاج کو حضرت سلیمان کی تعلیمات سے ماخوذ بتاتے تھے، اب خاص طور پر جھاڑنے والے مشہور ہو گئے۔ جوزفس اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے، کہ ویسپیسین کے عہد میں ایک یہودی الیعزر نامی نے ایک شخص کے

ناک کے راستے سے آسیب نکالا۔ وہ شخص تو آسیب کے رخصت ہوتے ہی
زمین پر گر پڑا، اور الیعزر نے پلید کو حکم دیا کہ کچھ فاصلہ پر پانی کا ایک کٹورہ رکھا ہوا تھا
اُسے پھینک دے۔ چنانچہ اُس نے اس کی فی الفور تعمیل کی۔ اشراقیت جدید
اور اس کے مثل نئے فلسفہ جو اب شائع ہونا شروع ہوئے، انھوں نے اس
خیال کو اور تقویت دیدی، اور ملک میں سیکڑوں آسیب اُتارنے والے پیدا
ہو گئے۔ لیکن جو شہرت خود اس باب میں مسیحیوں کو حاصل ہوئی، وہ اور کسی کو
نصیب نہ ہوئی۔ جسٹن مارٹر سے لیکر دو صدی بعد تک کوئی ایک مسیحی مصنف بھی
ایسا نہیں گزرا ہی جو اس کی اصلیت و کثیر الوقوع ہونے کی شہادت نہ دیتا ہو۔ مسیحی عامل
یہود و مشرکین میں بھی اس قوت کے وجود کے منکر نہ تھے، البتہ وہ اس دعوی پر
مضبوط تھے، کہ جو عظیم الشان قوت ان کو حاصل ہے، وہ اور کسی مذہب والے کو نصیب
نہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ تھا، کہ بڑے بڑے سخت پلید، بڑے بڑے زبردست آسیب
جو کبھی کسی مشرک کے منتروں سے نہ اُترتے، انھیں ہم نے دم بھر میں مسیح کا نام
لے کر یا صلیب کی تصویر بنا کر مسخر کر لیا، اور علانیہ اُن کی زبان سے مسیحیت کی صداقت کا
اعتراف کرالیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جو پلید حیوانات کے اجسام میں حلول
کر جاتے تھے، اُن کا اُتارنا بھی انھیں مسیحی عاملین کا کام تھا۔ سینٹ جروم راوی
ہیں، کہ سینٹ ہلیرین نے ایک مرتبہ بکمال جسارت ایک آسیب زدہ اونٹ سے
آسیب اُتارا۔ جولین کے عہد میں بابلیس شہید کی ہڈیاں، ایک مشرکانہ دارالکہانت
کی آواز کو خاموش کرنے کے لیے کافی سکلیں، اور جوں ہی اس مندر سے یہ ہڈیاں
جولین کے حکم سے نکالی جا چکیں، فوراً بجلی گری اور اس مندر کو برباد کر دیا۔
سینٹ گرگوری تھامٹرگس کا واقعہ اور زیادہ دلچسپ ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ
جب ایک مندر سے شیاطین کو خارج کر دیا، تو لازمی طور پر کہانت کا سدباب ہو گیا

(کیونکہ غیب کے معلومات انھین شیاطین کے ذریعہ سے ہوتے تھے) اس پر اُس مندر کا مجاور بہت پریشان ہوا، اور اس نے سینٹ موصوف کی خدمت مین گڑگڑا کر یہ بیان کیا، کہ میری روزی اُس دن سے بند ہو گئی۔ سینٹ موصوف نے اُس پر ترس کھا کر ایک پرچے پر یہ لکھدیا، کہ "شیطان واپس آجا" معاً اس حکم کی تعمیل ہو گئی اس واقعہ کو دیکھ کر وہ مجاور ایسا متاثر ہوا، کہ فوراً مسیح پر ایمان لے آیا۔ پھر جس زمانے مین مسیحیون پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے تھے، اُس وقت ٹرٹولین نے مشرکون کو مخاطب کر کے بہت زور کے ساتھ لکھا، کہ کبھی آسیب زدہ کو سامنے لاؤ، اور کسی عیسائی عامل کو اس کے پاس لے جاؤ، تب دیکھو کہ وہ عفریت کس طرح اپنی شیطنت کا اقبال کرتا ہو۔ اس سے بڑھ کر مسیحیت کے برسرِ حق ہونے کا کیا ثبوت چاہیے" غرض، اس طرح اُس زمانے کے تمام مسیحی مصنفین، آسیبون اور پلیدون کے اقبال پر زور دیتے ہین، اور بیان کرتے ہین، کہ مسیحی عامل جون ہی اپنا عمل شروع کرتا ہی آسیب، آسیب زدہ شخص کی زبان سے فوراً چلا چلا کر اور چیخ مار مار کر اپنے وجود کا اقبال کرنے لگتا ہو۔ شیاطین کی شہادتون اور اعتراف پر مسیحی جو اتنا زور دیتے تھے اس مین ایک نکتہ یہ تھا، کہ شیطان تو شیطان کو خارج کر نہین سکتا، پھر جو قوت شیطان کو خارج کر رہی ہو، وہ سوا طاقت ربانی کے اور کیا ہو سکتی ہو؟

اس سلسلہ مین یہ معلوم ہونا یقیناً نہایت دلچسپ ہوتا، کہ مسیحیون کے اس ادعا وتحدی کا مشرکون کی طرف سے کیا جواب ہوتا تھا۔ لیکن افسوس ہو کہ مشرکون کی کوئی تحریر باقی نہین جو کچھ تھین وہ مسیحی سلاطین کے تعصب وعدم رواداری کی نذر ہو گئین تاہم کچھ نہ کچھ معلومات تو بہر حال ہم تک پہونچ گئی ہین۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہو، کہ اُس زمانے کے تعلیم یافتہ حلقون مین یہ "معجزات" ذرا بھی وقعت کی نظر سے نہین دیکھے جاتے تھے۔ سب سے پہلے اہل علم پر نظر کرو۔ قدیم فلاسفہ کے یہان تو آسیب

وپلید سے متعلق ایک حرف بھی نہین ملتا، حالانکہ روح و عالم ارواح کے مباحث سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہین۔ یہ معنی خیز سکوت صاف اس امر پر دلالت کرتا ہی، کہ اس زمانے تک اس خیال کا کہین وجود نہ تھا۔ پلوٹارک اگرچہ ارواح خبیثہ کے وجود کا شد و مد سے قایل ہوا ہی، تاہم جھاڑ پھونک وغیرہ کو وہ سخت حقارت کے ساتھ مزخرفات کے درجے مین رکھتا ہی۔ مارکس آرلیلیس اپنے محسنون کو شمار کرتے ہوئے حکیم ڈیوگنیٹس کے اس احسان کو خاص طور پر گنتا ہی کہ اُسی نے اسے، جھاڑ پھونک، جنتر منتر کرنے والون اور آسیب اُتارنے والون کی لغویت کا یقین دلایا۔ لوسین کہتا ہی کہ ہر چالاک ہیر پھیر کرنے والا بھولے بھالے مسیحیون کو اپنے دام مین پھنسا سکتا ہی۔ سیلسس مسیحیون کی بابت یہ راے قایم کرتا ہی، کہ یہ لوگ شعبدہ باز ہوتے ہین، جو نو عمرون و سادہ لوحون سے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہین۔ سب سے بڑھ چڑھ کر، اُلپین کے قانون کی ایک دفعہ مین اُن لوگون کو صاف صاف ملعون قرار دیا گیا ہی، "جو جھاڑ پھونک، جنتر منتر کا جال ڈالے ہوئے ہین" جدید تحقیقات سے تو اس جھاڑ پھونک کی اصلیت بھی کسی قدر منکشف ہوتی جاتی ہی، مثلاً یہ کہ آسیب زدگی کے جو علامات بیان کیے جاتے ہین، وہ جنون وصرع سے بالکل ملتے جلتے ہین، اور یہ بالکل ممکن ہی، کہ کسی مذہبی رسم کی ہُلّڑ مین یہ اختلال عارضی طور پر دب جائے۔ اور مریض سائل کے حسب منشا سوالات کا جواب دینے لگے، چنانچہ یہ تو اُس زمانے کے پادریون کے لہجۂ بیان سے خود مترشح ہوتا ہی، کہ ان کی کامیابیان ہنگامی و عارضی ہی ہوتی تھین۔ یہ بھی ثابت ہوا ہی کہ ابتداءً یہ قوت شفا بخشی تمام عیسائیون کو حاصل تھی، اس کے بعد رفتہ رفتہ محدود ہونا شروع ہوئی، تاآنکہ پانچوین صدی کے آغاز مین ایک طبیب نے آسیب زدگی کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔

غرض اس ساری تفصیل سے ہماری یہ تھی، کہ پادریوں کے معجزات خارق عادات کشف و کرامات جو ابتداءِ ظہورِ مسیحیت میں اس کی مقبولیت کے اسباب بیان کیے جاتے ہیں، یہ صحیح نہیں، بلکہ تاریخی شہادتوں کے بالکل منافی ہیں پھر آخر اس واقعہ کے اصلی اسباب کیا تھے؟

اس کے اصلی اسباب مقتضیاتِ حالیہ یا حالاتِ عصریہ تھے۔ تشکیک در زود اعتقادی، الحاد و ایمان، اقرار و انکار، کی ہنگامہ آرائی، مختلف مذاہب و ملل کی کشمکش، جذبات کا تنوع، عوائد و رسوم کا تغیر، تخیلات و مشاعر کا انقلاب، یہ تمام چیزیں جن کا ذکر میں تفصیل کے ساتھ باب گزشتہ میں کرچکا ہوں، اس واقعۂ طبعی کی اصلی علت تھیں۔ تنقید و نکتہ چینی، قدیم مذاہب و قدیم فلسفہ کی بنیادیں یکسر متزلزل کرچکی تھی، اور روما کے عظیم الشان دار السلطنت میں نئے نئے خیالات اپنی حکومت و ترقی کے لیے جد وجہد کر رہے تھے۔ علمی حلقوں میں، رواقیت، جو کچھ دنوں تک جذبات سے علیحدہ رہ کر، اپنی خشکی و تقشف، اپنا دور دورہ قائم رکھ چکی تھی اب مذہبی مقتضیاتِ عصریہ کے ناموافق ہونے کے باعث اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں ختم کر رہی تھی۔ اسی طرح دوسرے حلقوں سے بھی یکے بعد دیگرے قدیم مذاہب کا سکہ اٹھتا جاتا تھا۔ ان کے مقابلہ میں یہود، باوجودیکہ ان کا مذہب بالکل مختص المقام تھا، اور وہ خود اہل شہر کے نزدیک سخت مبغوض تھے تاہم ان کی توحید خالص، ان کی سخاوت، اور ان کے جھاڑ پھونک نے شریعت موسوی کو دور دور روشناس کردیا۔ عورتیں خصوصیت کے ساتھ یہودی آئین و رسوم کی گرویدہ ہونے لگیں (چنانچہ ایک روایت تو یہ ہے کہ خود ملکہ پوپیا نے مذہب یہودیت قبول کرلیا تھا) سبت و دیگر یہودی شعائر کا عام رواج ہوگیا، اور موسوی قانون کی اقامت پر سرگرمی سے بحثیں ہونے لگیں۔ دوسرے ایشیائی مذاہب کو اس سے بھی

زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ مصری دیویون اور دیوتاؤن کی پرستش کے لیے ہزارہا آدمی ذوق شوق سے جمع ہوتا تھا، اور ان کی مذہبی قربانیون وغیرہ کے موقع پر میلے کے میلے لگ جاتے تھے۔ چنانچہ آپولیس ان میلون کا حال تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اسی طرح جوئیل عورتون کی ان سخت سے سخت ریاضتون کا ذکر کرتا ہے، جو وہ انھین دیبیون دیوتاؤن کی پوجا مین کرتی تھین، (مثلاً یہ کہ یخ بستہ دریا مین کود کود کر اپنے جسم کو خون سے رنگین کرتی تھین)۔ ان معبودون کے مندرون کی تعمیر مین بہتر سے بہتر صناعی صرف کی جاتی تھی۔ کہانت کا عرصے سے سدّ باب ہوگیا تھا، مگر اب پھر دور دورہ شروع ہوگیا، نجومی گلی گلی مین پھرنے لگے، افسانہ خوانی و وہم پرستیون کے چرچے ہر جگہ دکھائی دینے لگے، غرض یہ کہ پچھلے مذاہب کی ہوا بالکل اکھڑ گئی تھی، انقلاب و اضطراب، بے اطمینانی و بے چینی کی ہوا عام تھی، اور ایک نئے مذہب کی خواہش، ایک جدید روش کی تمنا کا سودا ہر سر مین سمایا ہوا تھا۔

ان حالات کے درمیان اگر مسیحیت کو عروج نصیب ہوگیا، تو اس مین حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ جو لوگ اس کو تعجب انگیز و محیر العقول خیال کرتے ہین، انھین اس پر غور کرنا چاہیے، کہ مسیحیت کے سوا، اور کس مذہب مین اس وقت لادینی وقوت کے اتنے عناصر مجتمع تھے؟ یہودیت کے برخلاف، اس مین کوئی امر ایسا نہ تھا، جو اسے مختص القوم و مختص المقام رکھے، بلکہ یہ ہر قوم و ہر طبقے کے لیے یکسان موزون تھی۔ اسی طرح رواقیت کے برخلاف، اس کی تعلیم نہایت و جذبات کشی کی غیر فطری تعلیم نہ تھی، بلکہ اس نے جذبات لطیف کو تو خاص طور پر مخاطب کیا تھا یا پھر اسی طرح مصری مذاہب کے برعکس، یہ کوئی غیر عملی مذہب نہ تھا، بلکہ اس مین عالم معاد کے ساتھ اخلاق کی بھی خاص تعلیم دی جاتی تھی، اور یہ انسان کو عملی بناتا تھا۔

جس وقت مختلف قومین اور جماعتین پہلی بار ایک دوسرے سے متصل ہو رہی تھین، اس نے اخوت انسانی کا درس دیا۔ جس وقت تمدن و تعلیم کے اثر سے طبیعتون مین نفاست و نزاکت پیدا ہو رہی تھی، اس نے خلوص و محبت کی تعلیم دی۔ غلامون کی بھیڑ اسے اپنے حق مین آیۂ رحمت سمجھی اور یہ خیال کرنے لگی کہ یہ شریعت محض اُن کے ساتھ حسن سلوک کے لیے نازل ہوئی ہے۔ فلاسفہ کے گروہ نے اسے اس لیے بڑھ کر لبیک کہا، کہ اس مین ان کو افلاطون کے محاسن اور رواقیہ کے اخلاق کی جامعیت نظر آئی۔ اعجوبہ پرست اس لیے اس کے گرویدہ ہو گئے، کہ معجزات و کرامات، جھاڑ پھونک کے عجائب و غرائب جیسے اس مین تھے، ویسے یہودیون، کلدانیون، مصریون، کسی کے یہان نہ تھے۔ ایک جماعت مین اس واسطے اسے مقبولیت حاصل ہوئی، کہ یہ لوگ روز روز کے سیاسی مناقشات و ملکی تنازع سے تنگ آکر اپنے پس مرگ انجام کے لیے بیچین تھے، انھین آکر اس نے قیامت کے آنے، بدکارون کے واصل جہنم ہونے، اور نیک کارون کے داخل جنت ہونے کی بشارت دی۔ ایک اور گروہ نے اس لیے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کی، کہ یہ رواقیت کی خشک و غیر فطری روایات و جذبات کشی کی تعلیم سے اُکتا گیا تھا، انھین آکر اس نے لطف و محبت، خلوص و ہمدردی کی نوید سے محظوظ کیا۔ اور پھر سب سے آخر کچھ لوگ اس واسطے بھی اس کے حلقہ مین داخل ہو گئے، کہ اس نے اپنی تعلیمات کو بہ طور انسانی دماغ کے پیداوار، اور بشری کوششون کے نتائج کے نہین، بلکہ بہ طور فرمان ربانی، بہ طور کلام ایزدی، کے پیش کیا جس مین عقل کی جگہ عقیدہ کام آتا ہے۔ اور یہ مختلف پیرایون مین بار بار ظاہر کیا، کہ حقیقت شناسی کے لیے دماغ کی جگہ قلب کی، عقل و استدلال کی خضوع و خشوع کی، اور دلیل و برہان کے بجاے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے، غرض یہ کہ اس نے بجاے

عقل کے جذبات کو اپنا مخاطب بنایا، انسان کی جبلت میں جو مقتضیات روحانی ہیں ان کی تشفی کی، زمانے کی اخلاقی ضروریات کو پورا کیا، اور زمانے کی دھار جس اخلاقی سانچے میں طبائع کو از خود ڈھال رہی تھی اسے اس نے اور روشن و واضح کر دیا۔ یہ تھا اس کی کامیابی کا راز، اس کے عروج کا گر، جس میں نہ کسی خرق عادت کو دخل ہے، اور نہ کسی کشف و کرامت کو۔

ہاں ایک بات کہنے سے رہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ مسیحیت نے عصبیت کے زور سے اپنے نظام کو جس قدر مضبوط و مستحکم بنا لیا تھا، یہ بات کسی اور مذہب کو نصیب نہ تھی۔ کسی جماعت کی اندرونی پائداری کا کب سے چلتا ہوا جادو یہ ہے، کہ اس کے ارکان میں عصبیت کی روح پھونک دی جائے بڑے بڑے محبان وطن کو دیکھیے، انھوں نے ہمیشہ یہ کیا ہے، کہ اپنے ہم وطنوں میں وطن و قوم سے متعلق ایک عصبیت پیدا کر دی، اور اسی سے کامیاب رہے۔ یہی طریقہ مسیحیت نے بھی اختیار کیا۔ مسیحیت کچھ محض حکمائے اخلاق کا حلقہ، یا خرق عادت دکھانے والوں کا جتھا نہ تھا، وہ ایک باضابطہ، منضبط، منتظم و مستحکم القوام جماعت تھی جس کے انضباط و عصبیت سے اس کے حریف یکسر معری تھے، اس نے آتے ہی یہ صاف صاف کہ دیا، کہ اس کے سوا دنیا کے تمام مذاہب باطل ہیں، نجات ہے صرف اس کے پیرووں کے لیے، اور لعنت ہے تمام اُن لوگوں کے لیے جو اس کے حلقے سے باہر ہیں۔ اسی کا نام عصبیت ہے۔ جس کی تقویت، نماز، روزہ، اور روزانہ زندگی کی تمام تقریبات میں مذہبی مراسم کے دخل سے ہوتی گئی نجات کو اپنے پیرووں کے ساتھ مخصوص کر دینے سے اس نے ایک طرف انسان کے خوف و دہشت کے تاروں پر ضرب لگائی، اور دوسری طرف رحم و محبت کے نازک رشتوں کو چھیڑ دیا۔ بہت سے مشرکین نے محض اس ڈر سے اصطباغ لے لیا،

کہ ممکن ہو مسیحیت ہی احق ہو، پس حشر کے روز کیسی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ پھر جو لوگ مسیح کی راہ میں جان دیتے تھے اُن کے آگے بھی مسیحیت نے وہ سارا سامان عزت و تکریم کا پیش کر دیا تھا جو انسان کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔ جنت میں اُس کا جو اعزاز ہوگا، وہ تو ہوہی گا، خود دنیا میں اس کا یہ مرتبہ تھا، کہ اگر کوئی نو مسیحی غلام، راہ حق میں کام آجائے تو اس کا نام بڑے سے بڑے شہدا کی صف میں لیا جانے لگے گا، اس کی لاش انتہائی احترام کے ساتھ اُٹھائی جائے گی، اس کے مقبرے پر زایرین کا میلہ لگا رہے گا، لوگ اُس کی روح سے استمداد کرین گے اس کی شہادت کی سال گرہ (مسلمانون کی اصطلاح مین سالانہ عُرس) پوری دھوم دھام تزک و احتشام سے منائی جائے گی، اور خون کا بپتسمہ لینے سے فوراً اُس کی تمام عمر کے گناہ دُھل جائین گے۔ اس سے زیادہ کون مذہب اپنے پیرؤون کی استقامت و جانبازی کے لیے ترغیب و تحریص کا سامان اکٹھا کر سکتا ہے؟

جو لوگ فطرت بشری کی اس خصوصیت کے رازشناس ہین، کہ بعض حالات کے درمیان انسان کا جذبہ ایثار و جانبازی اپنے انتہائی حد تک پہونچ جاتا ہے، وہ اس کا آسانی سے اندازہ کر سکتے ہین، کہ ان محرکات و مرغبات نے بیخوفی، جراءت و سرفروشی کو کس حد تک پہونچا دیا ہوگا۔ درحقیقت اس وقت کے مسیحی زندگی کی محبت بھول گئے تھے، اور اُس کے بجاے موت کو محبوب رکھنے لگے تھے۔ سینٹ اگنیشس کے الفاظ مین، ان سب کا یہ اعتقاد ہو گیا تھا، کہ وہ خدائی گندم ہین جن کا حسن انجام یہ ہے، کہ وحشی جانورون کے دانتون کی چکی مین پسین، اور پس کر مسیح کی روٹی بنین۔ بس اس عقیدہ کے آگے، مال و دولت، عزیز و دوست، اولاد و والدین، کسی کی محبت نہین باقی رہ گئی تھی۔ آریجن کے لڑکپن کا یہ واقعہ ہے، کہ وہ اپنے تئین اہل تعدی کے حوالے کرنے جا رہا تھا جب اس ارادے سے لوگون نے زبردستی باز رکھا، تو اس نے اپنے محبوس والد کے نام

بہ صد منت و الحاح خط لکھا، کہ آپ جان دینے سے ہرگز نہ ڈریے، خاندان و اولاد کی محبت کو ہرگز خیال مین نہ لائیے، اور جس طرح ممکن ہو مسیح کی راہ مین درجۂ شہادت حاصل کیجیے۔ اسی طرح سینٹ پرپٹوا کا یہ واقعہ ہوا، کہ وہ اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی، خود اس کا سن بائیس سال کا تھا، اور ایک ننھا بچہ تھا۔ اس حالت مین اُس نے قبول مسیحیت کا اعلان کیا، اور حکام کے سامنے دلیرانہ شہید ہونے کے لیے چلی گئی۔ اس موقع پر اُس کا ضعیف العمر باپ آتا ہی، اُسے اپنی پیرانہ سالی کا، اپنے سفید بالون کا واسطہ دلاتا ہی، اُس کے ننھے معصوم بچے کی قسمین دلاتا ہی، اُس سے رحم کی التجا کرتا ہی، اور جب اس پر بھی وہ نہین مانتی، تو اپنے زانو کے بل جھک کر اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ مین لے کر اپنے آنسوؤن سے بالکل بھگو دیتا ہی، لیکن یہ تمام آہ و زاری بے اثر رہتی ہی۔ جب وہ مقتل کی طرف لے جائی جاتی ہی، تو وہ دیکھتی ہی کہ اس کا باپ فرطِ غم سے دیوانہ ہو گیا ہی، بے اختیار پچھاڑین کھاتا ہی، داڑھی کے بال نوچے ڈالتا ہی، کپڑے پھاڑتا ہی لیکن یہ سب مناظر اس کے لیے غیر موثر رہتے ہین۔ یہ کوئی استثنائی و نادر واقعہ نہ تھا۔ یہ ایک عام ہوا چل گئی تھی جس کو دیکھیے شہادت کے لیے مشتاق و بیتاب نظر آتا تھا۔ بلکہ کسی کسی زمانے مین تو یہ شوق ایک عام جنون کے درجے تک پہونچ جاتا تھا، چنانچہ ٹرٹولین ایک ایشیائی شہر کا واقعہ نقل کرتا ہی کہ وہان ایک بار ساری آبادی دفعتہ مجتمع ہو کر وہان کے حاکم کے پاس پہونچی اور کہا، "ہم ہانک پکار کر کہتے ہین کہ ہم مسیح پر ایمان لائے ہین، تو ہم کو خدارا شہید کر" حاکم مبہوت ہو کر انھین دیکھنے لگا، اور پھر اُس نے اُن سے کہا، کہ اگر تمھین اپنی زندگی ایسی ہی وبال ہی، تو تم سب کے سب اپنے گلون مین رسّی کے پھندے کیون نہین لگا لیتے؟ یہ کہنے کے بعد اُس نے چند سرغناؤن کو قتل کیا، باقی کو چھوڑ دیا۔ مسیحیون کی اس بے جگری، بے خوفی، و سرفروشی کا ذکر بت پرست مصنفین کے یہان بھی

ملتا ہے۔ اقتباسات ذیل ملاحظہ طلب ہین:-

"کچھ لوگ ایسے ہوتے ہین، جنھین جنون موت کی طرف سے بیخوف کر دیتا ہے، اور بعض کو اُن کے یہان کا عام دستور، مثلاً عیسائیون کے یہان" (اپکٹیٹس)

"کون روح اپنی خوشی، اور اپنے ارادے سے، جسم سے جُدا ہونا چاہتی ہے؟ ہان ضد، وہٹ کی اور بات ہے، جیسا کہ عیسائیون کا شیوہ ہے" (مارکس آرلیس)

"یہ بدنصیب عیسائی اس خبط مین گرفتار ہین، کہ یہ بعد موت بھی زندہ رہین گے، اس لیے انھین جان دینے مین کوئی باک نہین ہوتا بلکہ بہت سے تو اپنی خوشی سے جان دیدیتے ہین" (لوسین)

شاید بعض ناظرین کو معلوم ہو کہ مسیحیون کے زمانۂ انحطاط مین ایک مرتبہ ایک مسلمان بادشاہ نے شام کے نامور مسیحیون کو لکھا تھا کہ "مین تمھارے خلاف اُن لوگون کو بھیجتا ہون، جو موت کے ویسے ہی حریص ہین" "جیسے تم لوگ لذاتِ دنیوی کے ہو" اور درحقیقت یہی فقرہ ان کی حیرت انگیز فتحمندیون کی کنجی ہے۔ بس بعینہ یہی کیفیت اُس زمانے کے عیسائیون کی تھی۔ اُس وقت اُنھین بت پرستون پر ویسے ہی فضیلت حاصل تھی، جیسے زمانۂ مابعد مین مسلمانون کو اُن پر ہوئی۔ جوش وہمت واستقلال کا بت پرستون مین کہین وجود نہ تھا، مسیحی ان چیزون سے بھرے تھے۔ چنانچہ جب قسطنطین نے رومہ کا ملکی مذہب مسیحیت قرار دیا ہے، تو مسیحیون کی تعداد بہت ہی قلیل تھی، بلکہ تھیوڈوسیس تک کے زمانے مین سینیٹ مین اکثریت بت پرستون کی تھی، باایں ہمہ قلت کو کثرت پر ہمیشہ غلبہ حاصل رہا۔ جماعت کثیر اُس جوش واستقلال، اتحاد واتفاق، عزم وخلوص سے یکسر معرا تھی،

جو کسی قوم مین اقدام و دفاع کی قوت قایم رکھتے ہین۔ بہ خلاف اس کے جماعت قلیل کے ایک ایک رگ و ریشے مین جوش، عزم، انضباط، یکجہتی و خلوص سرایت کیے ہوئے تھا، اور انھین خصوصیات نے قلت کو کثرت پر ہمیشہ غالب رکھا۔ پھر جب ایک بار مسیحیون کے قدم جم گئے، تو اب اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ یا تو انھین بالکل نیست و نابود کر دیا جائے، اور یا پھر وہی حکمران ہو کر رہین گے۔ مگر معدوم تو ہو نہ سکے، اس لیے اُن کا حاکم ہو جانا ایک لازمی نتیجہ تھا۔

ہمین اس سے انکار نہین، کہ واقعات تاریخی کی سطح تمام تر ہموار نہین بعض واقعات، بے شبہ تاریخ کی رفتار طبعی کے بہ ظاہر مخالف معلوم ہوتے ہین۔ لیکن یہ قطعی ہے کہ رومی حکومت کا اصطباغ ان مستثنیات مین نہین۔ یہ تو ایک سیدھا سادہ، طبعی اور معمولی واقعہ ہے، جس کی توجیہ و تشریح علت و معلول کے عام سلسلہ مین بہ خوبی ہو جاتی ہے۔ یونان کی محدود و قلیل آبادی مین اکثر ایسے لوگ ایک دو کی تعداد مین نہین، بلکہ کثرت سے پیدا ہو گئے، جن کی نظیر فلسفہ، شاعری، ڈراما، خطابت نقاشی، مصوری، سیاست، موسیقی، وغیرہ مین آج تک نہ پیدا ہو سکی؛ یا مثلاً جاہل سے جاہل اقوام مین، جن کے پست دماغون کے لیے شرک و بت پرستی کا تخیل ناگزیر تھا، مسلمانون کا خالص توحید کی روح پھونک دینا، بے شبہ نہایت حیرت انگیز و عجیب واقعات ہوئے ہین، اور گو ان مین سے پہلے واقعہ کی توجیہ آب و ہوا، جغرافی، سیاسی، معاشری، و ذہنی خصوصیات کی بنا پر کی جاتی ہے، اور دوسرے کی اس بنا پر کی جاتی ہے، کہ محمد نے تصویر کشی و دیگر فنون لطیفہ کو کس قدر دبایا، تاہم ہمین اعتراف کرنا چاہیے، کہ پھر بھی ان واقعات کی ندرت و بوالعجبی باقی رہتی ہے لیکن مین مکرر کہتا ہون کہ روم مین مسیحیت کا عروج و شیوع مطلق حیرت انگیز نہین یہ تو تمام تر حالات معاصرانہ و اسباب طبعی کا صریحی نتیجہ تھا۔ البتہ ناظرین کو اس

سلسلہ مین یہ خیال رکھنا چاہیے، کہ خود یہودیہ مین مسیحیت کا اُٹھان کیسے ہوا
مجھے اس سے بحث نہین۔ مین تو صرف روم مین اس کی ترقی و اشاعت کا ذکر
کر رہا ہون)

جن مصنفون کا خیال اس کے برعکس ہے، وہ یہ کہتے ہین، کہ "روم مین مسیحیون
پر مظالم کیسے روا رکھے گئے، مسیحیت کو کس کس طرح حکومت نے کچلنا چاہا، اور
تعذیب و عقوبت کی کوئی شکل باقی نہین رہی، جس کا استعمال مسیحیت قبول
کرنے والون پر نہ کیا جاتا ہو۔ ایسی حالت مین، اور ان عظیم الشان موانع کے
باوجود بھی، اگر مسیحیت نے قبولیت حاصل کی، تو اسے سوا تائید ربانی کے
اور کیا کہا جا سکتا ہے" مین اس رائے کی غلطی آیندہ صفحات مین دکھاتا ہون،
اور یہ بتاتا ہون کہ مسیحیون پر جو کچھ بھی مظالم ہوئے، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ
سے اس طرح کے نہ تھے، کہ مسیحیت کی رفتار ترقی کو روک دیتے۔

فصل (۴)
مذہبی تعدی کی نوعیت

اس بحث مین سب سے پہلے ہمین یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ
حکومت کی طرف سے جو مذہبی تعدی برتی جاتی ہے، وہ ایک ہی سبب سے
لازمی طور پر پیدا نہین ہوتی، بلکہ اس کے متعدد اسباب ممکن ہین۔ مثلاً یہ
بالکل ممکن ہے کہ حاکم وقت کسی مذہب کی تعلیمات کو اخلاق شکن سمجھتا ہو، اس
صورت مین مذہبی تعدی کا محرک اخلاقی ہوگا۔ یا ممکن ہے کہ وہ انھین اپنے
معبود کی مرضی کے خلاف سمجھتا ہو، اس صورت مین یہ محرک مذہبی کہلائے گا۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے، کہ اس کے نزدیک وہ آئین و قوانین حکومت کے منافی ہوں، اس صورت میں اُن کے روک تھام کا محرک خالص سیاسی ہوگا۔ یا پھر آخر میں، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی سے فرمان روائے وقت کی محض ذاتی عداوت یا طمع اس کی محرک ہو، اس صورت میں اس کا سبب ذاتی کہا جائے گا۔ غرض اس طرح کے متعدد اسباب و محرکات ممکن ہیں، پس جب تک ہمیں تفصیلات کا علم نہ ہو، ہم مجرد تعدی کو سن کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے، کہ اسباب بالا میں سے کون ایک سبب، یا مختلف اسباب مل کر اس کے محرک ہوئے۔

اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنے کے بعد، یہ سمجھنا چاہیے، کہ مسیحی علما نے جو تعدی برتی وہ بعض حیثیات سے تمام دیگر تعدیوں سے ممتاز ہے۔ جس استقلال، قوت و باضابطگی کے ساتھ یہ جاری رہی، اُس کے لحاظ سے یہ اپنی نظیر آپ ہے، اس کا دائرہ محض اعمال و کردار تک محدود نہیں رہا، بلکہ معتقدات تک اس کی زد میں تھے، اور یہ صرف جائز و مباح ہی نہیں بلکہ فرض سمجھی گئی اس کے وجوب و قطعیت پر فقیہوں نے ایک پورا لٹریچر تیار کر دیا ہے، اور اس کی تائید پر وہ سب فرقے متحد ہو گئے، جو خود باہم سخت مختلف الرائے رہا کرتے تھے۔

ہم نے اپنی ایک دوسری کتاب میں مسیحی تعدی کی تاریخ نہایت تفصیل سے بیان کی ہے، جس میں ہم نے یہ دکھایا ہے کہ یہ تعدی اکثر حالتوں میں اُس وقت کے ایک مقبول و متداول مسئلہ شرعی کا بالکل قدرتی و لازمی نتیجہ تھی۔ اور وہ مسئلہ یہ تھا، کہ عقیدہ کی صحت شرط نجات ہے، اور عقیدہ کی غلطی مستلزم عذاب ہے۔ مسیحیوں نے غیر مسیحیوں پر جو جو مظالم توڑے ہیں، انسانی ترقی کی راہ میں جو جو رکاوٹیں حائل کی ہیں، درحقیقت تقریباً اُن سب کا باعث یہی ایک مسئلہ شریعت ہوا ہے۔ اور یہیں سے یہ نظریہ قائم ہونا ممکن ہے، کہ مسائل شرعیہ کی بے وقعتی اور

دماغی ترقی لازم ملزوم ہین۔

رواداری کی بنیاد، تمام تر اس خیال پر ہے کہ جس طرح ہم دوسرون کے عقاید کو غلط جان کر اُن پر تعدی و تشدد جائز رکھتے ہین، اسی طرح خود ہمارا بر سر غلط ہونا بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ خیال، اُس زمانے مین جبکہ شک و تذبذب، کفر کے مرادف خیال کیا جاتا تھا، اور جبکہ ایمان بالغیب، نجات کی لازمی شرط تھا، کسی دماغ مین پیدا ہی نہین ہو سکتا تھا۔

مسیحی تعدیون کا سبب اصلی تو یہ تھا، لیکن اُس کی معین دو چیزین اور ہوئین۔ ایک تو یہ کہ مسیحی اخلاق کو روایات ایسی ملین، جن مین یہ مذکور تھا کہ فلان فلان موقع پر محض رضاے الٰہی کے لیے، محض ابتغاءً لمرضات اللہ کفار پر تلوار کھینچی گئی، اُنھین بہ زور دبایا گیا، اور اُن پر ہر طرح کے جور و تشدد برت کر شوکت دینی قائم کی گئی۔ دوسرے یہ کہ مسیحی فقہا کے ذہن مین منکرین کے لیے عقاب شدید کا جو ہولناک تخیل تھا، اُس کے لحاظ سے اس دنیوی جبر و تشدد کو وہ کوئی چیز نہین سمجھتے تھے، بلکہ اسے مظلومون کے حق مین خیر خواہی سمجھتے تھے، کہ ممکن ہے اسی ذریعہ سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائین۔

مجھے یقین کامل ہے کہ مسیحی تعدیون کے یہی اسباب تھے۔ اس دعوی کا تفصیلی ثبوت میری دوسری کتاب مین ملے گا تاہم مین اس قدر پورے وثوق سے کہتا ہون کہ اس کی تائید مین بہتر سے بہتر شواہد موجود ہین۔ اولاً تو اصول بالا پر اگر غور کرو، تو معلوم ہوگا کہ وہ خود ہی عدم رواداری و تعدی کی طرف مودی ہوتے ہین۔ دوسرے قسطنطین سے لے کر آخر زمانے تک مسیحی فقہا کی تصانیف اُٹھا کر دیکھو، برابر اُن مین یہی دلائل تعدی کی حمایت مین ملین گے۔ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ رواداری کی بنیاد اُس وقت سے پڑتی ہے جب سے کہ اساسی فرعی

عقاید میں امتیاز کیا جانے لگتا ہے، اور روشن خیال جماعت تعدی و تشدد کو نہ د
روک دیتی ہے۔ اسی وقت سے مسیحی فقہا نے اپنے معتقدات پر نظرثانی کی، اور اب
انھیں یہ یاد آیا، کہ کسی شخص پر اس کے عقاید کی بنا پر تعدی و تشدد کرنا خود مسیحیت
کے منافی ہے۔ میرے نزدیک یہ تاریخ کی ایک مسلم و غیر مشتبہ حقیقت ہے۔ اور حیرت
ہے کہ ہمارے بعض معاصرین اس میں تامل کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ "مشرکین
بھی تو تعدی کرتے تھے، حالانکہ وہ نجات کو اپنے ساتھ مختص نہیں رکھتے تھے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی تعدی کے کچھ اور اسباب تھے" یہ
استدلال کس قدر عجیب ہے؟ میں یہ کب کہتا ہوں کہ تمام تعدیوں کا یہی ایک
سبب ہوتا ہے؟ میں تو خود یہ تسلیم کرتا ہوں، کہ اس کے مختلف اسباب ہوا کرتے
ہیں، کہیں کچھ اور کہیں کچھ۔ البتہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ مسیحی تعدی کا یہ سبب تھا،
اور مشرکانہ تعدی کے دوسرے اسباب تھے، جو درج ذیل ہیں۔

میرے خیال میں یہ اسباب نیم مذہبی و نیم سیاسی تھے۔ قدیم حکومتوں کا
طرز حکومت، درحقیقت اس قسم کا واقع ہوا تھا، کہ وہ تمام رعایا کو ایک سانچے میں
ڈھالنا چاہتی تھیں، اور اس لیے کھانے پینے پہننے اوڑھنے، غرض معاشری و خانگی
زندگی کے جزئیات تک کے لیے آداب و ضوابط حکومت کی طرف سے موجود تھے
اس بنا پر غیر ملکی چیز بھی داخل ہوتی تھی، بدگمانی و بے اعتباری کی نظر سے دیکھی
جاتی تھی۔ یہ خیال تو خیر تھا ہی، اس سے بھی ایک زبردست خیال اس زمانے
میں یہ موجود تھا، کہ ملکی و دنیوی فلاح کا دارومدار دیوتاؤں کے راضی رکھنے اور
ان کے آگے باقاعدہ قربانیاں چڑھاتے رہنے پر ہے۔ اس لیے کوئی ایسی شے
جو اس میں خلل انداز ہوتی تھی یقیناً سخت مخالفت و نفرت کی مستحق سمجھی جاتی
تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یونان کی ابتدائی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جہاں

قربانی چڑھاوے اور مذہبی رسمون کا انتظام حکومت کے ہاتھ مین تھا،
وہان لازمی طور پر غیر ملکی مذہبی مراسم، بلکہ معتقدات تک سے عدم رواداری کی ہوا
چل گئی۔ چنانچہ انکساغورس ہتھیوڈورس، ڈیاگورس، اسٹلپو وسقراط کے ساتھ
جو برتاؤ کیا گیا، فلاطون نے اپنے قانون مین جس شدومد سے مذہبی وخانگی آزادی
کو دبایا، اور اتھنیز مین جس سرگرمی سے محکمۂ احتساب نے اپنا کام کیا، یہ سب اسی
کے شواہد تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ عدم رواداری ہلکی پڑتی گئی تاآنکہ یونان کے
خاتمہ سے قبل وہان حریت عقلی کا کافی نشوونما ہوگیا، اور لذتیہ و تشکلین اپنے اپنے
عقاید کی آزادی سے تعلیم دینے لگے۔ بلکہ ارسطوفانس تو خود سقراط ہی کے زمانے
مین ڈراما کے ذریعہ سے یونانی معبودون کے ساتھ استہزا کرنے لگا۔

رومہ مین بھی ابتداءً سررشتۂ مذہب، حکومت ہی کے ہاتھ مین تھا، جس کا
مقصد دیوتاؤن کو ملکی فلاح کے لیے راضی کرنا تھا، اور جس کے مراسم سینٹ
کے حکم سے انجام دیے جاتے تھے۔ اُس وقت عام عقیدہ یہ رائج تھا، کہ ہر
شخص کے لیے بہترین دین وہ ہے، جو اُس کے ملک کا دین ہے۔ اس خیال کے
مطابق، مفتوح اقوام کے مذاہب کے ساتھ پوری رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا
اُن کے معابد کا کامل احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا، بلکہ رومی سپاہ جس شہر پر حملہ آور
ہوتی تھی، پہلے اُسی شہر کے رب سے استمداد واستعانت کرتی تھی۔ درحقیقت، بجز
ایک قوم ڈروئڈ کی استثنائی مثال کے، (اور اس استثنا کی وجہ یہ تھی کہ یہ قوم بیحد
سرکش و شریر تھی، اور اُس کے یہان انسانی قربانی فرض تھی) رومیون نے کبھی کسی
مفتوح قوم کے مذہب مین دست اندازی نہین کی۔

لیکن یہ رواداری، مفتوح قومون کے حدود وطن کے ساتھ مختص ومحدود
تھی یعنی وہ افراد جب تک اپنے وطن مین تھے، اپنے مذہبی فرائض کی پابندی بیت

پوری طرح آزاد تھے، لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے ملک سے نکل کر اور خاص اٹلی مین آکر بھی اپنی اُس آزادی کو قائم رکھ سکین۔ جمہوریت کے زمانۂ قدیم مین، جبکہ محکمۂ احتساب نے خانگی زندگی کے جزئیات تک کو بال بال جکڑ رکھا تھا، درحقیقت حریت و رواداری کا نام بھی نہین لیا جاسکتا تھا۔ کارنیڈس نے جب ہر مسئلہ کے منفیانہ و مثبتانہ پہلو کو مساوی دکھا کر تشکیک کی تلقین کی، تو کیٹو نے صاف یہ کہہ کر سنیٹ سے اُس کے شہر بدر کیے جانے کی سفارش کی، کہ اُس کی تعلیمات سے ملک مین بداخلاقی کی اشاعت ہوگی۔ اور اسی دلیل سے تمام اہل خطابیات بھی خارج البلد کر دیے گئے اس سے بھی بڑھ چڑھ کر وہ موعظت ہے، جو میسینس نے آگسٹس کی تخت نشینی پر اُسے مخاطب کرکے ارشاد فرمائی تھی، جس کے مقتبس فقرہ یہ ہین:-

"ہمیشہ اور ہر مقام پر اپنے ملک کے دستور کے بموجب اپنے دیوتاؤن کی عبادت کرنا، اور دوسرون کو بھی اسی پر مجبور کرنا۔ جو لوگ نئے نئے مذہب پھیلانا چاہین، اُنھین سخت سے سخت سزائین دینا، نہ صرف اس لیے کہ وہ غلط راہ پر ہین، بلکہ اس لیے کہ ممکن ہے وہ نئے نئے دستور، قانون، و رسم و رواج کو بھی اپنے ہمراہ لائین، اور اس سے ملک مین بدامنی، نفاق، فرقہ بندی، اور سازشون کا اندیشہ ہے۔ سچے خداؤن کے منکرون اور دین مین اینچ پیچ پیدا کرنے والون کے ساتھ ہرگز کبھی رواداری کا برتاؤ نہ کرنا"

اس اقتباس سے معلوم ہوا ہوگا، کہ قدما مین عدم رواداری کس حد تک بڑھی ہوئی تھی، اور اُس کے محرکات کیا تھے۔ لیکن یہان ہمین حریت فکری، و حریت عملی، آزادی معتقدات، و آزادی اعمال مین تفریق کرنا ضروری ہے۔ ان دونون کے خلط ملط سے سخت غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ آزادی راے جیسی رومی شہنشاہی کے زمانے مین پھیلی اُس کی نظیر تاریخ کے کسی دوسرے عہد مین نہین ملتی۔ اسینیس پولیو نے جب پہلا عام کتب خانہ روما مین جاری کیا، تو اُسے اس نے اُس عمارت مین رکھا، جو آزادی کے دیوتا کا مندر تھی، اور اس نکتہ کو علمی گروہ نے زمانہ ما بعد مین کبھی فراموش نہین کیا۔ سسرو، سنیکا، لکریشیس، ولوسین نے معاصرانہ معتقدات مذہبی پر شدت سے نکتہ چینی کی، لیکن کسی نے ان کی زبان نہین پکڑی۔ گو ڈومیشین و سپیشین نے بے شبہ فلاسفہ پر تشدد کیا، لیکن اُن کے فلسفہ و حکمت کی بنا پر نہین بلکہ اس لیے کہ وہ لوگ استبدادی حکومت کے خلاف کارروائیان کرتے تھے۔ اس قابل رشک رواداری کو دیکھ دیکھ کر یونانی مصنفین اپنے جی کو یہ کہہ کر تسکین دیتے تھے، کہ ان کی حکومت و سلطنت گئی تو کیا ہوا، اُس کا نعم البدل اس آزادی راے سے ہو گیا۔ اس زمانے کے شدید سے شدید فریقانہ مناظرہ بھی اسی رنگ سے متاثر ہوتے تھے، لذتیہ و رواقیہ کے مناظرے سے زیادہ پُرجوش و اشتعال انگیز کوئی اور مباحثہ اس وقت نہین ہوا، تاہم اس کی بھی یہ حالت تھی کہ ہر فریق اپنے حریف کے محاسن و کمالات کا پوری طرح اعتراف کرتا تھا، چنانچہ آج ایپکورس کے اخلاقی فضائل سے متعلق دنیا کو جو کچھ علم ہے، اس کا ایک خاص ماخذ اُس کے مخالفین کی تصانیف ہین۔

یہ تصویر آزادی راے کی تھی۔ لیکن آزادی عمل سے متعلق اس کے بالکل برعکس قوانین، رومی فرمان رواؤن نے نافذ کر رکھے تھے۔ سسرو ایک قدیم رومی قانون کا ذکر کرتا ہے جس کے بہ موجب ملک مین کسی نئے مذہب کی اشاعت قطعاً ممنوع تھی، اور یہ قانون صرف دفتر مین تحریر ہی نہ تھا، بلکہ اس کا نفاذ بھی ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک بار ۳۲۶ ق م مین جب قحط شدید پڑا، اور لوگ نئے معبودون سے

استمداد کرنے لگے، تو سنیٹ نے پولیس کو حکم دیدیا، کہ بجز رومی معبودون کے اور کسی کی پرستش نہ ہونے پائے۔ لوٹے شیس نے ایک بار غیر ملکی دیوتاؤن سے استعانت کی، اس پر سنیٹ کی طرف سے یہ ڈانٹ پڑی کہ ملک کی فلاح کے لیے ملکی خداؤن کی طرف رجوع کرنا چاہیے، کہ غیر ملکیون کی طرف؟ اسی طرح کچھ عرصے کے بعد پھر سنیٹ نے ایک فرمان جاری کیا، کہ ملک مین جو جدید بدعات جاری ہوئی ہین، ان کی سختی سے روک تھام کی جائے گی۔ ۱۸۶ء مین جو لوگ غیر ملکی دیوتا "عطارد" کی پرستش کے ذمہ دار ثابت ہوئے تھے، وہ سب خارج البلد کر دیے گئے۔ مصری دیوتاؤن آئیسس و سراپیس کی پرستش جب روم مین جاری کی جانے لگی، تو شروع شروع مین اس پر بڑی دار وگیر ہوئی۔ یہ پرستش اپنے ہمراہ جو بداخلاقیان لائی تھی، اور غلامی کی جو تحریک پھیلا رہی تھی، وہ اہل روم کی سیرت و مزاج کے بالکل منافی تھی، اور حکومت کی اس سے برہمی بالکل حق بجانب تھی۔ سب سے پہلے جب ان معابد کے مسمار کرنے کا فرمان نافذ ہوا، تو لوگ اتنے بڑے معبود کے مندر کو ہاتھ لگاتے ہوئے دہشت کھاتے تھے، لیکن کانسل پالس نے پہلا تبر خود اپنے ہاتھ سے لگا کر لوگون کو اس کے منہدم کرنے پر آمادہ بھی کر دیا۔ اس کے بعد مصری معابد کے انہدام کے لیے وقتاً فوقتاً فرمان نافذ ہوتے رہے آگسٹس نے اپنی نوعمری مین مصری عبادت کو رواج دینا چاہا، لیکن آگے چل کر اُسے بھی دب جانا پڑا۔ ٹائبریس کے عہد مین یہ ایک بار پھر اُبھری، لیکن پجاریون کی مکاری کا پردہ فاش ہو جانے پر شاہی غیظ کو حرکت ہوئی۔ معبد فوراً مسمار کر دیا گیا، بت دریا مین ڈال دیے گئے اور پجاریون کو سولی دیدی گئی۔ اسی بادشاہ کے عہد مین چار ہزار شخصون کو جلا وطنی پر مجبور ہونا پڑا، اس جرم مین کہ ان مین یہودیون اور مصریون کی ضعیف الاعتقادیان سرایت کر گئی ہین۔

ان نظائر سے پہلی نظر مین یہ معلوم ہوتا ہی، کہ مذہب پر براہ راست تعدیون کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن درحقیقت ان کا یہ مقصود نہ تھا۔ اس دار وگیر، روک تھام سے اصلی منشا رومی حکومت کا یہ تھا، کہ رعایا مین کسی طرح کی بدنظمی و بے انضباطی نہ پیدا ہونے پائے۔ اہل رومہ کو قومی یکرنگی و باضابطگی سب سے زیادہ محبوب تھی اور وہ کسی ایسی شی کے ہرگز روادار نہین ہوسکتے تھے، جس سے اس مین خلل واقع ہو۔ وہ زیادہ تر اسی خیال سے، اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ نئے مذاہب اپنے ہمراہ بداخلاقیون کو لاتے تھے، انھین دباتے رہے۔ لیکن جب جمہوریت ٹوٹ کر شہنشاہی قائم ہوئی، اور اہل رومہ کو یہ نظر آیا، کہ وہ قدیم عسکری خصوصیات اب زندہ نہین رہے، تو اُنھون نے مذہبی تعدی کو فوراً ترک کردیا، اور بجز عیسائیون کے وہ ہر مذہب وملت کے ساتھ پوری فراخ دلی ورواداری کے ساتھ پیش آنے لگے۔ نہ صرف زبانی، بلکہ عملاً بھی یہ ہونے لگا، کہ عیسائیون کو چھوڑ کر جملہ مذاہب وادیان کے متبعین اپنے اپنے فرائض رومہ مین بیخوف وخطر انجام دیتے تھے۔

لیکن ابھی ایک اور غلط فہمی کو صاف کرنا باقی ہی۔ مذہبی آزادی ورواداری کے یہ معنی نہین، کہ اہل رومہ غیر ملکی مذہب کے معتقد ہوکر اپنے ملکی مذہب کے مراسم کی پابندیون سے مستغنی ہوجاتے تھے۔ نہین، بلکہ دوسرے مذہب کے متبع ہونے کے باوجود بھی اُنھین اپنے ملک کے مذہبی مراسم کی پابندی بھی ضرور تھی۔ اصل یہ ہی کہ اہل رومہ کے نزدیک مذہب کے تین حصے تھے، ایک حصہ تخئیلی تھا، یعنی شاعرون نے قدیم روایات وافسانے کیا کیا بیان کیے ہین۔ دوسرا عقلی، یعنی حکما نے عقلی حیثیت سے مذہب کے کیا کیا اصول قرار دیے ہین، اور تیسرا عملی تھا، یعنی عبادات وغیرہ سے متعلق مذہبی مراسم۔ ان مین سے اول الذکر دو حصون سے متعلق ہر شخص کو پوری آزادی حاصل تھی، لیکن تیسرے یعنی جزء عملی کو

ہر شخص ماننے پر مجبور تھا۔ کیونکہ یہ عقیدہ لوگون کے دل مین پوری طرح راسخ تھا، کہ قوم و ملک کی خوشحالی و بدحالی، سرسبزی و پریشانی تمام تر انھین رسوم کے ملحوظ رکھنے پر منحصر ہے۔ اس خیال سے، بڑے سے بڑے حکماء بھی مستثنے نہ تھے۔ فلاسفہ مشرکین کی حقیقت سنجی، وصداقت شعاری اور ہر حیثیت سے مسلم ہے، لیکن اس بارۂ خاص مین اُن کی ساری صداقت شعاری کُند ہو جاتی تھی۔ انھین اس مین کوئی مضایقہ ہی نہین نظر آتا تھا، کہ آدمی قایل تو کسی اور عقیدہ کا ہو، لیکن عملاً رومی مراسم کی پابندی کرتا رہے۔ یہ مسئلہ کہ انسان کے عقیدہ وعمل مین توافق ہونا چاہیے، اور ان کے درمیان تناقض ہونا ایک طرح کی بد دیانتی ہے، تمام تر ایک جدید تخیل ہے، جس سے قدما، بالکل ناآشنا تھے۔ ممکن ہے کہ قدماء کے مثل، کوئی جذبہ آج کل ہمارے ذہن مین بھی پیدا ہوتا ہو، لیکن ہم لوگ کم از کم اُسے زبان سے تو نہین نکال سکتے۔ مگر قدماء کے نزدیک اس مین ذرا عیب نہ تھا۔ اُس وقت ہر بڑے سے بڑے مشکک کی زبان پر الحاد وانکار، تشکیک و تذبذب کے پُر زور دعوی ہوتے تھے، لیکن اعضا و جوارح علانیہ مذہبی مراسم کی پابندی مین مشغول رہتے تھے اور وہ اسے جائز ہی نہین، بلکہ فرض سمجھتا تھا۔ سسرو سے زیادہ قدیم وہم پرستیون اور ضعیف الاعتقادیون کی کس نے پردہ دری کی ہے؟ سنیکا سے بڑھ کر کس نے عبادات رائج الوقت کا استخفاف کیا ہے؟ ایپکٹیٹس سے بڑا موحد قدما مین اور کون ہوا ہے؟ لیکن بااینہمہ یہ سب کے سب اس پر زور دیتے تھے، کہ ملکی مراسم کی پابندی بہرحال کرتے رہنا چاہیے کہ یہ بہترین فرض شناسی وبہترین آئین دوستی ہے، اور اس کا منکر قانون شکنی کا مجرم ہے۔ یہ عقیدہ تمام ملک مین چھایا ہوا تھا صرف یہودی و مسیحی اس سے مستثنے تھے، اور یہ اسی استثناء کی سزا تھی کہ انھین مشرکون کی تعدی کا ہدف بننا پڑا۔ یہ لوگ ایک ایسے اصول کا

اتباع کرنا چاہتے تھے، جس کی بھنک بھی مشرکون کے کان مین نہین پڑی تھی۔
پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ رومہ نے مشرق سے بادشاہ پرستی کا سبق سیکھ
لیا تھا، اور سلاطین کے مجسمون کے آگے خوشبوون کا جلانا عین علامت
وفاداری کی سمجھا جاتا تھا۔ اس رسم سے کچھ یہ لازم تو آتا نہین، کہ انسان خواہ مخواہ
سلاطین کو اپنا معبود بھی سمجھنے لگے۔ یہ تو خالی ایک دستور تھا جیسے مشرقی ممالک مین بادشاہ وقت
کو ظل سبحانی کہنے کا دستور ہے۔ مگر عیسائیون کو اس کے ادا کرنے مین تامل ہوتا تھا
کہ وہ اسے مسیح کی تعلیمات کے منافی پاتے تھے؛ اور ان کے اس انکار پر رومیون
کو قدرۃً وحشت ہوتی تھی۔
مشرکانہ اعمال ورسم کی پابندی جس طرح مسیحیون کے لیے دشوار تھی،
اسی طرح یہودیون کے لیے بھی تھی۔ تاہم یہودیون پر تعدی کی کوئی شہادت نہین
ملتی۔ بلکہ جہان تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے وہ روم کے ایک خاص محلہ مین سب سے
علیحدہ، نہایت سکون، اطمینان، واعزاز کے ساتھ رہا کرتے تھے، جو نہ خود مشرکانہ
رسوم کے نزدیک جاتے، اور نہ کوئی اُن کے اعمال مین دست اندازی کرتا۔
ایک تائبریس کی استثنائی مثال ہے، جس نے اُن کو چھیڑنا چاہا، مگر اُس وقت
خاص حالات بھی آپڑے تھے۔ ورنہ عموماً اُن پر شاہانہ لطف ونوازش کا یہ حال
تھا، کہ محض اُن کی خاطر سے اغسطس نے غلہ تقسیم کرانے کا دن بجائے ہفتہ کے
کوئی اور دن مقرر کردیا۔ کیونکہ ہفتہ کے روز تقسیم غلہ کا یہ نتیجہ تھا کہ یہود یا تو غلہ سے
محروم رہتے، اور یا اپنے یوم السبت کے احترام کو نقصان پہونچاتے۔
القصہ جمہوریت کی قدیم عدم رواداری اب رومی سلطنت کے زمانے مین
معدوم ہو چکی تھی، آزادی رائے، وحریت اعتقاد تو خیر عرصے سے عام طور پر شائع
تھی ہی لیکن اب حریت عمل بھی، باوجود قانون کی روک تھام کے رفتہ رفتہ

پھیلتی جاتی تھی، اور ثائیرئیس کے انتقال کے بعد پوری طرح پھیل گئی تھی۔ ملکی اعمال و مراسم کی پابندی جس پر اتنا زور دیا جاتا تھا، اب یہود اس سے بھی آزاد ہو گئے۔ پھر سوال یہ ہے، کہ عیسائیون نے کیا قصور کیا تھا جو تنہا وہی ہدف تعدی رہے؟ شرک و بت پرستی کے دشمن ہونے کے لحاظ سے یہود و مسیحی دونون یکسان تھے، پھر آخر یہود کیون بچ گئے، اور مسیحی غریب کیون مورد عقوبت قرار پائے؟

اس کا اصلی سبب، قدما کا وہی مذہبی تخیل تھا جس کی جانب مین اوپر اشارہ کر چکا ہون، یعنی یہ کہ دنیا مین جنگی، سیاسی، طبعی، جتنی آفات آتی ہین، سب کا باعث دیوتاؤن کی ناخوشی ہوتی ہے؛ دیوتاؤن کی جب نافرمانی کی جاتی ہے، یا اُن کی عبادت کی طرف سے غفلت برتی جانے لگتی ہے، تو وہ اپنی ناراضگی کا اظہار، قحط، خشک سالی، طاعون، زلزلہ، سیلاب، یا کسی اور بلا کی صورت مین کرتے ہین۔ اس خیال کے بموجب جب کبھی رُوم مین کوئی مصیبت نازل ہوتی تھی، تو جو لوگ دیوتاؤن کو ناخوش کرنے کے اصل بانی سمجھے جاتے تھے، اُنھین سخت سے سخت سزائین دی جاتی تھین، چنانچہ اس طرح کے دو واقعات کی تاریخی شہادت موجود ہے، کہ "مذہبی کنواریون" کو اس جرم مین قتل کر ڈالا گیا، کہ اُن کی بدچلنی کے باعث ملک پر مصیبت نازل ہوئی۔ اس تھیوری (نظریہ) کے مطابق یہود و مسیحی دونون یکسان نافرمان، اور محرکات غیظ ربانی تھے۔ لیکن ان دونون مین ایک اہم فرق یہ تھا، کہ یہودیون کا مذہب تبلیغی نہ تھا، مسیحیون کا مذہب تبلیغی تھا۔ یہودیون کا حلقہ محدود و مختصر تھا، مسیحیون کا وسیع و روز افزون تھا۔ یہود مین بالطبع سکون تھا، اور وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے، جب سے اُن کی بدمذہبی متعدی نہین ہونے پائی تھی، اور پھر وہ سب کے سب اسرائیلی

نسل کے لوگ تھے۔ برخلاف اس کے مسیحیون مین ایک خاص حرکت تھی، یہ اہل ملک سے ملتے جلتے، انھین اپنے عقاید کی تلقین کرتے، اپنا ہم خیال بناتے رومی بُت پرستی پر لعن طعن کرتے، اور ہزارہا رومی کو اپنے حلقے مین شریک کرتے۔ اس بنا پر قدرۃً اہل روم کی آتش غضب انھین کے خلاف بھڑکی، اور وہ انھین کو ساری مصیبتون اور آفتون کا باعث سمجھنے لگے۔ قحط، وبا، زلزلہ، خشک سالی، غرض ہر مصیبت پر مسیحیون کی قربانی کی جاتی۔ خصوصاً زلزلہ کے موقعون پر، اور زلزلہ اس طرف تھے بھی کثیر الوقوع۔

مشرکین کے اس تخیل کا مختلف ادیان کی ترقی و تنزل پر جو اثر پڑا، اس کی عظیم الشان اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسیحیت کو اپنی زندگی کے ابتدائی تین سو سال تک متصل اسی کے باعث سخت سے سخت مصائب کا سامنا کرتے رہنا پڑا۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ خود مسیحی بھی اس اصول کے منکر نہ تھے۔ وہ بھی اس کی صداقت کے ایسے ہی قائل تھے، جیسے مشرکین تھے، البتہ عملاً وہ اس کی تعبیر اپنے موافق کرتے تھے۔ مثلاً ہمارے قدیم مسیحی مصنفین ٹرٹولین و سایپرین اپنا یہ مستحکم یقین ظاہر کرتے ہین، کہ دنیا پر جو مصیبت آتی ہے، وہ یا بت پرستی پر غضب الٰہی ہوتی ہے اور یا حق پرستی پر جو تعدی و تشدد ہوتا ہے، اُس کی سزا کی طور پر نازل ہوتی ہے چنانچہ ایک فہرست بھی اُن اشخاص کی تیار کی گئی، جو مسیحیت کے دشمن تھے، اور جن کی موت سخت دردناک طریقون پر ہوئی تھی۔ اور قسطنطین، اولین حکمران مسیحی کو جو فتوحات عظیم حاصل ہوئین اور ایریس کی جو دفعۃً موت ہوئی، ان واقعات سے صاف مسیحیت کے احقاق اور الحاد کے بطلان کا نتیجہ نکالا گیا۔ ایک طرف تو مسیحیون کا یہ خیال تھا، دوسری طرف رومی حکومت کے روز افزون انحطاط کو دیکھ کر اہل رومہ مین قدرۃً یہ خیال پیدا ہوا

کہ یہ سب معبودان حقیقی کی طرف سے اُن کی غفلت و بے اعتنائی کا نتیجہ ہے، اور اس بنا پر وہ جوش مین آکر اور تعدی و تشدد کرنے لگے۔ مگر جب مشرکون کی کامیابیان بڑھین اور انھون نے روم کو محصور کر لیا، تو مسیحی علما کو بھی اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنا پڑا۔ اب وہ اس طرح کی باتین لکھنے لگے۔ کہ روم پر تو قبول مسیحیت کے قبل بھی سخت سے سخت بلائین آچکی ہین، اور اب جو بلائین آئی ہین وہ عیسائیون کے لیے اس امر کے تازیانے ہین کہ وہ خود مسیح کی تعلیمات پر عملدرآمد کیون نہین کرتے۔ سینٹ آگسٹاین نے یہ تاویل پیش کی، کہ روم خداوند کا شہر ہی نہین، اور اس لیے اُس کے محاصرے سے مسیحیت کو کچھ نقصان نہین پہونچ سکتا، سینٹ گریگوری نے یہ ارشاد فرمایا، کہ اٹلی کے یہ مصایب قیامت کے ابتدائی علامات ہین۔ آخرکار جب روم مسیحیون سے نکل کر غنیم کے ہاتھ آگیا، تو مسیحی بجاے اپنی تعلیمون پر نادم ہونے کے یہ کہنے لگے، کہ یہ تو ایک خاص پیشینگوئی پوری ہوئی اور اپنا مذہبی تقدس ووقار اس آن بان سے قائم رکھا، کہ اُن کے بت پرست فاتحین عین فتحمندی کے وقت اُن سے مرعوب ہوگئے۔ پھر یہ تائید ایزدی کا مسئلہ اور بہت سے موقعون پر مسیحیون کے مفید پڑا۔ مثلاً باشندگان برگنڈی کو جب وحشی قوم ہن نے بہت ستایا، تو ایک بار اُنھون نے یہ عہد کیا، کہ سب سے بڑے معبود یعنے خداے روم کی پناہ مین آجائین، اور اس طرح وہ مسیحیت پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح کلووس شاہ فرنگ نے ایک مرتبہ ایک سخت لڑائی کے موقع پر اپنے دل مین یہ منت مانی، کہ جنگ کا فیصلہ اگر اُس کے موافق ہوا، تو وہ اپنی بیوی کے خدا پر ایمان لے آئے گا۔ اُس کی آرزو پوری ہوئی، اور وہ مع اپنے ہزارہا اتباع کے مسیحیت مین داخل ہوگیا۔ خود انگلستان مین دو صوبون، یعنی نارتھمبریا و مرسیا کے مسیحیت قبول کرنے کا ایک سبب یہی ہوا، کہ ان کے خیال مین ایک مسیحی تاجدار کو

محض تائید ایزدی سے فتح حاصل ہوئی تھی بگلیریا کا بھی ایک فرمان روا مع اپنی رعایا کے مسیحیت پر اسی طرح ایمان لے آیا۔ یہ مسئلہ تائید ایزدی مسیحیون کے دلون مین ایسا راسخ ہو گیا تھا کہ آگے چل کر مسیحیون کو مسلمانون کے مقابلے مین جو پے در پے شکستین اور حسین بُری طرح سے وہ کروسیڈ (محاربات صلیبی) مین ناکام رہے، اُن مین کوئی شے اُن کے اس عقیدہ کو متزلزل نہ کر سکی۔ قرون وسطیٰ مین یہ عقیدہ برابر شائع رہا، قسم قسم کی مسیحی انجمنون، خانقاہون، اور درگاہون کی خوب ترقی ہوتی رہی، اور اس درمیان مین جتنے غیر معمولی واقعات وحوادث پیش آتے رہے، مختلف پارٹیان انھین برابر خدا کی دست اندازی و ربانی تصرف پر محمول کرتی رہین مثلاً کوئی ان کا ذمہ دار اشاعت الحاد کو قرار دیتا، کوئی انھین تھیٹر کے تماشون سے منسوب کرتا اور کوئی یہ کہتا کہ یہ ساحرون اور ملحدون کے ساتھ رعایت کرنے کا نتیجہ ہے۔ رفتہ رفتہ یہ عقیدہ، غیر محسوس طریقے پر مٹتا گیا تا آنکہ بالکل فنا ہو گیا۔ الفاظ کے ذریعے سے بے شبہہ، اب بھی کبھی کبھی اظہار ہو جاتا، لیکن عقیدے کی اندرونی قوت بالکل مٹ گئی۔

یہ مسیحیون پر جو تعدی و تشدد جاری تھا، اس کا تعلق جہان تک رومہ کے عام غیر تعلیم یافتہ افراد سے تھا، اس کا سبب تو یہی تھا، جو اوپر بیان ہو چکا لیکن ایک سبب اور تھا، جو تعلیم یافتہ رومیون مین مسیحیت کی طرف سے منافرت پیدا کیے ہوئے تھا، اور یہ سبب دینی و مذہبی نہین، بلکہ خالص ملکی و سیاسی تھا بات یہ ہے، کہ مسیحیت کی حیثیت اُس زمانے مین ایک منضبط، عظیم الشان و خفیہ انجمن کی تھی، اور اس سے زیادہ کوئی شے اُس وقت حکومت کی نظرون مین ناپسندیدہ و مبغوض نہ تھی، اُس وقت درحقیقت حکومت کی طرف سے ہر ایسی انجمن کی قیام کی ممانعت تھی، جو کسی وقت مین بھی سازشی کارروائیونکی

جھگڑے بن سکے۔ ایسی حالت میں ایک ایسی جماعت جس کے صد ہا سرگرم دا عی ہوں، جو اپنی مجالس کی کارروائیوں اور اپنی تعلیمات کو راز رکھتی اور جو ملک کے گوشے گوشے میں محیط ہو، جو اپنے ارکان میں اپنے لیے انتہائی ایثار بلکہ سرفروشی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہو، اور جس کی وسعت اثر و تعمیم روز افزوں ہو، قدرۃً حکومت کے زبردست ہی، زبردست شبہ، بدگمانی، و خوف کا باعث بن سکتی تھی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور اس اثر کے منکر اُس زمانے کے مسیحی متکلمین بھی نہیں، گو اسی کے ساتھ وہ یہ کہتے تھے، کہ ان کی ساری جماعت میں کسی ایک فرد واحد پر بھی حکومت کے خلاف سازش یا بغاوت کا الزام کبھی ثابت نہ ہو سکا اور غور کیجیے، تو یہ کوئی چھوٹی نہیں، بلکہ بہت بڑی بات تھی۔ یہ سب کچھ سہی پھر بھی رومیوں کا ایسی جماعت کی طرف سے بدگمان رہنا کچھ بھی بیجا نہ تھا، جو ان کی حکومت کو دجال کی حکومت سمجھتی تھی، جو اُس کی بربادی کی آرزومند رہتی تھی جس نے قومیت کے مایۂ خمیر جذبۂ وطنیت کو مٹا کر اس کے بجائے ایک نیا جذبہ پیدا کیا تھا، اور جس نے قدیم محرکات عمل و توقعات کی بالکل بیخ کنی کر ڈالی تھی۔

یہ بھی کچھ کم حیرت انگیز بات نہیں، کہ عیسائی، جن کی مذہبی تعلیمات کی بنیاد وفا و محبت، خلوص و الفت پر ہے، انھیں مشرکین رومہ عناد پیشہ، و اعداء نسل انسانی، کہتے تھے۔ مگر اس خیال کی ذمہ داری خود مسیحیوں کے طرز عمل پر ہے، جو اپنے تئیں رومہ کی عام آبادی سے بالکل الگ و بے تعلق رکھتے تھے، جو رومیوں کی عام خوشیوں، تفریحوں اور تقریبوں میں شریک ہونے سے محترز رہتے، اور ہر شعبۂ حیات میں اُن سے گریز رکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس خیال کو عیسائیوں کے اُس تخیل نے اور تقویت دی ہو جو وہ رومیوں کی حیات اخروی سے متعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مشرکین رومہ اس علم کے بعد

کہ مسیحی اُن کے مردود ازلی و جہنمی ہونے کا یقین رکھتے ہیں، کیونکر اُن سے محبت و لطف قائم رکھ سکتے ہیں۔

اس عام بدظنی، مغایرت و بیگانگی سے قطع نظر کرکے شدید ترین جرائم کے مخصوص الزامات بھی مسیحیوں پر لگائے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ جب رات کو اپنی خفیہ انجمنوں میں جمع ہوتے ہیں تو سخت سے سخت بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، خوب شراب کباب اُڑاتے ہیں، انسان کا گوشت کھاتے ہیں، اور پھر روشنی گل کرکے زناکاری میں مشغول ہوجاتے ہیں، جس میں حلال حرام، ماں بہن تک کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ یہ الزامات قطعاً غلط و بے بنیاد تھے۔ چنانچہ مسیحی متکلمین اُس وقت بار بار یہ دعویٰ و تحدی سے کہتے تھے، کہ "ہمارے شہیدوں میں کسی ایک پر بجز مسیح پر ایمان لانے کے اور کوئی جرم ثابت تو کرو۔ ہاں یہ البتہ کہو، اور اس کے ہزارہا شواہد اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ ہمارا مذہب شقی کو سعید، بدمعاش کو صالح، بدکار کو نیک چلن بنا دیتا ہے، اور قساوت کی جگہ دلوں میں الفت و خلوص، رافت و اخوت کی پاکیزگی بھر دیتا ہے"۔ ان کے اس دعوے کو مخالفین تک تسلیم کرتے تھے، اور یہ تسلیم کرنے والے کون لوگ تھے، کوئی ایسے ویسے نہیں، بلکہ لوسین، جولین و پلینی، جیسے جلیل المرتبہ اکابر۔

ان اتہامات کے بے بنیاد ہونے میں تو کلام ہی نہیں، لیکن آخر یہ پھیلے کیونکر؟ اس کے متعدد اسباب ہوئے۔ ایک سبب تو خود عیسائیوں کی حد سے بڑھی ہوئی رازداری تھی۔ یہ اپنی اکثر رسمیں غیروں سے بالکل چھپا چھپا کر ادا کرتے، جس کا اُنھیں کسی طرح علم نہ ہونے پاتا، اس سے قدرۃً باہر والوں کو طرح طرح کے شبہے پیدا ہوتے، اور یہی شبہے، مبالغہ بیانیوں کی مدد سے طرح طرح کے

اتہامات کی شکل اختیار کر لیتے - پھر عیسائیون کے یہان بعض چیزین تھین بھی ایسی، جن مین خواہ مخواہ مبالغہ کا بہت موقع حاصل تھا، مثلاً بوسۂ محبت کی رسم، یا ان کا یہ عقیدہ کہ تمام مسیحی، مسیح کے جسم کے جزو ہین، وغیرہ - اس کے علاوہ پولیس کا انتظام اس زمانے مین ایسا ناقص تھا کہ مخفی جرائم کی سراغ رسانی نہایت دشوار تھی، اس سے یہودیون کے پُراسرار رسوم بھی مدتون جرائم شدید کے مرادف سمجھے گئے، اور اسی سے مسیحیون پر بھی بے بنیاد اتہامات کی پردہ دری نہ ہو سکی - ان تمام اسباب سے قطع نظر کرکے ایک اور سبب، جس سے مشرکون کے اس خیال کی تائید ہوئی، یہ تھا، کہ مشرکین، مسیحیون کو یہود کی ایک شاخ سمجھتے تھے، اور یہود چونکہ پیشتر سے سخت مطعون و بدنام تھے، لہذا اُن کی ساری بدنامی مسیحیون کے نامۂ اعمال مین بھی لکھ لی گئی - مشرکون کو تو یون منافرت پیدا ہوئی - رہے یہود، تو وہ مشرکون سے بھی زیادہ عیسائیون کے دشمن نکلے - انکے نزدیک مسیحی اس معصیت کبیرہ کے مرتکب تھے، کہ موسوی شریعت سے مرتد ہو گئے تھے، وہ یہ کس طرح بھول سکتے تھے، کہ جب یروشلیم کا مشرکون نے محاصرہ کر لیا، اور یہود کے زن و مرد، بوڑھے بچے، سب اپنے مقدس وطن کی آخری حفاظت کے لیے اپنا خون بہانے کو اُٹھ کھڑے ہوئے، تو اُس وقت جن لوگون نے بیوفائی کرکے شرکت سے انکار کر دیا تھا، وہ یہی عیسائی مذہب کے لوگ تھے؟ اُن کے ذہن سے یہ کیونکر فراموش ہو سکتا تھا، کہ مسیح موعود جس کی بعثت پر اسرائیلیون کی شوکت و عظمت مرحومہ کی حیات ثانیہ کا انحصار تھا، اُس کے بابت جو لوگ یہ دعوی کرتے تھے، کہ وہ عیسی کی شکل مین مبعوث ہو چکا، وہ یہی عیسائی تھے؟ وہ اس حقیقت کو کیونکر نظر انداز کر سکتے تھے کہ قوم بنی اسرائیل جو اس وقت تک خدا کی خاص مقبول و برگزیدہ سمجھی جاتی تھی، اُس کی برگزیدگی و شرف مخصوص کے

طلسم کو جس نے باطل کر دیا، وہ یہی متبعین مسیح تھے؟ ان واقعات کی یادداشت کے ساتھ، اور خصوصاً اس حالت میں کہ یہود خود اپنے تئیں تمام دنیا کی نظر میں مبغوض پاتے تھے، اُن میں اور مسیحیوں میں عداوت پیدا ہو گئی، اور ایسی سخت عداوت ہوئی، کہ اس کے آگے مشرکوں کی عداوت بھی ماند پڑ گئی۔ اس کا اثر مشرکوں کے تعلقات پر یہ پڑا، کہ جہاں ایک طرف عیسائی، یہود کی مصیبتوں پر جی بھر کے خوش ہوتے تھے، کہ یہ خدا کے قہر و غضب میں مبتلا قوم مستحق اسی کی ہے، وہاں یہود اس کا انتقام یوں لیتے تھے، کہ مسیحیوں پر تہمتیں تراش تراش کے مشرکوں میں خوب اس کی اشاعت کرتے، اور اس طرح مشرکوں کے دلوں میں مسیحیوں کی طرف سے اور زیادہ میل آتا جاتا۔ اسی سلسلے میں ایک اور پُر لطف واقعہ یہ ہوا کہ راسخ العقیدہ و قدیم الخیال مسیحی خود تو مشرکوں کی تعدی و تشدد سے تنگ تھے، لیکن خود ہی اپنی جماعت کے آزاد مشربوں اور روشن خیالوں کے ساتھ انتہائی عدم رواداری کا برتاؤ کرتے تھے، بلکہ گویا اُن سے اسی طرح پیش آتے تھے، جیسے خود اُن سے مشرکین پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ جو اتہامات اُن پر مشرکین لگاتے تھے، اُنھیں وہ بلا تامل اپنی آزاد مشرب جماعت کے سر تھوپ دیتے تھے۔ پہلے کچھ دنوں تو ان کے لہجے میں شک و تذبذب رہا، لیکن اس کے بعد اس میں بالکل قطعیت پیدا ہو گئی۔ مثلاً جب مشرکین نے کہا، کہ اپنی مجلسوں میں انسان کا گوشت کھاتے ہیں، اور روشنی گل کر کے اپنی ماؤں بہنوں کے ساتھ زنا کاری کرتے ہیں، تو قدیم الخیال عیسائیوں نے اس کی تردید میں کہا کہ "ہم تو ان عیوب سے بالکل پاک ہیں، البتہ ممکن ہے کہ روشن خیالوں کی مجلسوں میں شاید ایسی کارروائیاں ہوتی ہوں۔" کچھ دنوں اس طرح کے بیانات میں "شاید" و "غالباً" کی آمیزش رہی، مگر اس کے بعد یہ روایات بہ طور مسلمات کے بیان

ہونے لگین۔ آزاد خیال فرقہ کی طرف سے اس بیہودگی کا قدرتی جواب یہ ملا کہ "یہ تحریکین خود تمھاری ہین" مشرکون نے عیسائیون کی اس اندرونی جوتی پیزار سے فایدہ اُٹھایا۔ اُن کے نزدیک یہود، اور جدید و قدیم عیسائی فرقہ سب ایک سے تھے۔ وہ ان جرائم مین سب کو شریک سمجھتے اور ان کے ارتکاب کو سب کی جانب یکسان منسوب کرتے۔

یہ سارے مذہبی و سیاسی اسباب تو تھے ہی، ان کے علاوہ ایک معاشری سبب بھی مسیحیون و مشرکون کے درمیان منافرت و مغایرت کا پیدا ہو گیا، اور وہ سبب بالکل خانگی زندگی سے متعلق یعنی بیویون کا اپنے شوہرون کے دین کو چھوڑ کر مسیحیت کا قبول کرنا تھا۔ اُس زمانے مین یہ مشہور تھا کہ مسیحیت کے منادی کرنے والے کو عورت کا دل تسخیر کرنے مین یدطولیٰ حاصل ہے اور اس ملکہ خاص کا یہ اثر ہوا کہ سیکڑون ہزارون عورتون نے اپنے شوہرون کے دین کو چھوڑ کر مسیحیت پر ایمان لانا شروع کر دیا، اور ان حالات کے رو سے مشرکون کے لیے بیوی کے ارتداد سے بڑھ کر کوئی شے دل آزار کلفت دہ اشتعال انگیز نہین ہو سکتی تھی۔ پلوٹارک اپنے ہم مذہبون کے حقیقی جذبات کی ترجمانی ان الفاظ مین کرتا ہے:۔

"بیوی کا کوئی دوست نہ ہونا چاہیے بجز اُس کے کہ جو اس کے شوہر کا دوست ہو۔ اور چونکہ خدا سے بڑھ کر کوئی دوست نہین ہو سکتا لہذا بیوی کو ہرگز کسی خدا پر ایمان نہ لانا چاہیے بجز اس خدا کے کہ جس پر اُس کے شوہر کا ایمان ہے۔ اسی واسطے عورت کو چاہیے کہ تمام غیر مذاہب و ادیان پر اپنا دروازہ ہمیشہ بند رکھے۔ خود خدا بھی کسی ایسی عبادت سے خوش نہین ہوتا جو بیوی نے شوہر کے

علم کے بغیر کی ہو"

یہ مسئلہ، مشرکون کے یہان اصل الاصول کا مرتبہ رکھتا تھا جس کی بنیاد پر اُن کے سارے نظام معاشرت کی عمارت کھڑی تھی۔ عیسائیون نے جب اسی کو اُکھاڑنا شروع کیا، تو مشرکون کو اُن سے کیونکر نہ نفرت پیدا ہو جاتی؟ دنیا مین کون شوہر ہے گوارا کر سکتا ہی کہ اُس کی بیوی گو اس کی اطاعت کرتی جائے، لیکن ساتھ ہی دل مین یہ بھی سمجھتی رہتی ہو، کہ وہ قابل نفرت، مستحق لعنت، اور دوزخ کا کُندا بننے والا ہی۔

ہان ایک بات اور بھی تھی، جسے مشرکین کی اصطلاح مین مسیحیون کی وہم پرستی کہنا چاہیے۔ وہم پرستی سے جھاڑ پھونک مراد نہین، کہ یہ تو عوام مشرکین کے نزدیک بھی قابل اعتراض نہین بلکہ مستحق ستایش تھی۔ ہان جوتشی اس سلسلہ مین اُن کے نزدیک مجرمانہ حیثیت رکھتی تھی، وہ کہانت سیاسی تھی، یعنی یہ پیشینگوئی کرنا کہ آیندہ وارث سلطنت کون ہوگا؟ لیکن اس جرم کے مسیحی کبھی مرتکب ہی نہین ہوئے۔ وہم پرستی سے اصل مراد مشرکون کی، وہ تخویف تھی، جو عذاب اُخروی سے عوام کے قلوب مین مسیحی پیدا کر دیتے تھے۔ حشر و نشر کی دہشت، مسیحی تعلیم کا جزو غیر منفک تھی، اور کسی ایسی شے کی دہشت دلون مین بٹھانا، رواقیین ولذتیین، تمام بُت پرست فلاسفہ کے نزدیک شدید ترین بداخلاقی و معصیت تھی۔ یہ لوگ اس کے سننے کی تاب ہی نہین لا سکتے تھے، کہ بجز گنتی کے چند عیسائیون کے، ساری مخلوقات ہمیشہ جہنم مین پڑی جلا اور سڑا کرے گی۔ بچہ، عورتین، غیر تعلیم یافتہ مرد، غرض تمام ضعیف الدماغ افراد عیسائیون کے عقیدۂ نجات مختص سے خاص طور پر متاثر ہو ہو کر جوق جوق مسیحیت کے زمرے مین آتے جاتے، اور اسی کو دیکھ کر مشرک حکما، دفرمان روا

جلتے تھے، اور سخت سے سخت قوانین نافذ کرتے تھے۔ مارکس آرلیس کے زمانے مین جو یہ قانون نافذ ہوا تھا، کہ "جو شخص کمزور دل و دماغ کے آدمیون کے ذہن مین کسی قسم کی وہمی دہشت بٹھائے گا، وہ جلاوطنی کی سزا کا مستوجب ہوگا" یہ اسی قسم کے مشاہدات کا نتیجہ تھا۔

مگر ان تمام اسباب سے بھی بالاتر سبب، خود مسیحیون کی عدم رواداری تھی رومیون کو رواداری سب سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ ہر مذہب و ملت کے ساتھ روادارانہ برتاؤ کے لیے تیار رہتے تھے۔ چنانچہ یہود کے ساتھ انھون نے مطلق تعدی نہین کی، حالانکہ یہود بھی مسیحیون کے برابر ہی اُن سے بیگانہ رہتے تھے۔ لیکن مسیحیت کی تعلیم محض اتنی ہی تو نہ تھی کہ وہ صحیح ہو، بلکہ یہ بھی تھی، کہ بجز مسیحیت و یہودیت کے، جملہ مذاہب باطل و شیطان کے پیدا کردہ ہین، جن کے متبعین یقیناً مورد آلام اُخروی ہون گے۔ جو لوگ اس عقیدہ کے نشہ مین سرشار رہتے تھے، اور مشرکون کی ہر ریت رسم کے پیچھے شیطان کا ہاتھ دیکھتے تھے، اُن سے یہ کیونکر ممکن تھا، کہ ان کے ساتھ صلح و رواداری، رفق و آشتی کا برتاؤ رکھتے۔ وہ تبلیغ کے کام مین سرگرمی سے مشغول تھے، اور اس لپیٹ مین اپنے حریفون کے ساتھ سب و شتم تمسخر و طنز، تذلیل و توہین، کسی شے مین بند نہ تھے، بلکہ اکثر ان کے معبودون تک کی جن کی خوشی پر اُن کے خیال مین ملک کی امن و خوشحالی کا دارومدار تھا، انتہائی تحقیر مین مطلق باک نہ رکھتے تھے۔ غلو و تعصب کا یہ سیلاب تند دیکھ کر مشرکین گھبرا اُٹھے اور انھین یہ یقین ہوگیا، کہ ملک پر جتنی آفتین نازل ہو رہی ہین، یہ سب قہر الٰہی کی شکلین ہین، جو ان بے ادبیون کے پاداش مین مسلط کی گئی ہین۔ یہ حال تو عوام کا تھا۔ رہے ارکان حکومت، تو اگرچہ وہ خود لامذہب سے تھے، تاہم ملک و سلطنت کی بقا، اور ایسی سلطنت کی بقا جس کی رعایا مین ہر ملت و مذہب کے

لوگ آباد ہون، تو اسی مین نظر آتی تھی کہ رواداری عامہ کو قایم رکھا جائے، اور ہر ایک ملت کو اپنے اپنے مراسم کی پابندی کی پوری آزادی دی جائے۔ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر وہ ایسے مذہب کی اشاعت کیونکر پسند کر سکتے تھے، جو قدم قدم پر اپنی غیر مصالحانہ روش سے دوسرون سے ٹکراتا تھا، جو اپنے سوا دنیا کے مذاہب و ادیان کو مٹا دینا چاہتا تھا، اور جس کے متبعین سے دوسرے مذہب والون سے دایمی جنگ رہتی تھی پھر جب جوش و خروش، غلو و تعصب اس کی محکومیت و قلت تعداد کی حالت مین تھا، تو اگر کہین اس کو غلبہ یا کثرت تعداد نصیب ہو گئی، تو اس صورت مین معلوم نہین، وہ غیر مذاہب پر کتنا جور و تشدد روا رکھے گا، اس مین شبہ نہین کہ یہ قیاس رومی ارکان حکومت کا اس وقت کے حالات و مشاہدات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بالکل صحیح تھا۔

اس مین ذرا شبہ نہین، کہ ابتدائی صدیون مین عیسائیون نے جو باہمی یگانگت، یکجہتی و خلوص کا نمونہ پیش کیا، اس کی مثال دنیا کی کسی قوم و جماعت مین کبھی نہین نظر آتی۔ یہ بھی مسلم ہے کہ لوگون کی اصلاح اخلاق مین جو کام ابتدائی مسیحیت نے کیا، اس کی نظیر بھی کہین نہین ملتی، لیکن ان حقیقتون کے اعتراف کے ساتھ یہ بھی قطعی ہے کہ عدم رواداری و عدم مسالمت کے جو واقعات اس جماعت مین نظر آتے ہین، ان کے جواب سے بھی تاریخ کے صفحے یکسر خالی ہین۔ مسیحیت کے ان ابتدائی خصوصیات کا ایک عملی نمونہ ہم کو حواری یوحنا کی زندگی کی دو حکایتون مین خوب ملتا ہے۔ پہلی حکایت یہ ہے کہ جب اس کے شاگردون کا سلسلہ اس کے گرد زیادہ ہوا، اور وہ ضعف سے کمزور ہو گیا، تو صرف یہ فقرہ اس کی زبان سے نکلتا کہ اے میرے فرزندو، ایک دوسرے سے محبت رکھو، یہی ایک فقرہ بہ قول اس کے سامعین قوانین و احکام مسیحیت کا ملخص تھا۔ دوسری حکایت یہ ہے

کہ ایک بار اس نے ایک نوعمر شخص کو ایک پادری کی سپردگی میں تعلیم و تربیت کے لیے دیا۔ پادری صاحب اُسے نہ سنبھال سکے، لڑکے نے آوارگی و بدمعاشی اختیار کی، یہاں تک کہ کچھ روز میں رہزنوں کا سردار ہو گیا۔ یوحنا کو اس کی اطلاع ہوئی، تو وہ اس پادری پر سخت ناخوش ہوا، اور اس کے بعد باوجود اپنی انتہائی کبرسنی کے خود جنگل میں گیا، جہاں وہ رہزن رہا کرتے تھے۔ ڈاکوؤں نے حملہ کر کے اُسے گرفتار کیا، اور اپنے سرغنہ کے پاس لے گئے۔ وہاں اس نے اس سے بغلگیر ہو کر اپنے آنسوؤں سے اس کی گردن کو تر کر دیا، اور آخرکار اُسے اس پیشہ سے تائب کر کے چھوڑا۔ تیسری حکایت یہ ہے کہ ایک بار یہی بزرگ ایک حمام میں غسل کر رہے تھے، اتنے میں دیکھا کہ ایک آزاد مشرب عیسائی بھی اسی حمام میں داخل ہو رہا ہے۔ معاً یہ گھبرا کر باہر نکل آئے، کہ کہیں غضب الٰہی سے حمام کی چھت نہ گر پڑے۔ تینوں حکایتیں اس وقت کے مسیحی مزاج و سیرت کی آئینہ ہیں۔ ان سے جہاں مسیحیوں کے خلوص و اخوت، اور سعی صلاح پر روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو کر آجاتی ہے، کہ وہ رواداری سے کس درجہ بیگانہ تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک دلچسپ بات یہ تھی، کہ راسخ العقیدہ مسیحیوں کے لیے آزاد مشربوں کے ساتھ بات چیت تک صاحب سلامت تک حرام تھی۔ مشرکوں کے ہدف مظالم بننے میں راسخ العقیدہ و آزاد مشرب دونوں طرح کے مسیحی برابر تھے، لیکن یہ اشتراک مظلومیت بھی رفع تعصب کے لیے کافی نہ تھا۔ جیروم نے اکثر خانگی زندگی تک کو تلخ و ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔

سینٹ سائپرین نے ایک مستقل رسالہ لکھ کر ثابت کیا، کہ مسیحیت کے قدیم و مروج طریقے سے باہر رہ کر کسی انسان کے لیے نجات حاصل کرنا اسی قدر ناممکن ہے، جس قدر طوفان نوح میں کشتی نوح کے باہر رہ کر طوفان سے بچنا ناممکن تھا۔

اور یہ کہ آزاد مشرب و بدعتی مسیحی خواہ مسیح ہی کے راہ مین جان دے، مگر اسے شہادت کا ثواب نہین نصیب ہوتا، بلکہ وہ سیدھا جہنم مین جھونک دیا جاتا ہی۔ اس خیال نے یہان تک قوت حاصل کی تھی، کہ عین قتل گاہ مین بھی قدیم خیال کے کٹر عیسائی، بدعتی و آزاد مشرب عیسائیون سے الگ ہوکر کھڑے ہوتے تھے، کہ مبادا ان کی لاش اُن کی لاشون سے مل جائے۔ سینٹ آگسٹاین اپنے بچپن کی ایک روایت بیان کرتے ہین، کہ "جس وقت تک مین عیسائی نہین ہوا تھا، میری مسیحی والدہ میرے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا تک نہین کھاتی تھین"۔ صدہا ہزارہا عیسائیون نے خاص خاص طرح کے لباس، اور خاص خاص طریقۂ معاشرت ترک کر دیے تھے، کہ کہین مشرکون سے مشابہت کا شائبہ نہ شامل ہو جائے۔ آگے چل کر سینٹ امبروز نے مسیحی سلاطین کو، جو شدید متعصبانہ مشورہ دیے، یہ سب اسی ابتدائی تعصب و عدم رواداری کی صداے بازگشت تھے۔ اُس وقت متکلمین، مشرکون کو تو رواداری کی تلقین کرتے تھے، لیکن خود اپنے گروہ کو ان وعدون سے خوش کرتے رہتے تھے، کہ حصول حکومت کے ساتھ ہی ہم مشرکون کے معابد کو مسمار کرنا شروع کر دین گے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد دنیا نے اس وعدہ کا ایفا، دیکھا۔ سلطنت حاصل کرنے کے بعد پہلے تو مصلحت اندیشی، اور مشرکون کی کثرت تعداد کے خوف نے چند روز روک تھام کی، لیکن قسطنطین کے زمانے سے مشرکون پر تشدد و تعدی کرنے والے قوانین کا نفاذ شروع ہو گیا۔ اسی زمانے مین فلاسفر انٹونینس، ایک مشہور مشرک کاہنہ کا فرزند، ایک بار اسکندریہ مین سراپیس کے مشہور مندر مین اپنے مریدون کے سامنے کھڑا ہوا تھا، کہ دفعتہً اُس پر غیب دانی کی حالت طاری ہوئی، اور اس نے پیشینگوئی کرنا شروع کی۔ اس وقت اس نے علانیہ کہا کہ "وہ دن آ رہا ہی، جبکہ یہ عظیم الشان عمارت، جہان ہم لوگ کھڑے ہوئے ہین،

مسمار کردی جائے گی۔ ہمارے مقدس معابد گورستان کا کام دینگے ہمارے بتون کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا جائے گا، اور نوع انسان پر ظلمت کی گھٹا چھا جائے گی۔" یہ پیشینگوئی اس قدر مقتضائے قیاس تھی کہ اس کے لیے کسی خاص غیب دانی یا کہانت کی قوت کی حاجت نہ تھی، بلکہ ہر تیز فہم شخص جو پیش بینی رکھتا تھا، رفتار واقعات کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکال سکتا تھا۔

اور پھر لطف یہ کہ مسیحیت کی عدم مسالمت سے مشرکون کی صرف حریت عبادات ہی خطرے مین نہ تھی، بلکہ اُن کی حریت افکار و حریت عقاید تک کی اب خیریت نہین نظر آتی تھی۔ کیونکہ بہ خلاف بت پرستون کی مسیحیت محض احتساب عمل کی نہین بلکہ احتساب فکری کی بھی مدعی تھی اور اپنے مخالفین کی بہ جبر زبان بندی پر تیار تھی۔ اس مین شک نہین، کہ حریت کی یہ شکل سب سے زیادہ دیر تک قائم رہی، چنانچہ قسطنطین کے عہد کے بعد تک بھی جبکہ مشرکون کے اعمال و عبادات کی راہ مین ہر طرح کی رکاوٹین حایل کی جا چکی تھین، اُن کے مشاہیر اپنے خیالات کو پوری بے تکلفی و آزادی سے ظاہر کر سکتے تھے، بلکہ بعض سخت متعصبین اور ان کے روشن خیال معاصرین مین بڑی گہری دوستی بھی تھی۔ لیکن یہ بے اصولی کب تک چل سکتی تھی؟ جب یہ اصول مسلم تھا، کہ راے و عقیدہ کی ہر غلطی ایک معصیت ہے، تو کیا وجہ تھی، کہ یہ معصیت، تعزیر و احتساب کی مستوجب نہ ہوتی؟ پادریون کی روز افزون قوت، راہبون کا مجنونانہ جوش، اور ایتھینیس و اگسٹائن کا غلو، یہ تمام واقعات اس نتیجے کے مقدمات ثابت ہوئے۔ چنانچہ تھیوڈوسیس کے عہد مین تمام مذاہب باطلہ کا بہ زور دبایا جانا، سیرل اور اس کے اتباع کے ہاتھون ہایپشیا کا قتل ہونا، اور جسٹینین کا ایتھنز کی درسگاہون کو بند کرا دینا، ان تینون واقعات نے، حریت فکری کا قطعاً سد باب کر دیا۔ ان اثرات سے

حریت فکری مٹی، اور ایسی مٹی، کہ پورے ایک ہزار سال کے بعد دنیا کو پھر اس کی جھلک دیکھنا نصیب ہوئی۔

فصل ہٰذا میں میں نے جو کچھ کہا، اس سے ہرگز میرا مقصود عیسائیوں کی مظلومیت کو ہلکا کرکے دکھانا نہیں، اور نہ مجھے ان کے اعلیٰ ترین ایثار، جانبازی و سرفروشی کے اعتراف میں ذرا بھی تامل ہے۔ بلکہ مجھے جو کچھ معروضات بالا کی مدد سے دکھانا تھا، وہ یہ ہے کہ مشرک فرمان رواؤں کی، جن میں سے بعض نہایت نیکنام گزرے ہیں، اور جن میں سے خصوصاً مارکس آریلیس تو ایسا رحیم، رعایا پرور، و عادل تاجدار ہوا ہے، کہ اس کی نظیر تمام دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، عیسائیوں پر یہ تعدی کچھ بیجا و بلا وجہ نہ تھی۔ بلکہ اگر ایک طرف ان کی اس خصوصیت کو پیش نظر رکھا جائے، کہ عیسائی سے کے مناظرے نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا تھا، اور ان میں وہ احساس ہی نہیں باقی رہا تھا جو آج ہم میں ہے، اور دوسری طرف اُن کے اس خوف و اندیشہ پر لحاظ رکھا جائے جو مسیحیوں کے عروج و اقتدار سے انھیں اپنی مذہبی آزادی سے متعلق پیہم تجربات و مشاہدات کے بعد پیدا ہو گیا تھا، تو وہ اپنی پیش بندیوں، اور مسیحی اقتدار کے روک تھام کی کوششوں میں بالکل حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے، اس موقع پر آپ یہ سوال کریں، کہ پھر مسیحی اقتدار رک کیوں نہیں گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکانہ تعدی، اُن زبردست معاشری، اخلاقی، و دماغی موثرات کے مقابلے میں بالکل ضعیف تھی، جو مسیحیت کے نشر و اشاعت میں معین تھے۔ یہ ایک اجمالی دعویٰ تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یعنی مشرکانہ تعدی کی کمزوری فصل آئندہ کا موضوع ہے۔

فصل (۵)

تعدیون کی تاریخ

کسی گذشتہ فصل مین ہمین معلوم ہو چکا ہی کہ جب مصری رسوم و آئین، رومہ مین داخل ہونے لگے، تو معاً اُن کی سختی سے مخالفت کی گئی، اُن کے انسداد کے لیے قوانین نافذ ہوئے، اور ایسے قوانین کا نفاذ بار بار ہوتا رہا، لیکن جب حکام نے دیکھا، کہ یہ روک تھام بے اثر رہتی ہی تو سختی کرنا خود ہی چھوڑ دی، اور مصری مذہب ملک مین متعارف ہو گیا۔ اس کے بالکل برعکس مسیحیت و رومی حکومت کا تعلق رہا ہی۔ اُس کا داخلہ رومہ مین بالکل بلا مخالفت و مزاحمت ہوا بلکہ بعض ضعیف روایات تو ایسی بھی ملتی ہین، کہ شروع شروع مین اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ خیر، یہ تو غالباً صحیح نہین، لیکن اس قدر قطعی ہی، کہ نیرو سے پیشتر کسی نے مسیحیون پر تعدی نہین کی تھی۔ اور نیرو کی تعدیون کا زمانہ آخر ۶۴ء سے شروع ہوتا ہی۔ لیکن اس وقت بھی مسیحیون پر بہ حیثیت اُن کے مسیحی ہونے کے تعدی نہین ہوتی تھی، بلکہ اس غلط شبہ کی بنا پر کہ اُنھون نے شہر روم مین آگ لگا دی تھی۔ اور پھر چونکہ یہ آتش زنی کی سزا تھی، لہذا کوئی عیسائی مسیحیت سے مرتد ہو کر اس سے بچ نہین سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ غالباً خاص شہر روم کی چار دیواری کے اندر محدود تھی، گو اس محدود حلقہ مین پوری قوت کے ساتھ جاری تھی۔ اُس وقت تک عیسائی جو مدت سے (یعنی کوئی ۲۰-۳۰ سال سے) تبلیغ کے کام کو جاری کیے ہوے تھے، شہر مین اپنی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کر چکے تھے اور اہل شہر کی نظرون مین سخت مبغوض تھے۔ لیکن نیرو کی سفاکانہ تعدیون نے

اور نیز اس حقیقت کے آشکارا ہو جانے نے کہ ان پر آتش زنی کا الزام قطعاً بے بنیاد تھا، اُن کی مظلومیت کا لوگوں کو یقین دلا دیا، اور لوگوں کو اُن پر خود بخود ترس آنے لگا اُن پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، اُن کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ انھیں جنگلی جانوروں کی کھال پہنا کر اُن پر شکاری کتے چھوڑ دیے جاتے تھے، جو اُن کے جسم کی بوٹی بوٹی کر ڈالتے۔ یا اُن کے کپڑوں پر تیل چھڑک کر اُن کے جسم میں جیتے جی آگ لگا دی جاتی۔ یا پھر بہتوں کو صلیب میں لٹکا دیا جاتا۔ غرض انھیں بیدردیوں سے سیکڑوں کی جانیں لی جاتیں۔ ان مظالم کا جو اثر مسیحی متخیلہ پر پڑا، اُس کا نمونہ اس سارے لٹریچر میں ملتا ہے، جو اسی زمانے میں مسیحیوں میں تیار ہوا، اور جس میں ایک روایت یہ بھی ہے، کہ نیرو نے ہنوز وفات نہیں پائی ہے، وہ زندہ ہے، اور خروج دجّال کے وقت تک زندہ رہے گا، بلکہ دجّال سے پیشتر اس کا ایک بار پھر خروج ہوگا، تاکہ اس کے ہاتھ سے آخری بار مسیحیوں پر تعدیاں ہوں۔ یہ روایت صرف کتابوں ہی میں مندرج نہیں رہی، بلکہ صدیوں تک لوگوں کا اس پر ایمان و اعتقاد رہا۔

نیرو نے ۶۸ء میں وفات پائی۔ اُس وقت سے لے کر کم از کم ۲۷ سال تک گرجا کو کسی نے مطلقاً نہیں ستایا۔ اس زمانے سے لیکر ڈومیشین کے عہد کے آخری سال تک مسیحیوں پر کسی قسم کے تعدی و تشدد کی شہادت نہیں ملتی، بلکہ جس آزادی سے وہ اس عرصے میں رہا کیے، اُس کا تازہ ثبوت ابھی حال میں اس انکشاف سے ملا ہے، کہ نیرو و ڈومیشین کے عہد کے درمیانی زمانے کا تعمیر شدہ، روم کی ایک شارع عام کے متصل ہی ایک بہت وسیع و خوشنما برآمدہ نکلا ہے، جو کسی بڑے مسیحی مقبرہ کا برآمدہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈومیشین نے تعدیوں کی تجدید کی، اور گو بہ لحاظ سفاکی و شقاوت ڈومیشین، نیرو کی ہمسری نہیں کر سکتا

تاہم جس دانشمندی و استقلال کے ساتھ اُس نے تعدیون کو جاری رکھا، اس کے لحاظ سے اس کا نمبر نیرو سے کہین بڑھ گیا۔ رواقیہ و اہل علم باوجود این (سلیمین) کے تشدد کے اب تک حریت سیاسی کی مشعل کو روشن کیے ہوئے تھے، آپ کے سخت ترین دار وگیر سے نہ بچ سکے۔ ان کے تمام اکابر یا قتل کر ڈالے گئے، یا جلاوطن کر دیے گئے۔ اول اول عیسائی اس زد سے محفوظ رہے، اُن کے خلاف سب سے پہلے ۹۵ء مین معمولی و خفیف کارروائی شروع کی گئی، لیکن اس کے متعلق ہمارے معلومات کافی نہین، بلکہ ہماری یہ اطلاع تو بہت ہی مشتبہ ہے، کہ اس کی علت قریبہ کیا تھی۔ مثلاً ایک روایت جس کا ماخذ ایک قدیم مگر ضعیف الروایت مسیحی مصنف ہے تو یہ ہے، کہ بادشاہ کو جب یہ خبر پہونچی، کہ مسیح کے بھائی یہودا کے پوتے موجود ہین، تو اس نے حکم دیا کہ اُس کے سامنے حاضر کیے جائین، کہ وہ داؤد کی نسل سے ہین، اور اس لیے ممکن ہے کہ تخت و تاج کے دعویدار ہون، لیکن جب وہ سامنے آئے، تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ محض غریب دہقان زادون کی طرح بسر کرنے والے ہین، اور جس حکومت کا وہ ذکر کرتے ہین، وہ حکومت روحانی ہے، ملک و دولت کی حکومت نہین، تو اس نے اُنھین رہا کر دیا، اور جو تعدیان شروع کی تھین، انھین روک دیا۔ ایک دوسری روایت، جو مشرکانہ ماخذ سے آئی ہے یہ ہے کہ ڈومیشین نے جب لہو و لعب مین اسراف بیجا کر کے خزانہ خالی کر دیا، تو لوگون نے اسے ترغیب دی، کہ یہودیون پر ایک سخت ٹکس لگا کر کے روپیہ وصول کرے، چنانچہ اسی لپیٹ مین یہود و مسیحی دونون آ گئے۔ غرض اس طرح کی مختلف روایات مشہور ہین، لیکن غالباً واقعہ یہ ہے، کہ ڈومیشین جیسا استبداد پسند تاجدار (...) کہ ایک بڑی جماعت اُس کے اقتدار سے اگر بالکل آزاد نہین تو کم از کم اس کی

طرف سے غیر ملتفت رہے۔ چنانچہ تعدی و تشدد کا آغاز ہوا، اور ان صورتون مین ہوا، کہ سینٹ جان (یوحنا) باوجود انتہائی کبرسنی کے جلاوطن کیا گیا، کلیمنس جو خود بادشاہ کا عزیز اور کانسل کے مرتبہ پر سرافراز تھا قتل کر دیا گیا، اس کی بیوی یا بھتیجی مع رفقا کی ایک کثیر تعداد کے جلاوطنی پر مجبور کی گئی، صدہا اشخاص اپنے عہدون سے معزول کیے گئے، اور سیکڑون قتل کر ڈالے گئے۔ ڈومیٹین کی ان تعدیون کا یہ سلسلہ ختم کیونکر ہوا؟ اس کے متعلق بھی دو مختلف روایات ہین۔ ایک تو یہ ہی، کہ خود ڈومیٹین ہی نے چند روز مین اپنے فرمان سابق کو منسوخ کر دیا، اور جلاوطنون کو پھر وطن مین واپسی کی اجازت دیدی۔ دوسری یہ ہے کہ ڈومیٹین کے یہ قوانین، اُس کی وفات کے بعد، نروا کے زمانے مین منسوخ ہوئے۔

یہ تعدی جس قلیل عرصے تک، اور جس کمزوری کے ساتھ جاری رہی، اُس کے لحاظ سے یہ امر مطلق حیرت انگیز نہین، کہ مسیحیت کی زبردست تحریک کو روکنے مین ناکام رہی۔ ڈومیٹین کے قتل کے بعد سے تاریخ رومہ کا عہد زرین شروع ہوتا ہی۔ یہ زمانہ یعنی ۹۶ء مین نروا کی تخت نشینی سے لے کر ۱۸۰ء مین مارکس آرلیس کی وفات تک، بت پرست مورخین کی نظر مین بہ لحاظ انتظام حکومت، عدل گستری، اصلاح شعاری، امن و آشتی، بہترین زمانہ ہوا ہی۔ اور عیسائی مورخین بھی اسے کچھ کم اہم نہین سمجھتے، کہ اس کی ابتدا مین گرجا کی قوت محدود تھی، اور اس کے اختتام پر گرجا نے اس قدر طاقت حاصل کر لی تھی، کہ اپنے بڑے سے بڑے مخالف کا بہ آسانی مقابلہ کر سکتا تھا۔ پس اب دیکھنا یہ ہی کہ اس ۸۴ سال کے زمانے مین، جس کی اہمیت سب کو مسلّم ہی، گرجا پر کس قسم اور درجہ کی تعدی جاری رہی؟ آیا وہ ایسی قوی تھی، کہ اُس کی مقاومت کرتے رہنا، اور اُس پر غالب آجانا بجز تائید ایزدی کے، اور کسی طبعی سبب پر محمول نہین ہو سکتا؟۔

اُس زمانے کے اختتام کے قریب، پادری سینٹ میلیٹو نے ایک تفہیم نامہ مارکس آریلیس کی خدمت مین بھیجا تھا، اس مین یہ صاف مندرج تھا، کہ ایشیا مین مسیحیون پر کبھی تعدی روا نہین رکھی گئی، اور اب یہ ایک بالکل انوکھی بدعت ہے، بلکہ اس کے قبل تمام سلاطین، بجز نیرو و ڈومیشین کے، ہمیشہ مسیحیون کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے رہے ہین۔ اس کے ۲۰ سال، یا کچھ زاید کے بعد کا مسیحی مصنف ٹرٹولین اس سے بھی زیادہ تصریح و قطعیت کے ساتھ کہتا ہے، کہ نیرو و ڈومیشین صرف دو مسیحی سلاطین ایسے ہوئے ہین جنھون نے گرجا پر تعدی کی ہے، بلکہ یہ مصنف تو ایک غلط فہمی کی بنا پر مارکس آریلیس کو محافظین مسیحیت کے طبقے مین شمار کرتا ہے۔ اس کے ایک صدی کے بعد لیکٹینٹیس اس باب مین جو شہادت دیتا ہے، وہ اور زیادہ قابل توجہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ڈومیشین کے جانشین، تعدی و تشدد سے محترز رہے، اور ڈومیشین کے بعد پھر اگر کوئی تعدی کرنے والا حکمران پیدا ہوا، تو وہ ڈسیس تھا۔ اس سلسلہ مین اس کے اصل الفاظ لایق ملاحظہ ہین۔ لکھتا ہے، کہ

"ڈومیشین کی وفات پر اُس کے احکام منسوخ ہو گئے، اور گرجا نہ صرف اپنی قدیم حالت پر عود کر آیا، بلکہ اُس کو زیادہ قوت و عظمت حاصل ہو گئی۔ اب نیک سلاطین کا دور دورہ شروع ہوا، جن کے عہد مین گرجا کو کسی مخالفت کا مقابلہ نہین کرنا پڑا، بلکہ اُس کے ڈانڈے مشرق سے لیکر مغرب تک وسیع ہو گئے۔ مگر ایک عرصہ کے بعد اس حالت نے بھی پلٹا کھایا، اور بالآخر وہ حیوان صفت و شقی القلب ڈسیس پیدا ہوا، جس نے پھر گرجا کو ستانا شروع کیا۔"

الغرض اس بارہ مین تین مختلف بیانات ہین۔ ان مین سے پہلے دو کا صاف منشا یہ ہے

کہ ۳۸ سال تک مسیحیون پر کسی قسم کا تشدد نہین ہوا، اور وہ غایت امن وسکون سے رہے، بلکہ اگر آخری بیان کو بھی صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو یہ مدت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لیکن یہ مدت امن کی سطح بالکل ہموار نہین رہی تھی، بلکہ اس مین وقتاً فوقتاً رخنے پڑتے رہتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ مسیحیت جس کی حیثیت شروع شروع یہودیت کی ایک شاخ سے زیادہ کی نہ تھی، اسی زمانے سے رفتہ رفتہ بطور ایک علیحدہ و مستقل مذہب کے تسلیم کی جانے لگی۔ مگر رومی قانون کے بموجب انھین مذاہب کے ساتھ رواداری کا برتاؤ جائز تھا، جن کا وجود قانون کی نگاہ مین باضابطہ مسلّم ہو چکا تھا۔ اب یہ درمیانی زمانہ جو مسیحیت پر گزرا، یعنی ایک طرف تو وہ یہودیت کی شاخ بھی نہین رہی، اور دوسری طرف ابھی اُس کا علیحدہ باضابطہ وجود قانون کے نزدیک غیر مسلّم تھا، یہ ایک ایسا دور تھا، جس مین اُس کے ساتھ حکومت کا کوئی خاص طرز عمل متعین نہ تھا۔ مختلف صوبوں کے گورنر اپنی اپنی مرضی کے موافق کام کرتے۔ چنانچہ اس زمانے مین بارہا ایسا ہوتا رہتا، کہ ایک صوبے مین تو مسیحیون کو پوری آزادی حاصل ہے، مگر اُس کے ملحق دوسرے صوبہ مین وہ تعدی وتشدد کے شکار ہو رہے ہین۔

اس موقع پر یہین یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے، کہ مسیحیون پر جو تعدی ہوتی تھی وہ دو بالکل مختلف راستون سے ہوتی تھی۔ ایک تو حکومت کی طرف سے، اور دوسرے خود بت پرست رعایا کی طرف سے۔ ہم پیچھے کہین بتا آئے ہین، کہ مسیحی خود رعایا کے طبقون مین بھی مقبول نہ تھے، بلکہ سخت مبغوض تھے، اور اس کے اسباب بھی بتا چکے ہین۔ چنانچہ عہد زیر نظر مین بار بار اس طرح کے شواہد ملتے ہین، کہ رعایا، عیسائیون پر زیادتی کرنا چاہتی ہے، مگر حکومت روکتی ہے۔ نروا کے مختصر عہد حکومت مین تو کسی تعدی کی شہادت موجود نہین، اور اس زمانے مین حکومت اور مسیحیون کے تعلقات کا

پتہ صرف ایک بت پرست مورخ کے ان دو ضمنی فقرون سے چلتا ہی کہ

"بادشاہ نے اُن تمام قیدیون کو آزاد کردیا جو بیدینی کے الزام مین اسیر تھے"

"بادشاہ نے حکم دیا، کہ بیدینی، یا یہودیت اختیار کرنے کے جرم مین کسی کو سزا نہ دی جائے"

اس کے بعد ٹریجن تخت نشین ہوا، اس کے زمانے مین چند مقامی فسادات ہوئے یہ بادشاہ نہایت رحمدل اور نہایت دانشمند ہوا ہی، مگر یہ اپنی رعایا مین انجمن سازی اور گروہ بندی سے نہایت خائف رہا کرتا تھا، چنانچہ عیسائیون پر اس نے جو کچھ دار و گیر کی، اسی حیثیت سے کی۔ اس کے زمانے مین، روایت ہی کہ متعدد صوبون مین بلوے و فسادات ہوئے، اور اُن کی تادیب و تعزیر کے لیے عیسائیون پر بھی تعدی ہوئی۔ صوبہ بتھینیا کا گورنر پلینی تھا۔ اس نے اس کے نام ایک بڑا اسا مراسلہ تحریر کیا، جو خاص اہمیت رکھتا ہی۔ اس مین وہ کہتا ہی، کہ "مین نہین جانتا کہ عیسائیون کے مقابلہ مین اب کیا کارروائی کرنا چاہیے" درانحالیکہ اُن کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہی، کہ وہ بڑے بڑے گروہون مین عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہین اور لوگون نے اس کثرت سے مسیحیت کو قبول کرلیا ہی، کہ بتکدون مین سناٹا سا ہونے لگا ہی۔ مین نے اُن ملزمون کو رہا کردیا ہی، جنھون نے جہان پناہ کے مجسمہ کے آگے خوشبوئین سلگانے، اور مسیح پر تبرا کہنے کا اقرار کیا، مگر اُن مجرمون کو قتل کرڈالا، جو اپنی ہٹ پر برابر قایم رہے، کیونکہ میرے نزدیک ایسے لوگون کو رومی رعایا ہرگز نہ کہنا چاہیے، اور ضد اور ہٹ کی پوری سختی سے سزا دینا چاہیے۔ مین نے ملزمون سے اُن کے مذہب و اعتقاد کی نوعیت سے متعلق سوالات کیے، بلکہ دو لونڈیون کو شکنجہ مین کس کر جوابات حاصل کیے، لیکن مجھے ان کے مذہب مین سوا ایک لغو

ومزخرف باطل پرستی کے اور کچھ نہین نظر آیا۔ مین نے ان سے ان کی خفیہ انجمنون اور پُراسرار نمازون کی بابت بھی دریافت کیا معلوم یہ ہوا کہ یہ لوگ ہفتہ مین ایک مخصوص دن پر طلوع آفتاب سے قبل مجتمع ہو کر مسیح کی حمد مین راگ گاتے ہین، معاصی سے ترک واجتناب کی قسمین کھاتے ہین، اور پھر متفرق ہونے سے قبل معمولی ضیافت مین شریک ہوتے ہین، لیکن اب نئے قوانین کے نفاذ کے بعد سے انھون نے یہ دستور بھی اُٹھا دیا ہے۔ اس مراسلہ کے جواب مین ٹریجن نے یہ حکم صادر کیا کہ مسیحی جس وقت عدالت کے سامنے آجائین، تب انھین سزا دینی چاہیے لیکن اس کے لیے انھین خاص طور پر تلاش کرنے کی ضرورت نہین؛ اور اگر وہ قربانیان کرنے پر راضی ہو جائین، تو ان کی گذشتہ زندگی پر احتساب و بازپرس کی حاجت نہین، نیز یہ کہ ان کے خلاف جو گمنام شکایات آتی ہین، ان پر توجہ نہ کرنا چاہیے۔ اس عہد مین دو مسیحی شہادتون کی مستند روایات ملتی ہین۔ ایک شیمین، یروشلیم کے پادری کی، جس کا سن ۱۲۰ سال کا بیان کیا جاتا ہے، اور جو کئی دن کے عذاب جھیلنے کے بعد سولی پر چڑھا دیا گیا۔ دوسرے انطیوخ کے پادری اگنیشیس کی، جو گرفتار کر کے روم لایا گیا، اور یہان خود بادشاہ کے حکم سے جنگلی درندون کے آگے چھوڑ دیا گیا۔ یہ آخری قتل بے شبہ بیحد وحشیانہ تھا، گو ہمین اس کے اصلی سبب کی اطلاع نہین، تاہم دو باتین معلوم ہوتی ہین، ایک تو یہ کہ یہ پادری صاحب خود بھی نہایت پُرجوش واقع ہوئے تھے، اور شہادت کے مشتاق رہا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ اُسی زمانے مین انطیوخ مین ایک ہیبتناک زلزلہ آیا تھا، اور ایسے موقع پر مشرکون کا جوش غضب عیسائیون کے خلاف قدرۃً ہیجان مین آجاتا تھا۔ اس پادری کے خطوط جو محفوظ رہ گئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روم مین مسیحیت کی علانیہ اور آزادانہ تلقین ہوتی تھی، اور حکومت کی طرف سے ٹریجن کی

۱۹ سالہ مدت حکمرانی مین کبھی عیسائیون پر کسی بڑے پیمانے پر دار و گیر نہین ہوئی
چھوٹے چھوٹے چند روزہ بلوون اور فسادات کا ذکر نہین۔

اس کے بعد دو تاجدارون کے عہد مین حکومت کا طرز عمل مسیحیون کے ساتھ یقیناً زیادہ موافقانہ رہا۔ ہیڈرین کو جب یہ خبر معلوم ہوئی، کہ مختلف جلسون تماشون مین لوگ مسیحیون کے خلاف شور و غل کرتے ہین، اور اس شور و غل سے متاثر ہو کر حکام انھین قتل کروا دیتے ہین، تو اس نے یہ فرمان جاری کر دیا، کہ کسی شخص کو بغیر باضابطہ عدالتی چارہ جوئی کے محض عوام کے شور و شغب پر کبھی سزا نہ دینا چاہیے، بلکہ جو لوگ الزامات لگانے مین پیش پیش رہتے ہین، اگر وہ [illegible] کو ثابت نہ کر سکین، تو انھین البتہ سزا ملنی چاہیے۔ اس فرمان روا کا برتاؤ در حقیقت مسیحیون کے ساتھ اس قدر دوستانہ تھا، کہ لوگون نے مبالغہ کر کے یہ افواہ مشہور کر دی، کہ اس کا ارادہ ہے کہ مسیح کو رومی دیوتاؤن کی فہرست مین شامل کر لے۔ خیر یہ تو نری گپ تھی، لیکن اس مین شک نہین، کہ یہ عیسائیون کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا، جس سے ایک آزاد خیال رومی کو دیکھنا چاہیے ایک خط بھی اس کے جانب منسوب کیا جاتا ہے، جس مین اس نے مسیحیت کو مصری مذہب سمجھا ہے۔ اس کے عہد مین حکومت کی طرف سے مسیحیون کو پوری آزادی حاصل رہی، البتہ اکثر یہودی مفسدون و بلوائیون نے انھین سخت سخت تکالیف پہونچائین، یہودیون نے اس کے زمانے مین ایک آخری اور سخت مگر لاحاصل کوشش، خود مختار ہو جانے کی کی تھی، اور اسی اکثر ان سے اور مسیحیون سے آویزش ہو جاتی تھی۔ اس آویزش کا ایک اثر یہ ہوا کہ بت پرست ان دونون مذہبون کو ایک دوسرے سے علیحدہ و ممتاز سمجھنے لگے۔ چنانچہ خود ہیڈرین نے یہودیون کو یروشلیم مین داخل ہونے کی قطعاً ممانعت کر دی، درانحالیکہ مسیحیون کے لیے اس کی

پوری آزادی رکھی۔

ہیڈرین کی وفات پر انٹونینس اورنگ نشین ہوا۔ اُس نے اور زیادہ کوشش کی، کہ مسیحیون کے خلاف اُس کی رعایا کا جوش و تعصب کم ہو۔ اس نے یہ فرمان جاری کر دیا، کہ کوئی کسی مسیحی سے ہرگز تعرض نہ کرے، بلکہ جب ایشیاے کوچک مین ایک سخت زلزلہ کے آنے پر رعایا مین عیسائیون کی طرف سے زیادہ شورش پھیلی، تو اس نے صاف اعلان کر دیا، کہ ان شورش کرنے والون کو سزا دی جائے کی غرض رعایا کی ان معمولی شورشون کو مستثنٰی کر دینے کے بعد اس کی ۲۳ سالہ مدت حکمرانی مین ایک مرتبہ بھی عیسائیون کے معاملات مین دست اندازی نہین کی گئی، بلکہ یہ سارا زمانہ کامل امن و چین سے گزرا۔ اور یہ عام سکون اس کے جانشین مارکس آرلیس کے عہد مین بھی ایک مدت تک قائم رہا، لیکن بالآخر تعزیری احکام جاری ہوئے۔ ان کے اجرا کے اور ایسے فرمان روا کے حکم سے جس سے زیادہ رحمدل و معدلت شعار پردۂ زمین پر کوئی تاجدار نہین گزرا ہے، اسباب و علل کے متعلق افسوس ہے کہ ہمارے معلومات کچھ مدد نہین پہونچا سکتے۔ تاہم اس قدر بالکل یقینی ہے، کہ اس کا محرک نہ کوئی مذہبی عصبیت تھی اور نہ خلقی بدمزاجی غضب ناکی و تندمزاجی کا ایسے شخص کی جانب کیونکر انتساب کیا جا سکتا ہے، جس کا خمیر حلم، تحمل، رافت و رحم سے ہوا تھا، جس کے اخلاق مین اگر کوئی عیب تھا تو یہی تھا کہ وہ بیموقع بھی عفو و درگزر کو کام مین لاتا تھا، اور جس نے اپنی محبوب ملکہ کے انتقال پر سینیٹ سے بکمال حزن مین صرف یہ التجا کی کہ جن لوگون نے اس کے خلاف بغاوت کی تھی، انھین رہا کر دیا جائے! اسی طرح مذہبی عصبیت کو اُس شخص کی طرف منسوب کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے، جس نے فلسفۂ رواقیت کو اپنا دین و ایمان بنا رکھا تھا، جو تمام تر اُس کے احکام پر عامل تھا۔

اور جس نے مدارس اور کالجون مین اپنے شدید ترین مخالف حکماء کو تنخواہین و دیگر مقرر کیا تھا۔ غرض اسی طرح کے اسباب تو مارکس آریلیس کے ان تعزیری احکام کے محرک ہو نہین سکتے۔ بلکہ ہمارے سمجھ مین جو وجہ آتی ہی، وہ یہ ہی، کہ اس وقت گرجا نے حکومت کے مقابلہ مین سیاسی نقطۂ نظر سے ایک بالکل رقیبانہ حیثیت پیدا کرلی تھی، حکومت جس طرح کی قومیت رعایا مین پیدا کرنی چاہتی تھی گرجا اُس کے بالکل مخالف راستے پر لے جانا چاہتا، اور طرزِ حکومت تخیلات و مشاعر، معتقدات و آمال، غرض ہر شے مین قوم کی عام شاہراہ کے بالکل مخالف مسیحیون نے اپنا راستہ اختیار کیا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ مسیحیون پر مردم خواری، شہوت پرستی، و زناکاری کے جو الزامات لگائے جاتے تھے اب ان مین بھی واقعیت کی جھلک آنے لگی، بلکہ ایک خاص فرقہ نے تو ان الزامات کو اپنے طرزِ عمل سے ایک حد تک ثابت ہی کر دکھایا۔ ایک طرف تو یہ سارا مواد جمع ہو رہا تھا، دوسری طرف مارکس آرلیس کی روا قیت عیسائیون کی جھاڑ پھونک، اور حیات اخروی کی تخویف کی تاب نہین لاسکتی تھی، اب عیسائیون کے خلاف کارروائی شروع ہونے مین جو کچھ رہی سہی کسر رہ گئی تھی وہ یون پوری ہوگئی کہ شاہ کے گرد جن حکماء کا مجمع رہتا تھا، وہ مسیحیت کے سخت دشمن تھے۔ مثلاً شاہ کے اُستاد و عزیز دوست فرونٹو کا اس نے مسیحیت کے رد مین ایک کتاب لکھی تھی، یا کرسیفس کلبی کہ اُسی کے جوڑ توڑ نے جسٹن مارٹر کی جان لی۔ ان اسباب کا اجتماع پھر سے مزید بہت مارکس آرلیس کے قلم سے تعزیری احکام کے اجراء کے مسئلہ کو حل کر دیتا ہی، پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ اُسکے عہد مین مسیحیون پر جو بھی سیہ روزیان نفاذ کیا گئین ہوئین، ان کی ذمہ داری بادشاہ پر نہین بلکہ رعایا کے جوش، اور دور دراز صوبون کے گورنرون کے تعصب پر ہی۔ اگر یہ سختیان شاہ کے اشارے سے ہوتین، تو یہ ناممکن تھا

کہ ٹرٹولین، جس نے ان واقعات کے ۲۰ ہی سال کے بعد کتاب لکھی، انھیں نظرانداز کر کے مارکس آریلیس کو محافظین وحامیان مسیحیت کے طبقے مین شمار کرنے لگتا۔

لیکن بہر حال، اسباب کچھ بھی ہون، اس حقیقت پر پردہ نہین ڈالا جا سکتا کہ کہ مارکس کے عہد حکومت کے دامن پر گرجا کے پہلے فلسفی جسٹن مارٹیر کے خون کا داغ ہے، اور تعدی کے نظائر بہ کثرت ملتے ہین۔ تعدیون کا سلسلہ اسمرنا و لیانس جیسے دور دراز مقامات تک پھیلا ہوا تھا، اور اشتداد مین ان کا نمبر نیرو کی سفاکیون سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ مگر ظالمون کی انھین سختیون کے مساوی صبر و استقلال، ایثار و جانبازی کا اظہار مظلومون کی طرف سے بھی ہوتا تھا اسمرنا کی تعدیان، جن مین سینٹ پولی کریپ اور اُس کے کثیر التعداد رفقا نے جان دی، عام کھیل تماشون سے شروع ہوئین، اور اُن کے تہ مین یہودیون کا اشتعال انگیز ہاتھ صاف کام کرتا نظر آتا ہے۔ لیانس کی تعدیان، جو شدت بیرحمی کے لحاظ سے اپنی نظیرین بہت کم رکھتی ہین، عوام کے جوش غضب اور گورنر کی چشم پوشی کا مشترک نتیجہ تھین اس موقع پر مسیحیون کے بعض ملازمون نے خوف عقوبت سے دہشت کھا کر اُن تمام الزامات کو اپنے آقاؤن کے نامۂ اعمال مین لکھ دیا، جو افواہ عام مین اُن کی جانب منسوب کیے جاتے تھے، مثلاً مردم خواری، اولاد کشی، محرمات ابدیہ سے زناکاری نفرت انگیز بدچلنی، وغیرہ۔ اس پر عوام کی آتش غضب نہایت زور شور سے بھڑکی۔ تعذیب و عقوبت کی وہ وہ صورتین، جن کے ذکر سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہین، کبیرالسن مردون، اور ضعیف الجثہ عورتون پر برابر استعمال کی جاتی تھین اور مظلومون کی جانب سے استقلال و پامردی کے وہ نمونے پیش ہوتے تھے، جو آج تک دنیا کے لیے باعث حیرت ہین۔ چنانچہ فرانسیسی گرجا کی تاریخ کا پہلا صفحہ انھین مین سے دو شہیدون بلینڈینا و پوتھینس نے خون کے حروف سے لکھا ہے لیکن باینہمہ مین آخرین

یہ اعتراف کرنا چاہیے، کہ گو مارکس آریلیس کے آخری زمانے مین تین چار صوبون مین شدید تعدیون کا سلسلہ جاری رہا، تاہم سارے ملک مین مسیحیت کو بہ جبر دبانے کی کبھی کوئی باقاعدہ مسلسل و مستقل کوشش نہین کی گئی۔

تیسرا دور سنہ ۱۸۰ع مین مارکس آریلیس کی وفات سے سنہ ۲۴۹ع مین ڈیسیس کی اورنگ نشینی تک رہتا ہے۔ اس ساری مدت کو ہم ایک دور قرار دے سکتے ہین۔ اس سارے دور مین مسیحیت کی قوت و طاقت بڑھتی رہی، اور اس کے بڑے حصہ مین مسیحی اعلیٰ سے اعلیٰ ملکی و جنگی عہدون پر ممتاز رہے۔ اب ان کی مخالفت جو کچھ ہوتی تھی، وہ سیاسی حیثیت سے ہوتی تھی، اور اسی حیثیت کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی تھی۔ اس زمانے کے حکمرانون کے آگے درحقیقت یہ ایک نہایت دشوار مسئلہ پیش ہوتا تھا، کہ ایک زبردست و روز افزون منتظم جماعت کو، جو رومی نظام حکومت سے بالکل الگ تھلگ رہتی تھی، کیونکر قابو مین رکھا جائے؟ بعض سلاطین، مثلاً کموڈس و ہیلیوگیبولس، تو اپنی عیش پرستیون سے ادھر متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہین ہوتی تھی، لیکن دانشمند و رعایا پرور حکمران، یا تو مثل مارکس اریلیس و ڈائیوکلیٹین کے اس جدید مذہب کو بہ زور دباتے تھے، اور یا مثل اسکندر سویرس و قسطنطین کے اسکی ترقی و حمایت مین کوشش کرتے تھے۔ مارکس آریلیس نے جو تعزیری قوانین نافذ کیے تھے، انھین کموڈس نے منسوخ کر دیا، اور یہ امر قابل لحاظ ہے کہ یہ نرمی اسکی معشوقہ مارسیا کے اثر سے ہوئی، حالانکہ عورتون کا اثر بالعموم تعدیون کے پھیلانے و ترقی دینے مین صرف ہوا ہے (اسپیلا، کیتھرائن، و ملکہ میری کے نام کیسے فراموش ہو سکتے ہین) اگرچہ اس عہد مین بھی ایک مسیحی فلاسفر اپولونیس کا قتل ہوا ہے۔ اس استثنائی واقعہ کے علاوہ اس ۶۹ سال کی مدت مین صرف دو موقعون پر اور کہ جا کے امن مین دست اندازی کی گئی

ایک تو شاہ سپٹمیس سورس کے عہد مین، جو شروع شروع عیسائیون کے
بہت موافق تھا، مگر جس نے سنہ ٢٠٢ یا سنہ ٢٠٣ء مین یہ حکم جاری کر دیا، کہ کوئی بت پرست
عیسوی یا موسوی مذہب نہ قبول کرے۔ اس فرمان کے بعد ہی افریقہ و
شام مین عیسائیون پر سخت خونریز تعدی شروع ہوئی، جس مین آریجن، سینٹ فیلی سٹیس،
و سینٹ پرپیٹوا کی جانین گئین۔ مگر یہ تعدی مشرق مین محدود رہی مغرب تک
نہین پھیلی، اور اسکی کارروائیون کی ذمہ داری زیادہ تر صوبے کے گورنرون
پر ہے، جنھون نے شاہی فرمان سے عام عیسائیون کی مخالفت کے معنے لیے،
حالانکہ اُس کا محض اس قدر تھا، کہ نئے لوگون کو مسیحیت قبول کرنے سے روکے۔
اس سلسلہ مین آریجن کے اس قول کو بھی یاد رکھنا چاہیے، کہ وہ اُس زمانے سے
بیشتر مسیحی شہدا کی تعداد بہت ہی قلیل تھی۔ پہلی تعدی یہ تھی۔ دوسری میکزیمنس کے
ہاتھون شاہ اسکندر سورس کے قتل کے وقت سے شروع ہوتی ہے، قاتل نے مقتول
کے ارکان دربار پر سخت تعدی شروع کی، جن مین اکثر عیسائی پادری تھے اسی زمانے مین
اتفاق سے بعض مہیب زلزلے بھی آئے، اور انھون نے حسب معمول مسیحیون کے
خلاف رعایا کے جذبات کو خوب برانگیختہ کر دیا۔ بس ان دو تعدیون کے سوا اور
کبھی اس سارے دور مین عیسائیون پر کسی قسم کا تشدد نہین ہوا، سلاطین کیرکلا،
میکرینس، و ہیلیوگیبلس نے ان کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہین کی، اور
شاہ اسکندر سورس نے تو علانیہ ان کی حمایت و تائید شروع کر دی۔ اُس کے
رجحان طبیعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے مسیح کے اس
قول کو اپنے قصر اور تمام عمارات سرکاری پر کندہ کرا دیا تھا کہ ”دوسرون کے
ساتھ اسی طرح پیش آؤ جس طرح تم ان سے اپنے ساتھ پیش آنے کی توقع
رکھتے ہو۔“ ایک مرتبہ کسی زمین سے متعلق عیسائیون اور غیر عیسائیون مین

جھگڑا ہوا، اس نے فیصلہ عیسائیون کے حق مین کیا، اس بنا پر کہ انھین معبد بنانا ہے، اور معبد کا حق عام عبارات پر راجح ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنے نجی کے معبد مین مسیح، ابراہیم و دیگر اعیان مسیحیت کی پرستش کرتا تھا، اور یہ قول ایک بُت پرست مورخ کے، مسیح کے لیے عام معابد تعمیر کرانے کا قصد رکھتا تھا۔ اس کے بعد فلپ، پانچ سال تک مسند آرائے جہانبانی رہا۔ اس کے زیر حکومت تو عیسائیون کو وہ آزادیان اور سہولتین نصیب ہوئین کہ بہت سے لوگ اسے دل سے عیسائی خیال کرنے لگے۔

اب ہم تیسرے دور کا بھی تبصرہ کر چکے، جو ۲۴۹ء مین یا گویا رومہ مین مسیحیت کے داخلہ کے ۲۰۰ سال پر ختم ہوتا ہے۔ یہان تک ہمین اپنی تلاش و تفتیش مین جو کچھ معلومات حاصل ہوئے، ان کے نتائج کو دفعات ذیل کی صورت مین رکھ سکتے ہین۔

(۱) اس دو صد سالہ مدت مین بے شبہ وقتاً فوقتاً عیسائیون پر سخت مظالم ہوئے، لیکن نیرو کے عہد حکومت کو کسی قدر مستثنیٰ کرنے کے بعد کبھی سارے ملک مین مسیحیت کو دبانے کی باقاعدہ و مسلسل کوشش نہین ہوئی، مارکس آرلیس کے عہد مین اسمرنا و لیانس کے صوبون مین اور سیورس کے عہد مین افریقہ و ایشیا کے صوبون مین، تعدیان ہوئین، اور ان کے علاوہ کبھی کبھی زلزلہ، سیلاب، یا اور کسی اتفاقی سبب سے خود بت پرست رعایا کی طرف سے دست درازیان ہوتی رہین، لیکن ویسی باضابطہ، مسلسل و مستقل کوشش مسیحیت کے خلاف کبھی نہین ہوئی، جیسی آگے چل کر خود عیسائیون نے اپنے مخالفین کے مقابلے کے لیے اختیار کی، رومی حکومت مین قسیہا پشت ایسی گزر جاتی تھین جو تعدی و تشدد کے نام سے بھی نہین آشنا ہوتی تھین۔ گال و ایشیائے کوچک مین مارکس آرلیس کے وقت تک ایک شخص بھی شہید نہین کیا گیا۔ اور خود اٹلی مین،

نیرو کی وفات کے بعد مسیحی شہیدوں کا شمار چند سے بڑھنے نہین پایا۔

(۲) پادری خصوصیت کے ساتھ مظالم کے ہدف تھے، لیکن رسولون کے زمانے کے بعد اُن کا قتل بھی شاذ و نادر ہو گیا۔

(۳) مسیحیت اگر باضابطہ بہ طور ایک مستقل مذہب کے تسلیم نہین کی گئی تو اس کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت بھی نہین برتی گئی، بلکہ اکثر حالتون مین اعلی ملکی و جنگی عہدون مین عیسائیون کے لیے کبھی روک تھام نہین ہوئی۔

(۴) سلاطین کی تعداد غالب، یا تو مسیحیت کے صریحًا موافق رہی، اور یا غیر متعلق و ساکت رہی۔

(۵) مشرکانہ مذہب کا خود اپنے حلقون مین برائے نام اثر تھا، اور اسلیے ڈایوکلیشین کے زمانے سے پہلے اُن کا کوئی حصہ عیسائیون پر تعدی مین نہین رہا۔

(۶) یہ عقیدہ، بجز یہود کے، اور کسی جماعت کا نہ تھا، کہ ہر خطاے اعتقادی لایق تعزیر ہے۔ اس لیے جس نقطۂ خیال سے مسیحیون نے بعد کو دوسرون پر تعدی کی، اُسکے لحاظ سے خود اُن پر تعدی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ بت پرستون کا بے شبہہ یہ اعتقاد تھا، کہ ملک پر آفات اسیے دیوتاؤن کی پرستش نہ کرنے سے آتی ہین، لیکن اس کے باعث عملًا شورشین نادر الوقوع ہوتی تھین۔

(۷) مسیحیون نے اپنے اقتدار کے زمانے مین جو تعدیان کین، ان کے وسائل مختلف تھے، مثلًا بچون کی تعلیم و تربیت انھون نے اپنے ہاتھ مین لے لی، مخالفین کی کتابون کو ممنوع الاشاعت قرار دیدیا، اور پولیس کے ذریعہ سے مخالفین کی زندگی کے جزئیات تک کو احتساب کے شکنجے مین جکڑ دیا۔ مگر رومیون کے زمانے مین یہ چیزین کبھی نہین اختیار کی گئین، اور نہ اُن کا اختیار کرنا اُس وقت ممکن تھا۔ اُس زمانے مین فوج تو تقریبًا ساری کی ساری سرحد پر رہا کرتی تھی،

اور پولس کے سپاہیوں کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا تھا۔ تعلیم و تربیت کا حکومت سے کوئی واسطہ نہ تھا، اس باب میں والدین کو پوری آزادی حاصل تھی۔ کتابوں کی اشاعت کو بھی کبھی کسی نے نہیں روکا، بجز اس کے کہ ایک بار آگسٹس نے جعلی پیشینگوئیوں کی چند جلدیں جلوا دیں، اور دو ایک بار اور اسی طرح کے استثنائی واقعات پیش آ گئے۔

(۸) غرض یہ کہ بہ حیثیت مجموعی، گرجا کو ایسی سوسائٹی کے درمیان تبلیغ و اشاعت کا موقع ملا جس میں رواداری کا اصول عام تھا، اور جس کے حکمرانوں کو کسی مذہب سے کوئی خاص پرخاش یا مخالفت نہ تھی۔

ان حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد، جو تیسری صدی کے وسط تک قائم رہے، یہ ادعا کس قدر مہمل و مضحک معلوم ہونے لگتا ہے کہ "شدید ترین تعدیوں کے علی الرغم مسیحیت کا اپنے وجود کو برقرار رکھنا صاف اس امر کی دلیل ہے کہ تائید غیبی و نصرت الٰہی اس کے ساتھ تھی"، اخیر تعدیوں کی جو حقیقت تھی، وہ تو اوپر گزر چکی، لیکن مان لیجیے، کہ وہ جس قدر مبالغہ کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں، اُسی قدر درست سہی، تو بھی مسیحی حضرات، تخویف و ترغیب، دونوں کے اُن وسائل کو کیوں نظر انداز کیے جاتے ہیں، جو اُن کے پاس موجود تھے جن سے وہ کام لیتے تھے، اور جن کے بل پر وہ بڑی سی بڑی مخالفتوں کا بھی مقابلہ کر سکتے تھے، اور اپنی تعداد میں برابر اضافہ کرتے رہ سکتے تھے اور یہ ایک واقعہ ہے کہ اُن کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی تھی جس کا خود اُس زمانے کے مصنفین کو کھلے لفظوں میں اعتراف ہے مثلاً جسٹن مارٹر کہتا ہے کہ

"دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں، خواہ متمدن ہو یا وحشی جس میں مسیح کے نام پر جان دینے والے موجود نہ ہوں"

ٹرٹولین کے الفاظ رومیون کو مخاطب کر کے یہ ہیں:-

"ہم لوگ ابھی کل عالم وجود مین آئے ہین لیکن آج دیکھو تو تمہارے شہر و قریے، بحر و بر، قلعے و جزیرے، عدالتین، دربار، پلیٹ و قصر شاہی، غرض سب ہم ہی سے بھرے ہوئے ہین"

یوسیبیس نے شہر روم کے پادری کورنیلیس کا ایک خط محفوظ رکھا ہے جس مین روم کے گرجا کے اُن عہدہ دارون کی فہرست مندرج ہے، جو ڈیسیس کی تعدی کے وقت موجود تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب ملا کر ۱۵۵ عہدہ دار تھے، اور گرجا کی طرف سے ۱۵۰۰ بیواؤن اور محتاجون کی پرورش ہوتی تھی۔

ڈیسیس کی تعدیون کا آغاز ۲۵۰ء سے ہوتا ہے۔ ان کا مقصد غالباً یہ تھا، کہ ملک سے غیر ملکی عناصر کو خارج کر کے بت پرستی و قومیت کی قدیم روح پھر پیدا کی جائے۔ یہ تعدی پہلی باقاعدہ و مستقل کوشش اس امر کی تھی کہ سارے ملک سے مسیحیت کی بیخ کنی کر دی جائے۔ اس تعدی کے ذیل مین جو انسانیت سوز کارروائیان ہوئین، اور جس درندگی و بہیمیت کا اظہار کیا گیا، اس کے بیان کے لیے ہمارے پاس الفاظ کافی نہین۔ مختصر یہ کہ عوام کے غضب و انتقام کے جذبات مدت سے دبے ہوئے تھے، وہ اب ایکبارگی انتہائی قوت کے ساتھ اُبل پڑے، اور حکام نے اپنی اعانت کے دامن سے ہوا دیکر اس آگ کو اور تیز کر دیا۔ اس تعدی مین شقاوت کے اعلیٰ مظہر وہ قتل نہین تھے، جو بیدریغ مسیحیون کے ہوتے جاتے تھے، بلکہ وہ ہولناک طریقہ تعذیب کے تھے جن سے مسیحیون کو ارتداد پر مجبور کیا جاتا تھا، اور کنواری لڑکیون کو جس طرح عذاب دیا جاتا تھا، اس کا تو ذکر بھی ہمارے لیے ناممکن ہے۔ بلکہ قتل سے زیادہ یہ ظالم تعذیب و عقوبت ہی پر زور دیتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسیحیون کو فوراً قتل کر ڈالنا ان کے

عقیدے کے مطابق اُن پر احسان کرتا یعنی درجۂ شہادت دلاتا ہو اس واسطے
وہ اُن کی جان لے لیتے تھے مگر ترسا ترسا کر اور طرح طرح کے روح فرسا عذابوں میں مبتلا
کر کے زندہ رکھتے تھے یہ طرز عمل تو حکام کا تھا اور مسیحیوں کا یہ حال تھا کہ مدت
سے امن و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے اُن میں ایک طرح کی نازدہی آگئی تھی
اور اعتقاد کی وہ قوت و پختگی نہیں باقی رہ گئی تھی جو شروع شروع میں اُن کا خاصہ
تھی۔ اکثر لوگ اب عیسائی تھے اور وہ محض اس بنا پر عیسائی تھے کہ وہ عیسائی والدین کے
گھر میں پیدا ہوئے تھے، اُن کے امراء عیش پرستیوں میں پڑے رہتے تھے
اور پادریوں تک میں حب جاہ کا مرض پھیل گیا تھا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاً
ہزاروں عیسائی مرتد ہو گئے۔ سختی کی کارروائیاں جوں ہی شروع ہوئیں ہزاروں
نے حکام کے سامنے آ کر اپنی بت پرستی کا اعلان شروع کر دیا۔ بڑے بڑے
گرجاؤں میں ایک ہلچل سا مچ گیا اور ہر طرف شرک و ارتداد کی گرم بازاری ہو گئی
ان مناظر کو دیکھ کر مشرکین تالیاں بجانے کے ساتھ قہقہے لگاتے تھے اور راسخ الاعتقاد
پادری دانت پیس پیس کر رہ جاتے تھے۔ یہ عام حالت تھی، ورنہ اس میں بھی
مستثنیات ہوتے تھے۔ بعض بعض ضعیف العمر مسیحیوں نے اس موقع پر اپنے ایمان کی
پختگی و عدم تزلزل کا ایسا قطعی ثبوت دیا جس پر آج بھی سب کو حیرت ہوتی ہے۔
یہ تعدی البتہ بحیثیت مجموعی ایسی تھی جو مسیحیت کو فنا کر دینے کے لیے کافی ہو سکتی تھی
اگر یہ زیادہ عرصے تک جاری رہتی یا پیشتر شروع ہوئی ہوتی، تو یقیناً اس کا نتیجہ
یہی ہوا ہوتا اور آج مسیح کا نام لینے والا روئے زمین پر ایک شخص بھی نہ دکھائی
دیتا لیکن اس نے صرف دو سال کی زندگی پائی اور ہوئی ایسے زمانے میں کہ اس کا
مذہب پورے دو سو سال سے زائد کی عمر حاصل کر چکا تھا۔ ایسے قدیم مذہب کو اتنی
تھوڑی مدت میں مٹا دینا ممکن نہ تھا۔

اس تعدی کے مدارج اشتداد، مختلف صوبون مین مختلف تھے کہین انتہائی
گرمجوشی تھی، اور کہین معمولی۔ اسکندریہ اور اس کے مضافات مین یہ پورے شباب
پر تھی۔ قرطاجنہ مین اول اول کسی کو سزاے موت نہین دی گئی، بلکہ صرف قید و
جلاوطنی پر اکتفا کیا گیا۔ لیکن جب حاکم اعلیٰ دیرو کا لشل آگیا، تو قتل اور دیگر ہولناک
عذابون کی سزائین جاری ہو گئین۔ لوگون کو پادری سینٹ سپرین کے خلاف سخت
برہمی تھی۔ انھون نے بڑی مصلحت اندیشی سے کام لیا کہ شورش کے زمانے بھر روپوش
رہے۔ اس تعدی کا مقصد اصلی عیسائیون کو قتل کرنا نہین، بلکہ انھین ارتداد پر
مجبور کرنا تھا، اسی کے واسطے طرح طرح کے ہولناک عذاب ایجاد کیے گئے تھے
اور جب یہ سب عذاب بے سود ثابت ہوتے تھے، تو بہت قیدیون کو رہائی
بھی مل جاتی تھی۔

یہ ویلیرین تعدی مسیحیت کی تاریخ مین اس لحاظ سے بھی اہم ہے، کہ اس مین
پہلی بار زمین دوز مقبرون کی بے حرمتی کی گئی۔ یہ وسیع تہ خانہ، جن مین مقبرون کے
علاوہ گرجے بھی ہوتے تھے، اور جو فن تعمیر کے لحاظ سے اکثر نہایت خوشنما ہوا کرتے
تھے، ہمیشہ مظلوم مسیحیون کے ملجا و ماوا رہا کیے تھے، رومی مقننین مسیحیون پر اور
خواہ کسی طریقے پر سختیان روا رکھتے، لیکن یہ ان سے نہین ہو سکتا تھا، کہ قبرون کی
بے حرمتی جائز رکھین، اس لیے یہ تہ خانہ قانوناً عیسائیون کی ملک قرار پا گئے تھے
رومی حکومت کی نظر مین مقابر و مدافن کا اس قدر احترام تھا، کہ اگرچہ وہ کسی طرح کی
انجمن سازی کی روادار نہ تھی، تاہم ایسی انجمنون کے لیے اس نے بھی، بہ طور
استثنا کے، جواز کا فتویٰ دیدیا تھا، جن کا مقصد اپنے ارکان کی وفات پر ان کی
تکفین و تدفین کا سامان کرنا تھا۔ ان زمین دوز مقبرون کے شمول مین مسیحیون نے
چھوٹے چھوٹے گرجے بھی تعمیر کر لیے تھے، تا کہ تعدیون کے وقت ان مین پناہ

لیکر نماز ین پڑھا کرین -

ڈیسیس کی مدت فرمان روائی کل دو سال کی تھی - اور تعدیون کا سلسلہ اس کی وفات سے پیشتر ہی ختم ہو چلا تھا - اُس کا لڑکا، گالس دسمبر ۲۵۱ ع مین مسند نشین ہوا، اور چند ماہ تک کامل امن رہا - اس کے بعد اُس نے بھی اپنے باپ کی سنت کو زندہ کیا، اور ایک سال تک اس کو جاری رکھا، گو اس کے زمانے مین تعدی نے وہ وسعت و شدت نہین حاصل کی، جو اُس کے باپ کے وقت مین تھی - دو مشہور پادری کورنلیس و لوسیس اسی کے عہد مین قتل ہوئے - ۲۵۴ ع مین عنان حکومت ولیرین کے ہاتھ مین آئی، اس نے شروع شروع مسیحیون کے ساتھ نہ صرف رواداری کا برتاؤ کیا، بلکہ ان کی خوب خاطر کی - چار سال کے بعد اس کی طبیعت نے پلٹا کھایا، اور اب اُسے مسیحیون سے عداوت ہو گئی - ایک مصری ساحر میکرینیس کے اشارہ پر اُس نے ۲۵۸ ع مین یہ فرمان جاری کیا، کہ مسیحی ارکان سنیٹ و عہدہ داران کلیسا قتل کیے جائین، عام عیسائی جلا وطن ہون ان کی جائدادین ضبط ہون، اور زمین دوزہ ارون مین جانے سے روکے جائین - اس فرمان کی تعمیل خون ریزی کی کارروائیون سے ہوئی - اس کے عہد مین سکسٹس روم کے پادری، اور سایپرین قرطاجنہ کے پادری کو اپنی جانین نذر کرنی پڑین - قرطاجنہ کا یہ پہلا پادری تھا، جو ہلاک کیا گیا ۲۶۰ ع مین جب ایرانیون نے ولیرین کو گرفتار کر لیا، گالینس سریر آرا ہوا، اور اُس نے فوراً ہی عیسائیون کے ساتھ پوری رواداری کا حکم دیدیا -

۲۴۹ ع مین ڈیسیس کی تاجپوشی سے لیکر ۲۶۰ ع مین گالینس کی تاجپوشی تک کا زمانہ جس کی تاریخ ہم نے یہان دو لفظون مین بیان کر دی، گرجا کے سخت ترین ابتلا کا زمانہ رہا ہے - اس گیارہ سال کی مدت مین سے پورے چھ

سال تک برابر گرجا پر دست درازیاں جاری رہیں، گو ان دست درازیوں کے مدارج
مختلف رہے، ابتدا میں تو خصوصاً اس کے شدائد ایسے سخت تھے، کہ ان سے زیادہ
ناقابل تحمل شدائد کی نظیر شاید ہی کہیں سے ملے۔ رفتہ رفتہ ان کی زد خاص پادریوں
پر ہوگئی تھی، چنانچہ جیسا کہ گزر چکا ہے، چار رومی پادریوں کی جانیں گئیں۔ اس
تعدی کے اسباب، سیاسی تو تھے، مگر ان کے علاوہ رعایا کے اس عقیدے کو بھی
اس میں بہت دخل تھا، کہ ملک پر آفات و مصائب ناگہانی، عیسائیوں ہی کی
بیدینی و بداعمالیوں کی پاداش میں آتے ہیں۔ سیاسی شورش و بدامنی تو جو رومی
انحطاط کا پیش خیمہ تھی، ملک میں پھیل ہی رہی تھی، مگر اسی کے ساتھ قحط و طاعون
کی بھی گرم بازاری تھی۔ مشرکین ان کو دیکھ کر اور عیسائیوں سے بدظن و برہم
ہوتے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ عیسائی بھی انھیں طبعی اسباب کا معلول نہیں
خیال کرتے تھے، بلکہ قرب قیامت کی علامات قرار دیتے تھے۔ سینٹ سایپرین نے
اپنے ستانے والوں کو مخاطب کرکے جو رسالہ لکھا ہے، اُس سے یہ حقیقت آشکارا
ہوجاتی ہے کہ خود مسیحی ان حوادث کی کیا تعبیر کرتے تھے۔ سینٹ موصوف کو اس کا پورا
یقین ہے کہ قیامت کے دن آگئے۔ وہ کہتا ہے کہ "دیکھو، قرب قیامت نے کیسا نظام
کائنات کو درہم و برہم کر رکھا ہے؛ قوانین قدرت نے مستعدی کے ساتھ عمل کرنا
چھوڑ دیا ہے؛ آفتاب میں نہ وہ اگلی سی آب و تاب رہی، اور نہ زمین میں وہ قوت
پیداوار رہی؛ اب نہ موسم بہار میں وہ لطف و خوش فضائی رہی ہے، اور نہ برسات
میں وہ شادابی و زرخیزی؛ انسان کی قوتوں نے جواب دیدیا ہے، اور ہر شے فنا
کی طرف تیزی سے رواں ہے۔ قحط و طاعون، قیامت کے مقدمات ہیں، جو دنیا
پر اس لیے نازل کیے گئے ہیں کہ بت پرست دنیا کو گمراہی اور حق پرستوں کو
تکلیف دینے کی سزا دیں۔ چنانچہ جب جب مسیحیت پر تعدی کی گئی ہے، ہمیشہ

قہر الٰہی کسی شکل مین ظاہر ہوا ہے" غرض اسی طرح کی باتون سے سارا رسالہ
بھرا ہے۔ سینٹ کو اس کا کبھی بھولے سے بھی خیال نہین آتا کہ مسیحیت کو ایک
روز کامیابی و جہانگیری حاصل ہوگی۔ اُسے اگر کسی فتح و کامیابی کا یقین ہے تو وہ
عالم آخرت کی کامیابی ہے جبکہ اس عارضی دنیا کے ستانے والے مشرکین سخت
سے سخت دائمی عذاب کا شکار ہون گے، اور مسیحی دنیا کی ہنگامی تکالیف جھیلنے
کے صلے مین جنت کے لطف اُٹھائین گے۔ مشرکین کے لیے اب بھی موقع ہے کہ
توبہ و استغفار کر کے نجات اخروی کے مستحق ہو جائین۔

کالینس کی تاجپوشی کی تاریخ سے مسیحیون کے لیے پھر امن کال کا دور
شروع ہوتا ہے، جو ایک برائے نام استثنا کے ساتھ پورے چالیس سال تک
قائم رہا۔ اس برائے نام استثنا سے ہماری مراد یہ ہے کہ آریلین، جو اپنی عہد حکومت
مین عرصۂ دراز تک مسیحیون پر حد درجہ مہربان رہا، بلکہ جس کی دلچسپی و مہربانی
یہان تک بڑھ گئی تھی، کہ پادری لوگ اپنے اندرونی انتظامات مین اس سے
استعانت کرنے لگے تھے، اس نے اپنی حکمرانی کے ختم ہونے کے قریب
یکبارگی اپنا رجحان طبیعت بدل دیا، اور مسیحیون کے لیے تعزیری احکام جاری
کر دیے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ ان احکام پر اپنے دستخط ثبت کرے، یا ان احکام
کی دفتر سے اشاعت ہو، وہ قتل کر ڈالا گیا، اور اس کے احکام کالعدم ہو گئے۔
غرض اس چہل سالہ دور مین مسیحیت کو ہر طرح ترقی ہوتی رہی۔ اس درمیان مین
مسیحیون کو نہ صرف پوری آزادی حاصل رہی، بلکہ ملک مین ان کا اعزاز و اقتدار
بھی برابر بڑھتا رہا۔ صوبون کی گورنری عیسائیون کو ملنے لگی، اور قربانی وغیرہ
مشرکانہ مراسم سے وہ مستثنیٰ کر دیے گئے۔ ملکی حکام، پادریون کا خاص احترام
کرنے لگے۔ شاہی محل مین کثرت سے عیسائی خدمتگار داخل ہو گئے جنھین اپنے

مذہب پر قائم رہنے کی پوری اجازت حاصل تھی، اور جن کی دیانت و وفاداری،
شک و اشتباہ سے ارفع تھی۔ عوام کی برہمی و بدظنی بھی دب گئی تھی، اور مسیحیون کے
حلقے مین روزافزون اضافے پر کسی قسم کی مخالفت یا برہمی نہین ہوتی تھی بڑے بڑے
وسیع گرجے ہر شہر مین تعمیر ہونے لگے، اور وہ بھی نمازیون کی کثرت کے سامنے
ناکافی ٹھہرتے تھے۔ اکیلے شہر روم مین چالیس گرجے تھے۔ یہ سچ ہے کہ بت پرستون
کے مقابلے مین اب بھی اُن کا شمار کم تھا، لیکن جو یکجہتی جو انضباط، جو سرگرمی ان مین
تھی، اس کے لحاظ سے ان کی کامیابی یقینی معلوم ہوتی تھی۔

لیکن اس آخری و قطعی کامیابی سے قبل ابھی ان کو ایک اور سخت ابتلاو
آزمایش سے گزرنا باقی تھا۔ ڈایوکلیشن تعدیون کے لیے عموماً بہت بدنام ہے لیکن
دراصل ان کی ذمہ داری خاص اس کی ذات پر نہین، بلکہ زیادہ تر اس کے شریک
و سہیم گیلیریس پر ہے۔ ڈایوکلیشن نے اپنے عہد حکومت مین پورے ۱۸ سال تک
مسیحیون کے ساتھ کامل رواداری کا برتاو رکھا، لیکن اس مدت کے بعد اُسے
خیال پیدا ہوا کہ ملک سے غیر ملکی عناصر کو خارج کر دیا جائے۔ یہ تاجدار محض اپنے
ذاتی کمالات کی بنا پر بہت ہی معمولی درجے سے ترقی کر کے تخت شاہی تک پہونچا
تھا، اپنی روزانہ زندگی مین نہایت سادگی سے بسر کرتا تھا، اور بدرجہ غایت رحیم،
اعتدال پسند، اور منکسر المزاج تھا۔ خیر یہ باتین تو مارکس آرلیس و انٹونینس مین بھی
تھین، لیکن اُن لوگون پر جمہوریت کی روایات اور رواقیت کا فلسفہ اس قدر
چھایا ہوا تھا، کہ وہ بہت اچھے مدبر نہ تھے اور تدبیر سلطنت اور پالیسی پر کوئی دیرپا
اثر نہ چھوڑ سکے۔ بر خلاف اس کے ڈایوکلیشن ایک اعلیٰ درجہ کا مدبر بھی تھا جو اپنے
تمام انتظامات و قوانین مین مستقبل کو بھی پیش نظر رکھتا تھا، اور قدیم نظامات کو موجودہ
تمدن کے موافق ڈھالنا چاہتا تھا۔ اسی نقطۂ نظر سے اُس نے یہ دیکھ کر کہ رومیون کا

انحطاط اب رک سکتا نہین معلوم ہوتا، ان مین ایک نئی روح پھونکنے کی اس طور پر کوشش کی کہ بجاے روم کے اطراف کے شہرون کو، جن کی حالت ابھی نسبتاً اصلاح پذیر تھی، حیات سیاسی کا مرکز بنا دیا، اور نکومیڈیا، قرطاجنہ، میلان، راوینا، وغیرہ اُس کی خاص عنایات سے مستفیض ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ اُس نے اور اصلاحین شروع کین، جمہوریت کے جو قدیم و بیکار نظامات باقی تھے، اُنھین اُس نے شکست کر دیا، نظام سلطنت مین مشرقیت کی آمیزش کر دی، سلطنت کو چار حصون مین تقسیم کر کے ہر حاکم کی قوت کو محدود کر دیا، صوبون کی حکومت کی نگرانی کے کام کو آسان کر دیا، فوج کی بغاوت و غدر کا دھڑکا جو ہر وقت لگا رہتا تھا، اُسے توڑ دیا، ٹکس کی تشخیص و تحصیل کے لیے بالکل نئے قواعد جاری کیے، اور تجارتی کاروبار کے لیے بھی ایک جدید آئین تیار کیا۔ اس مزاج کے حکمران کے لیے، جو ہر صیغہ مین اصلاحات و تغیرات کر کے رومیون مین قومیت و وطنیت کی روح از سر نو پھونکنا چاہتا تھا، یہ ناگزیر لازمی تھی، کہ مسیحیت جیسے قومیت شکن و وطنیت کش مذہب کا استیصال کرے۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ ڈایوکلیشین کی خلقت ہی مسیحی تعلیمات کے بالکل برعکس واقع ہوئی تھی، تلوّن، مشرکانہ وہم پرستی اس کے سرشت مین داخل تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فوج کے مطالبات سے ہمیشہ مرعوب و خائف رہا کرتا تھا، اور فوج کے جذبات، یکسر مسیحیون کے خلاف برانگیختہ تھے۔

یہ کیفیت تو ڈایوکلیشین کی تھی۔ رہا اسکا شریک و سہیم گیلیریس تو وہ مسیحیت کا جانی دشمن تھا، کچھ تو اس سبب سے، کہ اپنی والدہ کے اثر سے اُسے بت پرستی کے ساتھ خاص شغف و انہماک تھا، اور کچھ اس سبب سے، کہ بہ قول مسیحی مصنفون کے، وہ طبعاً حد درجہ کا شقی القلب، آزار دوست، شہوت پرست

تسند ازواج واقع ہوا تھا۔ اسکی سربراہی مین، دربار کی وہ پارٹی جو بت پرستون کی دشمن تھی، خوب زور پکڑ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ افلاطون کا فلسفیانہ مسلک فیثاغورث و اشراقیت جدید ہوگیا تھا جس کے ائمہ و مجتہدین مسیحیت کے سخت مخالف تھے۔ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ سیاسی حیثیت سے بھی مسیحیون کا زور توڑنا چاہیے، کیونکہ اس مین شبہ نہین، کہ اس وقت مسیحیون کو خاص اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ ڈایوکلیشین کی بیوی اور لڑکی اگر مسیحی ہو نہین گئی تھین تو نیم مسیحی ضرور تھیں، متعدد ارکان دربار علانیہ اپنی مسیحیت کا اقبال کرتے تھے نکومیڈیا مین قصر سلطانی کے جواب پر ایک عظیم الشان گرجا تعمیر ہوچکا تھا، پادریون کو تقریباً ہر شہر مین ایک خاص نفوذ و اقتدار حاصل ہوگیا تھا جس سے اکثر نا واجب طریقون پر کام لیا جاتا تھا، جا بجا متعصب مسیحیون نے مشرکون کے معابد کی توہین بھی کر ڈالی تھی، اور بعض مرتبہ مسیحیون نے فوج مین بھرتی ہونے سے اس بنا پر انکار کر دیا تھا، کہ سپاہیانہ زندگی اُن کے مذہب کی تعلیمات کے منافی ہے۔ غرض یہ تمام اسباب ایسے جمع ہوگئے تھے، جو مسیحیت پر تعدی کے قوانین کے نفاذ کا باعث ہوئے۔

ایک عرصہ دراز تک تو ڈایوکلیشین گیلیریس کے اصرار کا مقابلہ کرتا رہا، اور اس اثنا مین مسیحیون پر کچھ سختی ہوئی وہ یہ تھی، کہ کچھ مسیحی افسران فوج برطرف کر دیے گئے لیکن ۳۰۳ء مین ڈایوکلیشین پوری طرح اپنے شریک سلطنت کی رفاقت پر آمادہ ہوگیا، اور ایک شدید تعدی جاری ہوگئی۔ اسی زمانے مین بعض خارجی اسباب بھی ایسے جمع ہوگئے، جنھون نے اس تعدی کو اور تیز کر دیا، مثلاً اپولو کی دار الاستخارہ سے ڈایوکلیشین کو حکم ملا کہ مسیحیوں پر تعدی شروع کرے، یا ایک عیسائی نے ایک بار تعزیری فرمان کو نوچ ڈالا، اور اس کے بجائے بادشاہ کے متعلق کچھ کلمات تحقیر

چسپان کر دیے۔ نکومیڈیا کے قصر شاہی مین، جہان دونون فرمان روا رہتے تھے، عیسائیون نے دو مرتبہ آگ لگا دی، اور تمام مین شورشین برپا کین۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پے در پے تعزیری فرامین جاری ہونا شروع ہو گئے۔ پہلا فرمان یہ تھا، کہ تمام گرجے منہدم کر دیے جائین، تمام انجیلین برخست کر دی جائین، مسیحیون سے تکی حقوق سلب کر لیے جائین، اور وہ عبادت کے لیے خفیہ طور پر کہین مجتمع ہون، تو قتل کر ڈالے جائین۔ دوسرا فرمان یہ شایع ہوا، کہ تمام پادری گرفتار کر لیے جائین، اور تیسرے اور چوتھے کا ماحصل یہ تھا، کہ تمام عیسائیون کو قربانیان کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اول اول ڈائوکلیشین نے اس کی خاص کوشش کی تھی، کہ جانین نہ ضائع ہون، لیکن نکومیڈیا مین آتش زنی کے بعد اُس نے یہ قید اُٹھا دی۔ صدہا قیدی زندہ جلا دیے گئے، اور واقعی یہ سزاے موت ہولناک عذابون کے مقابلے مین ہزار درجہ غنیمت تھی۔ ایک صوبہ گال ایسا تھا، جو اکیلا ان تعدیون سے بچا ہوا تھا، کہ مارکس آرلیس کے زمانے مین وہ ان کا مزہ چکھ چکا تھا۔ آج کل وہان کا گورنر کلورس تھا، جو مسیحیون کو جسمانی عذاب سے امن دیے ہوئے تھا، گو فرمان سلطانی کی تعمیل مین اُسے گرجاؤن کو تو بہر حال منہدم کرنا ہوتا تھا۔ اسپین مین بھی، جو اسی کلورس کے زیر اثر تھا، تعدیون کا زور کم تھا، ورنہ ملک کے اور تمام صوبون مین تو وہ پوری قوت کے ساتھ جاری ہین، تاآنکہ ٣٠٥ء مین ڈائوکلیشین تخت سلطنت سے علیحدہ ہو گیا۔ اس کے ہٹتے ہی مغربی صوبون مین تو امن ہو گیا، البتہ مشرقی صوبون مین جو اب تنہا گیلیریس کی حکومت مین آ گئے تھے، عیسائیون پر بے حد تشدد ہونے لگا۔ آزار و ایذا، تعذیب و عقوبت کے طرح طرح کے نئے نئے طریقے استعمال کیے جاتے تھے، جنھین سے ایک طریقہ یہ تھا، کہ دھیمی دھیمی آنچ مین زندہ عیسائیون کو بھونا جاتا۔ یہ عذاب ٣١١ء مین رکا، اور رکنے کا سبب یہ ہوا، کہ گیلیریس، جو مسیحیون کا عدو

ایک عجیب دردناک مرض مین گرفتار رہا۔ سارے جسم مین ناسور پڑ گئے تھے، جن سے زخم سڑ گئے تھے، اور اُن مین کیڑے پڑ گئے تھے۔ گویا سارا جسم ایک بڑا پھوڑا ہو گیا تھا جس مین لاکھون کیڑے بجبجاتے تھے، اور جسم سے سخت بو اور تعفن آتی تھی۔ طبیب پر طبیب بدلے جاتے تھے، ایک ایک مندر اور دیوتا سے رجوع کیا جاتا تھا، مگر کچھ فایدہ نہین ہوتا تھا۔ بالآخر مسیحی تعدیون سے اُس نے توبہ کی، تعزیری قوانین کو منسوخ کیا، مسیحیون کو پوری آزادی دی، گرجا وم کی تعمیر کی اجازت دی، اور اُن سے التجا کی کہ اس کی صحت کے لیے دعا کرین، اس واقعہ پر تعدیون کا دَور ختم ہوا۔ بے شبہ ایک بار پھر ایشیاے کوچک مین یہ فتنہ شروع ہو چلا تھا، مگر فوراً ہی دب گیا۔ قسطنطین کی تخت نشینی ۳۱۲ء مین میلان کا فرمان، لیسینیس کی شکست، اور قسطنطین کا اصطباغ، یہ سب واقعات یکے بعد دیگرے سُرعت کے ساتھ پیش آتے گئے، تا آنکہ روم کا ملکی مذہب مسیحیت ہو گیا۔

گرجے پر آخری، اور سب سے شدید تعدی کی اجمالی تاریخ جس قدر صحت کے ساتھ ہمارے امکان مین تھی، اوپر گزر چکی۔ اب آخر مین اس کی صحت و اہمیت کے متعلق چند ضروری معروضات پیش کر کے یہ باب ختم کیا جاتا ہے۔

(۱) سب سے زیادہ ناظرین کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیے، کہ آج اس تعدی کے اصل محرکات، اور اس کے مظلومون کی تعداد سے متعلق کوئی صحیح اور قطعی اطلاع نہین حاصل ہو سکتی۔ فریق ثانی یعنی بت پرستون کی کوئی تصنیف آج اس بحث مین موجود نہین، اس لیے ہمارے جو کچھ بھی معلومات ہین مسیحی ذرایع سے آئے ہوئے ہین، اور ان مین بھی ہمارے مآخذ صرف دو ہین: ایک یوسیبیس کی تاریخ، اور دوسرے لیکٹینٹس کا رسالہ اہل تعدی کی موتون سے متعلق۔ اِن

دونون کا بھی یہ حال ہی، کہ یوسیبیس اگرچہ اپنے زمانے کے معیار سے ایک عالم وسلیع النظر شخص تھا، تاہم اُس نے اس کا کبھی غلط دعویٰ نہین کیا کہ اُس نے یہ کتاب مورخانہ بے تعصبی وناطرفداری کے ساتھ لکھی ہی، بلکہ وہ غریب صاف صاف کہتا ہی کہ اِس تصنیف مین مین اُن واقعات کو پی گیا ہون، جن سے گرجا کی اہانت ہوتی تھی " رہے لیکٹینٹیس، تو ان کے رسالہ کو آج کل کی اصطلاح مین ایک " پارٹی پمفلٹ " کہنا زیادہ موزون ہوگا۔ اس مین اول سے لیکر آخر تک ہر جگہ یہی دکھلایا گیا ہی کہ مسیحیون کو آزار پہونچانے والون کا کتنا بُرا انجام ہوا، اور اس کے ایک ایک لفظ سے مبالغہ وتعلّی کی جھلک نظر آتی ہی۔ مآخذ صحیح کے اس فقدان، اور مآخذ موجودہ کے اس ضعف نے تعدیون کی تاریخ کو ایک مجموعۂ اکاذیب بنا دیا ہی۔ کچھ غلط بیانیان تو قصداً داخل کی گئین، اور کچھ اُن پرجوش اعتقادیون نے رنگ چڑھایا، چنانچہ جو جو زمانہ گزرتا گیا، یہ رنگ اور پختہ ہوتا گیا۔ ایک ہی واقعہ بیسیون طرح پر رنگ آمیزیون کے ساتھ بیان کیا جانے لگا، عجیب عجیب دراز کار قصّے، مثلاً یہ کہ ٹریجن کے عہد مین دس ہزار عیسائی کوہ ارارات پر قتل کر ڈالے گئے، داخل تاریخ سمجھ لیے گئے۔ اس عقیدہ نے کہ یہ تعدیان قرب قیامت کی علامات ہین، نیز اس نے کہ شہدا کی ہڈیون مین عجیب تاثیرین وخواص ہوتے ہین مبالغہ آمیزیون کو اور ترقی دیدی، اور ایک ایک قریہ نے اپنے لیے ایک شہید مرید اکر لیا۔ رُوینارٹ نے تاریخ کو قصہ کہانیون سے الگ کرنا چاہا، لیکن شاید اس کوشش مین پوری کامیابی ناممکن ہی۔ ڈاڈول کا مضمون، جو سترھوین صدی کے آخر مین شایع ہوا، اگرچہ بجاے خود بہت سے اغلاط کا مجموعہ ہی، تاہم اس نے قدیم روایات کو خوب پرکھا ہے، اور گبن نے اپنی کتاب مین جو خاص باب اسی موضوع پر لکھا ہی، اس نے ڈاڈول کی تحقیقات کو اور چمکا دیا ہی۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی

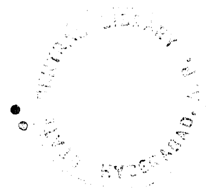
یہ کہا جا سکتا ہے، کہ جدید تحقیقات و تلاش نے اصلی حالات کو بہت کچھ
آئینہ کر دیا ہے، اور پچھلی روایات کی ایک کافی حد تک تنقید و تصحیح ہو گئی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے، کہ باوجودیکہ ہم نے اس باب مین معلومات کا پورا
ذخیرہ اکٹھا کر دیا ہے، اور اُن کے فراہم کرنے مین انتہائی احتیاط و تحقیق سے
کام لیا ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ ناظرین اس کے خاتمے پر بغیر غیر مطمئن و متنفر ہوئے
نہین رہ سکتے۔ مورخ کا قلم جس سرد مہری کے ساتھ غریب و مظلوم شہدا کے
افسانۂ خونین کو بلا ان سے کسی قسم کے اظہار ہمدردی کے ضبط تحریر مین لاتا ہے،
اس سے یقیناً فیاض و رحیم مزاج ناظرین کے جذبات کو صدمہ پہونچتا ہے،
ساتھ ہی اگر وہ مقتولین کے شمار سے ان تعدیون کے شداید کو قیاس کرنا چاہین
تو یقیناً ان کا اندازہ غلط ہو گا۔ مورخ تو یہ جانتا ہے، کہ اگرچہ پادری ان تعدیون کے
خاص ہدف تھے، تاہم ڈایوکلیشین کے پُر آشوب عہد مین مقتول پادریون کی
تعداد کُل ۹ تھی، اور گیلیریس کے زمانے مین کل مسیحی مقتولین کا شمار صرف ۹۲
تک پہونچا تھا، ان اعداد سے گبن نے حساب لگایا ہے، کہ ڈایوکلیشین کے
زمانے مین ملک بھر مین شہدا کی مجموعی تعداد تقریباً ۲۰۰۰ ہوئی ہو گی۔ حالانکہ خود
مسیحیون کے زمانے مین اسپین کے محکمۂ احتساب کے حکم سے اکیلے ٹورکیمیڈا کی
زیر صدارت ۲۰۰۰۰ نفوس زندہ جلا دیے گئے، اور ... ہزار اشخاص جنھون
نے مختلف شداید کے بعد اپنے عقاید سے توبہ کی، اُن کا ذکر نہین، اور چارلس پنجم
کے عہد مین شہدا کا شمار تو تقریباً ۵۰۰۰۰ تک پہونچا تھا۔ غرض جہان تک
مقتولین کی تعداد کا تعلق ہے، مشرکانہ تعدیان مسیحی تعدیون کے مقابلے مین بہت
ہی ہلکی تھین، لیکن اگر مقتولین کے عددی معیار سے قطع نظر کر کے شداید کی شدت
کے لحاظ سے دیکھا جائے گا، تو یقیناً مشرکانہ تعدیون کا پلہ بہت بھاری رہے گا

اس مین شبہ نہین مشرک حکام مسیحیون کے ساتھ اکثر نہایت رحمدلی کا برتاؤ کرتے تھے
اُن کے ساتھ خاص طور پر رعایت کرتے تھے، قانون کی گرفت سے بچنے کی
اُنھین طرح طرح کی ترکیبین بتاتے تھے، قید کی حالت مین انھین بھاگ
جانے کے موقع دیتے تھے، اُن کی عورتون کو قید کی حالت مین بھی برابر
اُن سے ملنے جلنے دیتے تھے۔ لیکن باایہمہ یہ بالکل قطعی ہو کہ مسیحی جن دردناک
عذابون مین بھی مبتلا کیے جاتے تھے اور جو ناقابل بیان شدائد اُن پر ڈالے
جاتے تھے، اُن سے آگے مسیحی محکمۂ احتساب کے کارنامے بالکل ماند پڑ جاتے
ہین۔ سچ ہو کہ آگ مین زندہ جلانا، اور خصوصًا جشن یادگارون کے موقع پر مسیحی
احتساب کا خاص کارنامہ تھا، تاہم ظالمون کی جس شقاوت، اور مظلومون کی
جس مردانگی و استقلال کا نمونہ مشرکانہ تعدیون کے زمانے مین ملتا ہو، اُس کی
نظیر اور کہین نہین ملتی۔ ایک زمانہ تھا جب رومیون کو اس پر فخر تھا اور بجا فخر
تھا، کہ اُن کے ضابطۂ تعزیرات مین تعذیب و عقوبت کی مطلق گنجایش نہین؛
لیکن آخر زمانے مین ان کا یہ فخر جاتا رہا تھا، اور مناظر سفاکی کے وہ رفتہ رفتہ
ایسے خوگر ہو گئے تھے، کہ ان کے قلوب پر شقاوت و قساوت مسلط ہو گئی تھی
اور انھین سفاکیون، بیدردیون اور خون آشامیون مین وہی مزا آنے لگا تھا
جو آج شاید افریقہ کے وحشیون کو آتا ہو تو ہو، ورنہ اور تو کسی انسان کو نہین
آتا۔ یہ اسی طبیعت کا نتیجہ تھا کہ مسیحی لوہے کی سرخ انگارہ کرسیون پر
بٹھلائے جاتے تھے، اور اُن کے بھنتے ہوے گوشت سے دھوان اُٹھتا تھا؛
اُن کا گوشت لوہے کے کانٹون کی مدد سے اُن کی ہڈیون سے کھرچا جاتا تھا؛
ان کے گرجاؤن کی کنواریان سپاہیون کی شہوت پرستیون کی نذر کر دی جاتین
یا کسی نایکہ کے حوالے کر دی جاتی تھین، وہ جیتی جیتی آگ مین وہ مشعلون کی طرح

بھونے جاتے تھے، کہ اس عذاب کے مقابلے مین اکبارگی اُنھین قتل کر ڈالنا
اُن پر رحم کرنا تھا، ایک ایک عضو دوسرے سے کاٹ کر الگ کیا جاتا تھا،
اور اس مین جلتا ہوا سیسہ پلا دیا جاتا تھا، ان زخمون پر نمک مرچ اور سرکہ ڈالا
جاتا تھا، یہ عذاب سارے سارے دن جاری رکھے جاتے تھے، اور ایک مرتبہ تو
یہانتک ہوا، کہ ۲۲۷ آدمی اس حالت مین باہر نکالے گئے، کہ ان مین سے
ہر شخص کی ایک ایک آنکھ اپنے حدقہ سے باہر نکال لی گئی ہے، اور ایک ایک
پیر سے ایک گوشت کا لوتھڑا سرخ انگارہ لوہے سے کاٹ لیا گیا ہے۔ یہ دردناک
عذاب جن کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہین، نازل کیے جاتے تھے
اور مرد و عورتین، بلکہ کمزور و نازک لڑکیان تک انھین برداشت کرتی تھین،
حالانکہ صرف ایک لفظ انکار سے وہ ان سے بچ سکتی تھین۔ یہ سب کیون؟
محض اپنے آقاے آسمانی کی رضا کی خاطر، محض راہ حق پر قائم رہنے کے لیے۔
پس، پادریون کی حرکتون کے بارے مین ہم خواہ کچھ ہی راے قائم کرین ہم مین
سے ایسا کون ہے، جو ان شہیدان راہ حق پرستی کے متعلق کوئی بے ادبی کا خیال
اپنے ذہن مین لا سکتا ہے؟

۸ بجے صبح ۲۰ نومبر ۱۹۱۵ء



Clemens, Flavius	کلیمنس
Clement of Alexandria	کلیمنٹ اسکندروي
Cleombrotus	کلیومبروٹس
Clotaire	کلوٹیر
Clotilda	کلوٹیلڈا
Clovis	کلووس
Coemgenus	کویمجنس
Coleridge	کالرج
Colman, St.	سینٹ کولمین
Columbanus	کولمبنس
Condillac	کانڈلک
Constantine	قسطنطین
Cordeilla	کارڈیلیا
Cornelia	کارنیلیا
Cornelius	کارنیلیس
Cornutus	کارنوٹس
Cousin, Victor	وکٹر کزن
Crantor	کرینٹر
Cremutius Cordus	کریموشس کورڈس
Cromaziano	کرومیزیانو
Crusius	کروسیس
Cudworth	کڈورتھ
Cumberland, Bishop	پادري کمبرلینڈ
Cyprian	سائپرین

Cyril	سرل
Cyzicus	سایزیکس
Dale, Van	وان ڈیل
Decius	ڈیسیس
Defoe, Daniel	ڈینیل ڈیفو
Demonax	ڈي مونکس
Deogratias	ڈیوگریٹس
Diagoras	ڈیاگورس
Diodorus	ڈیوڈورس
Dion Chrysostom	ڈیان کریزوسٹوم
Dionysius	ڈایونی سي اس
Dodwell	ڈاڈول
Domitian	ڈومیٹین
Domitilla	ڈومیٹیلیا
Domnina	ڈومینا
Donne	ڈون
Dumont	ڈیمونٹ
Ennius	اینیس
Ephrem	افرم
Epictetus	اپکٹیٹس
Epiphanius	ایپفینیس
Epponina	ایپونینا
Eupraxia	یوپریکسیا
Euripides	یوریپیڈیس

Eusebius	یوسیبیس
Eusebius, St.	سینٹ یوسیبیس
Eusathius, St.	سینٹ یوستھیس
Evagrius	اویگریس
Fabianus	فیبیانس
Fabiola	فیبیولا
Fabius	فےبیس
Fabius Pictor	فےبیس پکٹر
Faustina	فاستینا
Felicitas, St.	سینٹ فیلیسیتس
Fenelon	فینلن
Flavianus, Bishop	بشپ فلیوانس
Francis	فرانسس
Fredegonde, Queen	ملکہ فریڈیگونڈ
Galerius	گیلریس
Gall, St.	سینٹ گال
Gallienus	گالینیس
Gallus	گالس
Gaul	گال
Gay	گے
George of Cappadocia	جارج آف کیپیڈوسیا
Germanicus	جرمینیکس
Germanus, St.	سینٹ جرمینس
Gervasius	جرویسیس
Gibbon	گبن
Gracchi	گریکسون (۱)
Gregory the Great	گریگوری اعظم
Gregory of Nyssa	گریگوری آف نیازا
Gregory of Tours	گریگوری آف ٹور
Gundebald	گنڈیبالڈ
Guy	گے
Hadrian	هیڈرین
Hall, Robert	رابرٹ هال
Hartley	هارٹلي
Hegesius	هیجیسي اس
Heliogabalus	هلیوگیبیلس
Helvetius	هلویتیس
Herbert of Cherbury	هربرٹ آف چربري
Hercules	هرکیلس
Hereford	هرفرڈ
Hilarius, St.	سینٹ هیلیریس
Hildebrand	هلڈیبرانڈ
Hobbes	هابس
Homer	هومر
Horace	هوریس
Hume	

(۱) اس نام کے دو شخص هوئے هین—تائبیریس گریکس اور کایس گریکس، یهه لفظ
اُن دونون کي جمع هے—

Hutcheson	هیچسن
Hypatia	هایپشیا
Iamblichus	ائمبلیکس
Ignatius, St.	سینٹ اگنیشیس
Irenaeus	آیرنیس
Isidore	آیسیڈور
James, the Apostile	جیمس
James, St.	سینٹ جیمس
Jenyns, Soame	سوم جینِنس
Jerome, St.	سینٹ جروم
Joffre, Juan	جون ژوفرے
John the Hermit	جان راهب
John, St.	سینٹ جان
John XXIII, Pope	جان پاپاے ۲۳
Johnson, Dr.	ڈاکٹر جانسن
Julian	جولئن
Julen L'Hospitalier	جولین لی هاسپیٹیلیر
Justinian	جسٹینین
Justin Martyer	جسٹن مارٹر
Juvenal	جوینل
Kames, Lord	لارڈ کیمس
Labienus	لابینس
Lactantius	لیکٹینٹیس
Laetorius	لیٹوریس
Leibnitz	لایبنٹز
Leo the Isaurian, Pope	پوپ لیو
Leonardo da Vinci	لیونارڈو ڈا ونسي
Locke, John	جان لاک
Lombard, Peter	پیٹر لومبرڈ
Longinus	لانگینس
Lucan	لوسن
Lucius	لوسیس
Lucretius	لکریشیس
Luther	لوتهر
Lyons	لیانس
Macarius	میکیریس
Mackintosh	میکنٹاش
Macrianus	میکریانس
Macrina, Caelia	کیلیا میکرینا
Maecenas	میسیناس
Mallonia	میلونیا
Malthus	مالتهس
Mandeville	مینڈیول
Manilius	مینیلیس
Marcellinus	مارسیلینس
Marcia	مارسیا
Marcian, St.	سینٹ مارسین
Marcus, St.	سینٹ مارکس

Martin of Tours, St.	سینٹ مارٹن آف تور
Mary, St.	سینٹ میری
Mary, the Virgin	مریم باکرہ
Maurice	ماریس
Maxentius	میکزینٹیس
Maximilianus	میکزیمیلنس
Maximinus	میکزیمنس
Maximus of Tyre	میکزیمس آف ٹائر
Melania, St.	سینٹ ملینیا
Melito, St.	سینٹ میلیٹو
Miletus	ملیٹس
Mill, James	جیمس مل
Mill, J. S.	مل
Molinos	مولینوس
Monica, St.	سینٹ مونیکا
More, Henry	هنری مور
Musonius	موسونی اس
Napoleon	نیپولین
Nero	نیرو
Nilus, St.	سینٹ نیلس
Nolasco, Peter	نولاسکو
Numa	نوما
Ockham	اوکہم
Odin	اوڈن
O'Neale	ونیل
Origen	اریجن
Otho	اوتو
Ovid	آوڈ
Pachomius	پیکومیس
Paetus	پیٹس
Paley	پیلی
Pambos, St.	سینٹ پیمبوز
Pammachus	پیمیکس
Panaetius	پینیٹیس
Pascal	پیسکل
Paul, St.	سینٹ پال
Paul, the Hermit	پال راهب
Paul, St. Vincent de	سینٹ ونسنٹ ڈی پال
Paula	پال
Paulina	پالینا
Pelagia	پیلیجیا
Pelagius	پیلیجیس
Pepin	پیپن
Peregrinus	پریگرینس
Pericles	پیری کلس
Perpetua, St.	سینٹ پرپیٹوا
Perugino	پروگینو
Petronius	پٹرونیس

Philip	فلپ
Phocas	فوکس
Phocion	فوشین
Phrynicus	فرینی کس
Pilate, Pontius	پائیلیٹ
Pior, St.	سینٹ پیور
Plato	فلاطون
Pliny	پلینی
Plotinus	پلوٹینس
Plutarch	پلوٹارک
Poemen	پیمن
Polybius	پولیبیس
Polycarp	پولی کارپ
Pompey	پامپی
Poppaea	پوپیا
Porcia	پورشیا
Porphyry	پارفری
Possevin	پوسوین
Pothinus	پوتھینس
Prometheus	پرومیتھیس
Protagoras	پروٹوگورس
...asius	پروٹیسیس
...agoras	فیثاغورث
...lus	ریگولس

Reid	ریڈ
Romuald, St.	سینٹ رومالڈ
Sabinus, St.	سینٹ سیبنس
Salamis	سیلامس
Sallust	سلوسٹ
Scifi, Clara	شلیفی
Sedgwick	سیجوک
Sejanus	سیجانس
Seneca	سینیکا
Severus	سیورس
Severus, Septimus	سیورس
Sextius	سیکستیس
Shaftesbury.	شیفٹسبری
Shakespeare	شیکسپیر
Sighebert	سجبرٹ
Silius Italicus	سیلیس
Sylvia	سلویا
Simeon, Bishop	پادری سیمیون
Simeon Stylites, St.	سینٹ سیمیون
Sismondi	سسمونڈی
Sisoes	سسویس
Sixtus, Bishop	پادری سیکستس
Sixtus, V, Pope	سیکستس پوپ پنجم
Smith, Adam	ایڈم اسمتھ

rates	سقراط	Tiberius	ٹائبریس
inoza	اسپنوزا	Timagenes	ٹایمیجنس
hel, Madame	میڈم استیل	Tiro	ٹایرو
atius	استیشیس	Titus	ٹائیس
wart, Dugald	ڈیوگالڈ اسٹوارٹ	Trajan	ٹریجن
ilpo	استلپو	Tucker	ٹکر
rozzi	استروزي	Tundale	ٹنڈیل
etonius	سویٹونیس	Ulphilas	الفیلاس
inburne	سوینبرن	Ulpian	الپین
mmachus	سیمیکس	Valerian	ولیرین
nesius	سینسیس	Valerius Maximus	ولیریس
citus	ٹیکیٹس	Varro	ویرو
lemachus	ٹیلیمیکس	Vespasian	وسپیسین
lesphorus	ٹیلسفورس	Virgil	ورجل
tullian	ٹرٹولین	Vitalius	ویٹیلیس
alasius	تھیلیسیس	Voltaire	والٹیر
eodebert	تھیوڈي برٹ	Warburton	واربرٹن
eodoric	تھیوڈورک	Wollaston	ولاسٹن
eodorus	تھیوڈورس	Xenocrates	زنوکریٹس
eodorus, St.	سینٹ تھیوڈورس	Xenophon	زنافن
eodosius	تھیوڈوسیس	Zeno	
eon, St.	سینٹ تھیون	Zeus	
eresa, St.	تھریسا	Zosimas	...ماس

